الفاظ کا طلسم

مصنف: ڈاکٹر خالد حسن قادری
تدوین و تحشیہ: ڈاکٹر رؤف پاریکھ



الفاظ کا طلسم

مصنف: ڈاکٹر خالد حسن قادری
تدوین و تحشیہ: ڈاکٹر رؤف پاریکھ

City Book Point
Naveed Square, Urdu Bazar, Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : الفاظ کا طلسم

مصنف : ڈاکٹر خالد حسن قادری

تدوین و تحشیہ : ڈاکٹر رؤف پاریکھ

تعداد : 500

سن اشاعت : 2022ء

قیمت : 1200 روپے

فہرست

صفحہ نمبر

معروضات

پروفیسر ڈاکٹر خالد حسن قادری (مرحوم) لندن یونی ورسٹی میں استاد تھے۔ زبان اور لغت سے دل چسپی کی بنا پر انھوں نے اُردو کے نادر اور قلیل الاستعمال الفاظ اور ان کی تشریح پر کام کیا۔ اس ضمن میں ان کا ایک کام ''متروکات کی لغت'' کے عنوان سے تین جلدوں میں جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے ۲۰۰۴ میں شائع کیا۔ اگرچہ اس کے نام پر شمس الرحمٰن فاروقی نے اعتراض کیا اور کہا کہ اس کا نام ''نادر الفاظ کی لغت'' ہونا چاہیے۔ بعد ازاں قادری صاحب کا یہی کام ہندوستان سے ''لفظیات'' کے عنوان سے ایک جلد میں شائع ہوا اور اس کے دیباچے میں قادری صاحب نے واضح کیا کہ اس کا نام انھوں نے متروکات کی لغت ہرگز نہیں رکھا تھا۔

قادری صاحب نے اُردو کے بھولے بسرے الفاظ پر ایک اور کام ''الفاظ کا طلسم'' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس کی متعدد اقساط روز نامہ جنگ (کراچی) میں آج سے کوئی تینتیس چونتیس سال قبل شائع ہوئی تھیں جس کے بعد یہ سلسلہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر منقطع ہو گیا۔ البتہ اس کا اصل مسودہ مشفق خواجہ صاحب کے پاس تھا اور ان کے ہاں غالباً اشاعت کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ لیکن مسودہ یونہی رکھا رہا اور راقم الحروف نے ادارۂ یادگار غالب/ غالب لائبریری (کراچی) کے معتمد کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد ادارے میں اشاعت کے لیے آئے مسودات کو دیکھنا شروع کیا تو ''الفاظ کا طلسم'' کا مسودہ نظر آیا۔ قادری صاحب کا یہ دست نوشتہ مسودہ کئی اقساط پر مشتمل تھا لیکن ابتدائی چند اقساط نیز درمیان سے

بھی کچھ اقساط غائب تھیں جو باوجود تلاشِ بسیار کے ہاتھ نہ آسکیں۔

راقم کو یاد تھا کہ اس کی کچھ اَقساط روزنامہ جنگ (کراچی) میں ۸۹-۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک قسط کا تراشہ بھی راقم کے ذخیرے میں موجود تھا۔

چنانچہ راقم نے اس کی چار ابتدائی اقساط بیدل لائبریری (کراچی) میں ''جنگ'' کے فائل سے تلاش کیں اور مسوّدے کو مرتب کر کے ادارے کے جریدے ''غالب'' میں شائع کیں۔ بعد کی خاصی اَقساط بھی اس رسالے میں شائع ہوئیں لیکن ادارے کی مالی مشکلات کے سبب رسالے کی اشاعت تعویق میں جا پڑی اور ان اَقساط کی اشاعت کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

۲۰۲۰ء کے اواخر میں راقم کا تقرر ادارۂ فروغِ قومی زبان (اسلام آباد) میں ہوا تو محبِ گرامی جناب محمد احسن خاں صاحب (جو لغات ولفظیات سے یک گونہ دلچسپی رکھتے ہیں) نے ہدایت کی کہ الفاظ کا طلسم ایک اہم کام ہے اور اس کو ضائع ہونے سے بچانا ضروری ہے۔ نیز قارئین ''اخبارِ اُردو'' کے لیے بھی یہ ایک علمی تحفہ ہوگا۔ چنانچہ اس کی خاصی اقساط ادارۂ فروغِ قومی زبان کے نفسِ ناطقہ ''اخبارِ اُردو'' میں راقم کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئیں۔

بعدازاں جناب احسن خاں صاحب نے اس کی کتابی صورت میں اشاعت پر بھی زور دیا۔ لہٰذا اب یہ کتابی صورت میں حاضر ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تنظیم الفردوس صاحبہ (معتمد ادارۂ یادگارِ غالب) کا بھی شکریہ واجب ہے جنھوں نے مسودے کے صفحات کی تلاش میں بھی معاونت کی اور اس کی اخبارِ اُردو میں اشاعت اور بعدازاں کتابی صورت میں اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ادارۂ یادگارِ غالب کے تمام عہدے داران اور ارکان کا شکریہ قارئین پر بھی واجب ہے جن کی علم دوستی کے سبب ایک اہم علمی کام منظرِ عام پر آیا۔ کتاب کے حروف کار رانا منظور احمد صاحب کا بھی شکریہ جنھوں نے بڑی محنت سے یہ کام کیا ہے۔

۲۵ر دسمبر ۲۰۲۱ء، اسلام آباد　　　　رؤف پاریکھ

پس نوشت: یہ کتاب حروف کاری اور حروف خوانی کے مرحلے میں تھی کہ بیدل لائبریری (کراچی) کے کتاب دار جناب محمد زبیر کے بے مثال تعاون کی بدولت جنگ (کراچی) کے فائل سے مزید تین اقساط دست یاب ہوئیں (قسط ۷، ۸ا اور ۱۷) اور ان کو ترتیب کے مطابق کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ (ر۔پ)

۱۵ر جنوری ۲۰۲۲ء، کراچی

تقدیم

''الفاظ کا طلسم'' کا مسودہ جب دست یاب ہوا تو خاصا پُرانا ہونے کے باوجود اس وقت تک غیر مطبوعہ تھا، ماسوائے ان اقساط کے جو روزنامہ جنگ (کراچی) میں شائع ہوئی تھیں۔ البتہ بعض اقساط جو جنگ میں شائع ہوئیں اس لحاظ سے نامکمل تھیں کہ ان میں بعض اندراجات (جو اصل مسودے میں موجود تھے) شامل نہیں تھے لیکن اصل مسودے کی بنیاد پر اس متن میں شامل ہیں۔

جو مسودہ ہمیں ادارۂ یادگارِ غالب (کراچی) کی فائلوں میں ملا اس کے ابتدائی صفحات ناپید تھے اور اس کا نویں قسط سے آغاز ہو رہا تھا۔ مسودہ کُل اسّی (۸۰) اقساط پر مبنی تھا لیکن اس کے درمیان میں سے بھی کچھ اقساط غائب تھیں۔ غائب شدہ اقساط کی تفصیل یہ ہے:

- اقساط : ۵تا۸،
- قسط : ۱۷،
- قسط : ۵۳،
- اقساط : ۶۴تا۶۸،
- قسط : ۶۹ (آخر کے چند صفحات موجود ہیں)
- اقساط : ۷۰تا۷۵،
- قسط : ۷۶ (ابتدائی چند صفحات غائب ہیں)۔

ان میں سے تین اقساط (۷، ۸ اور ۱۷) مل سکیں جن کو ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔

افسوس کہ کوشش کے باوجود گم شدہ صفحات نہ مل سکے اور ان کی گم شدگی کا معما بھی حل نہ ہوسکا۔

بہرحال، اس دل چسپ، علمی اور تحقیقی کام کا جتنا مسودہ مل سکا اسے ترتیب و تدوین اور حواشی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ ''جنگ'' سے منقول کُل سات (۷) اقساط میں سے ہر ایک کے آخر میں ان کی ''جنگ'' میں اشاعت کی تاریخ بھی دے دی گئی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ابتداً راقم نے مسودہ دیکھ کر اور یہ سوچ کر اسے ایک طرف رکھ دیا کہ یہ ''متروکات کی لغت'' کا مسودہ ہے۔ لیکن فرصت میں اطمینان سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ یہ ایک مختلف کام ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے کچھ اندراجات خالد حسن قادری کی ''متروکات کی لغت'' میں بھی ملتے ہیں (جس کا ذکر معروضات کے ذیل میں کیا جا چکا ہے)۔ لیکن اوّل تو یہاں کئی اندراجات ایسے ہیں جو بالکل نئے ہیں اور متروکات کی لغت میں موجود نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض اندراجات یہاں خاصی تفصیل سے ہیں، مثلاً ''ہے گا'' کی بحث یہاں ذرا طویل ہے۔ اسی طرح ''ٹک'' پر یہاں وضاحت سے بحث کی ہے کہ جبکہ متروکات کی لغت میں صرف ایک سطر میں اس کے معنی لکھ دیے ہیں۔ ''ہاتھی ہزار لٹے سوا لاکھ کا'' کا اندراج اُس میں ہے ہی نہیں جبکہ یہاں بحث موجود ہے کہ یہ لٹے ہے یا لُٹے۔ غرضے کہ یہ کام خاصا مختلف ہے اور زیادہ دل چسپ۔ کیونکہ لغت میں پس منظر یا تمہید بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ممکن ہو تو مناسب نہیں ہوتا۔ اس مسودے میں یہ کمی بھی نہیں ہے اور متعدد الفاظ، محاورات و مرکبات یا کہاوتوں پر تفصیلی مباحث ہیں۔

اس مسودے کی تدوین میں جو امور پیش نظر رہے نیز مسودے کی ظاہری حالت اور طرزِ املا کی جو کیفیت تھی اسے یہاں مختصراً پیش کیا جا رہا ہے:

اصل مسودہ دست نوشتہ ہے اور اے فور (A4) کی جسامت کے غیر لکیر دار

کاغذوں پر سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ ہر قسط میں کئی الفاظ/مرکبات پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن شاذ و نادر ہی کسی لفظ کو قلم زد کیا گیا ہے۔ چند مقامات پر سفیدہ ضرور لگایا گیا ہے۔ ہاں البتہ چند صفحات کو نصف کاٹ کر نصف حصہ نئے کاغذ کا جوڑا گیا ہے، غالباً تبدیلی یا اضافوں کی وجہ سے۔

قادری صاحب کا خط یوں تو صاف ہے لیکن بعض الفاظ پڑھے نہیں جاتے۔ قدیم اور متروک الفاظ کے ضمن میں بار بار کئی لغات سے رجوع کرنا پڑا۔ بعض صورتوں میں اس عاجز طالب علم کو قادری صاحب سے کچھ اختلاف کی جسارت بھی کرنی پڑی لیکن اس اختلاف کا اظہار راقم نے حواشی میں کیا ہے۔ یہ حواشی ہر قسط کے آخر میں درج ہیں۔ فہرستِ اسنادِ محولہ آخر میں ملاحظہ فرمایئے۔

قادری صاحب کا املا بعض مقامات پر حیرت انگیز طور پر قدیم ہے اور اس میں یکسانی بھی نہیں ہے، مثلاً وہ ہائے مخلوط کو کبھی کبھار نظر انداز کر جاتے ہیں اور مثال کے طور پر ''دوبھر'' کو انھوں نے ''دوبہر'' لکھا ہے اور ''کھائے'' کو ''کہائے''۔ لیکن ''ھ'' کی جگہ ہائے دوچشمی بھی لکھ جاتے ہیں، مثلاً پہنچی کو پھنچی اور پہیلی کو پھیلی لکھا ہے۔ قدیم انداز میں پہنچا کو پہونچا بھی لکھ گئے ہیں، یا پتا کو پتہ۔ نہ ہو کو کہیں نہو بھی لکھا ہے۔ اس طرح کے بعض دیگر الفاظ کا املا بھی جدید کر دیا گیا ہے۔ امالہ اکثر جگہ پر نہیں کیا۔ ان مقامات پر مجبوراً ''دخل در معقولات'' کرنا پڑا۔

بعض الفاظ جو زیرِ بحث آئے ہیں ان کا ذکر قادری صاحب نے بغیر کسی سُرخی/عنوان کے کر دیا ہے اور ان میں سے بعض بہت اہم بھی ہیں لیکن سرخی/عنوان نہ ہونے کی وجہ سے بیک نظر دیکھے نہیں جاتے اور نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ/محاورات/مرکبات کی سرخی قائم کی گئی ہے اور انھیں فہرست اندراجات میں درج کیا گیا نیز اشاریہ

الفاظ میں بھی ان کا اندراج ہے تاکہ قارئین کو آسانی ہو۔ بہرحال یہ اطمینان ضرور ہے کہ ان کی بوضاحت نشان دہی سے وہ یکساں طور پر قاری کی نظر میں رہیں گے۔ البتہ بعض سرخیاں غیر ضروری تھیں اور وہ محض ذیلی یا تحتی اندراجات تھے انھیں سرخی کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ فہرست کے برعکس اشاریۂ الفاظ میں ان کو ذیلی اندراج کے طور پر نہیں لکھا گیا۔

مسودے میں قادری صاحب نے ہر جگہ چوکور خطوطِ وحدانی (یعنی[ ]) استعمال کیے ہیں اور بعض حوالوں یا اضافی معلومات کو بھی چوکور خطوطِ وحدانی میں درج کیا ہے لیکن ہم نے انھیں قوسین (یعنی ( )) میں لکھا ہے۔ البتہ جو اضافے ہمیں متن میں کرنے پڑے ان کو تحقیق و تدوین کے اصولوں کے مطابق چوکور خطوطِ وحدانی (یعنی[ ]) میں درج کیا گیا ہے۔ اسی طرح اندراجات کے ساتھ اعرابِ ملفوظی کی وضاحت بھی ہم نے کی ہے اور ان کا اندارج بھی چوکور خطوطِ وحدانی میں کیا گیا ہے۔ بہت کم اندراجات پر اعرابِ مکتوبی تھے، ان کا بھی اضافہ کیا گیا اور اس کے لیے مستند لغات سے مدد لی گئی اور آخر میں فہرستِ اسناد میں بھی ان لغات کا اندراج ہے۔ قادری صاحب نے اکثر وقفے کی علامت یعنی کامے کی بجائے خمہ یعنی ڈیش لگایا تھا، اسے بھی درست کیا گیا ہے۔ قادری صاحب نے بعض الفاظ/مرکبات کا اندراج دوبارہ کر دیا ہے لیکن انھیں برقرار رکھا گیا ہے۔ کیونکہ بعض مقامات پر متن میں کچھ فرق و تغیر بھی ہے اور کہیں اضافی معلومات بھی ہیں۔

لیکن خالد حسن قادری صاحب کی وسعتِ مطالعہ، کلاسیکی متون پر ان کی دسترس، برمحل سند کے اشعار لانے کی صلاحیت اور تاریخی و تہذیبی مباحث پر عمیق نظر کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ فرسودہ اور دقیانوسی خیالات اور ضعیف الاعتقادی پر مبنی روایات کو (جو برعظیم پاک و ہند کے معاشرے میں عام ہیں اور بعض الفاظ و محاورات/ضرب الامثال کی بحث میں بار بار در آتے ہیں) وہ بڑے اطمینان اور تیقن سے رد کر دیتے ہیں۔ ہاں البتہ بعض اقساط

بالخصوص آخری اقساط میں ان کا انحصار سیّد احمد دہلوی کی ''فرہنگِ آصفیہ'' پر بہت زیادہ ہے اور کئی مقامات پر آصفیہ سے طویل اقتباسات نقل کردیے ہیں (جن میں سے بعض میں لفظی تصرف وتغیر بھی ہوگیا ہے)۔ قادری صاحب نے فیلن اور پلیٹس سے بھی بہت استفادہ کیا ہے اور فیلن سے انھوں نے بعض اسناد یا مثالیہ جملے بھی نقل کیے ہیں۔ درحقیقت فیلن کی لغت اس ضمن میں ایک خزانے سے کم نہیں اور افسوس کہ اردو والوں نے اس خزانے کو رومن سے اردو حروف میں منتقل کرنے پر کام بھی نہیں کیا۔

لغت نویسی کے نقطۂ نظر سے اس کتاب میں بعض نادر وقلیل الاستعمال الفاظ و تراکیب ملتی ہیں جو اگر بعض دیگر لغات مثلاً اردو لغت بورڈ کی لغت میں درج بھی ہیں تو ان کی اسناد کی کمی ہے اور یہ کتاب ایسے نادر اندراجات کے لیے قدیم اسناد بھی پیش کرتی ہے۔ پھر اس کتاب میں بعض عجیب اور لطیف نکات ہیں مثلاً ''عشق ہے'' جیسی تراکیب ومحاورات کی تشریح میں ہمارے بڑے بڑے لغت نویسوں، اہلِ علم واہلِ قلم حتیٰ کہ غالبؔ کے جید شرح نویسوں نے بھی کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قدیم روایات ورسوم ورواج کا بھی اس میں دل چسپ ذکر ملتا ہے۔

قاری کی آسانی کے خیال سے اس کام کے آخر میں اشاریۂ الفاظ بھی مرتب کر دیا گیا ہے تاکہ اگر کسی قاری کو کوئی لفظ الف بائی ترتیب سے تلاش کرنا ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ کسی خاص لفظ/مرکب کی بحث اور کہاں کہاں آئی ہے تو اسے آسانی ہو۔ اس سے لغت نویس بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس تدوین میں کتاب کے اندراجات کی ترتیب نہیں بدلی گئی (اگرچہ وہ الف بائی ترتیب میں نہیں ہیں) اور پہلے وہ فہرستِ اندراجات دی گئی ہے جو کتاب کے اندراجات کے مطابق ہے۔ فہرست بترتیبِ حروف تہجی الگ سے پیش نہیں کی گئی کیونکہ اشاریہ الف بائی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ قادری صاحب نے جس طرح اقساط کے شمار

کے عدد ڈالے تھے، ہر قسط کے آغاز میں انھیں اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ البتہ چند ایک مقامات کو چھوڑ کر تمام حواشی اس عاجز طالب علم کے نوشتہ ہیں۔ حواشی میں جن کتب کا حوالہ دیا گیا ہے ان کی طباعتی تفصیلات آخر میں فہرست مآخذ میں درج کی گئی ہیں۔ قادری صاحب کے حواشی کی نشان دہی بھی کردی گئی۔

اس کام میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ قادری صاحب کی مرہونِ منت ہے اور اگر کوئی خامی یا غلطی راہ پا گئی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس عاجز طالب علم کا تساہل و تغافل ہے۔

وما توفیقی الا باللہ۔

رؤف پاریکھ

وضاحت:

حواشی میں بعض مقامات پر بعض لغات کا نام مختصراً لکھا گیا ہے جن کی تفصیل ذیل میں پیش ہے (طباعتی تفصیلات مآخذ میں ملاحظہ کیجیے):

اسٹین گاس: (Steingass)،

A Comprehensive Persian-English Dictionary

المنجد: المنجد (عربی۔اردو)

امیر: امیر اللغات (مرتبہ امیر مینائی)

آصفیہ: فرہنگِ آصفیہ (مرتبہ سید احمد دہلوی)

بورڈ: اردو لغت (تاریخی اصول پر)، (مرتبہ اردو لغت بورڈ)

پلیٹس: (Platts)،

A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English

دہخدا: لغت نامۂ دہخدا (مرتبہ علی اکبر دہخدا)

علمی: علمی اردو لغت (مرتبہ وارث سرہندی)

فیلن: (Fallon)

A New Hindustani-English Dictionary

نور: نور اللغات (مرتبہ نور الحسن نیر)

فہرستِ اندراجات

☆......☆......☆

(۱)

الفاظ بعض اعتبارات سے انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ان میں بھی جان ہوتی ہے، یہ پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں، پھیلتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور بعض مر بھی جاتے ہیں۔ یہ عمل کس طرح ہوتا ہے۔ یہ لسانیات کا دلچسپ مسئلہ ہے۔ بعض الفاظ رائج رہتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ کسی نامعلوم عمل کے تحت غیر مروّج ہو جاتے ہیں، فصیح و غیر فصیح کا فرق شروع ہو جاتا ہے۔ زبانوں میں نئے الفاظ برابر داخل ہوتے رہتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر نیا لفظ اپنی اصلی شکل، ہیئت، معنی اور صوتیات کے ساتھ قائم رہے، ان سب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اُردو میں صدہا الفاظ اپنی ہیئت بدل چکے ہیں بعض کو متروک قرار دیا گیا ہے۔ ان متروک الفاظ میں بھی بعض ایسے ہیں جو خاص خاص علاقوں میں باقی رہ گئے ہیں۔

ہم بعض ایسے الفاظ، محاوروں اور قلچوں [کذا[1]] کا جائزہ پیش کریں گے جو یا تو متروک شمار کیے جاتے ہیں یا قدیم سمجھے جاتے ہیں یا بعض کو غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ ادب، شاعری، ثقافت، لسانیات اور عمرانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مطالعہ خاصا دلچسپ ہوگا۔ اس مختصر سلسلۂ مضامین میں کافی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے لیکن اصلاح کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یہ سب مطالعے بغیر کسی دعوے کے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہَے گا/ہَے گی [یائے لین]

آج کی قسط میں ہم ایک دلچسپ فعلِ ناقص کا جائزہ لیتے ہیں۔ فعلِ ناقص ہے: ہے گا یا ہے گی۔ مشہور لغت نور اللغات کے مؤلف جناب نور الحسن صاحب نیرّ نے تحریر فرمایا

ہے۔ ''گا یا گی'' کا اضافہ کر کے ہے گا، ہے گی بولنا عوام کی زبان ہے۔ صاحبِ نور اللغات کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ فعلِ ناقص ہے اور ہے گا دونوں کا محلِ استعمال مختلف ہے اور دونوں کا مفہوم بھی بالکل مترادف اور یکساں نہیں۔ فرق نازک ہے مگر بالکل واضح ہے۔ ہے گا کا مفہوم محض ''ہے'' سے زائد ہے۔ جب زور دے کر کہنا ہو کہ ہاں ہے۔ ہاں ہاں ہے۔ ضرور ہے، بالکل ہے، بے شک ہے وغیرہ تو ایسے موقعوں پر صرف ہے کی جگہ تانیث و تذکیر کے لحاظ سے گا یا گی کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ قدما کے ہاں یہ عوام کی بولی نہیں بلکہ فصیح شمار ہوتا ہے۔ اکبرآباد (آگرہ) میں آج تک اسی طرح بولا جاتا ہے۔ اسے عوام کی زبان کہنا یا سمجھنا غلط ہے۔ قدیم شعرا میر تقی میرؔ، رفیع سوداؔ، میر امنؔ وغیرہ کے ہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا مے خانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشے اور پیمانے پر
(میر تقی میرؔ)

لب و لہجہ ترا سا ہے گا کب خوبانِ عالم میں
غلط العام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں
(محمد رفیع سوداؔ)

اے یارو اس فقیر کا ٹک ماجرا سنو
میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا سنو
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم
ہے گا ہمارا درد نپٹ لا دوا سنو
(میر امنؔ، باغ و بہار، لندن ۱۸۵۱ء)

شیخ حفیظ الدین احمد کی کتاب ''خرد افروز'' کے آخر میں ایک قطعۂ تاریخ درج ہے۔[۲] مولوی حافظ سیّد بلگرامی میں ''حلِ غوامض'' (۱۸۸۵ء) میں قطعہ نقل کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں:

بعد اتمام کے تاریخ اُس کی[۳]
چاہا میں نے کہ لکھوں اپنا جی[۴]
آئی ہاتف سے ندا یوں فی الفور
خرد افروزِ جہاں یہ ہے گی

''ہے گی دیہاتیوں کا محاورہ ہے، اہلِ شہر دہلی و لکھنؤ اس مقام پر صرف ہے کہتے ہیں۔'' بلگرامی صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر محاورہ ہے کا نہیں بلکہ ہے گی کا ہے۔ یعنی یہ کہ ضرور ہے، بے شک ہے، بے شبہ ہے۔ اس موقعے پر صرف ہے کا استعمال البتہ خلافِ محاورہ ہوتا اور رہ گیا دیہاتیوں کا محاورہ تو میرؔ، سوداؔ، میر امنؔ اور اُن کے دوسرے ہم عصر شعرا کو کون دیہاتی کہہ سکتا ہے جن کے کلام میں اگر اس محاورے کا موقع ہوا ہے تو ہے گا اور ہے گی ہی استعمال کیا گیا ہے ہاں اگر صرف ہے کا محل ہے تو پھر صرف ہے استعمال ہوا ہے بغیر گا یا گی کے اور خدا جانے اگر میرؔ صاحب اپنے لیے دیہاتی کی پھبتی سنتے تو کیا کہتے۔ انھوں نے پہلے ہی دن لکھنؤ کے شرفا، نجبا، فصحا اور شعرا کو برسرِ مشاعرہ للکار کر بہ الفاظِ دیگر دیہاتی اور گنوار کہہ دیا تھا۔ آزاد نے ''آبِ حیات'' میں میر تقی میرؔ کے حالات میں اس واقعے اور مشاعروں کی تفصیل لکھ دی ہے۔ ہم صرف وہ قطعہ نقل کرتے ہیں جس میں تمام حاضرینِ لکھنؤ کو انھوں نے پُوربی کہہ کے للکارا ہے:

کیا بُود و باش پوچھو ہو پُورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کر برباد[5] کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے[6]

یہ نکتہ کہ محاورۂ اہلِ زبان کو قواعدِ زبان پر ترجیح وفوقیت حاصل ہے آزاد نے میرؔ ہی کی زبانی بیان کر دیا ہے۔ حالاتِ میرؔ کے ذیل میں ''آبِ حیات'' میں درج ہے۔ میر صاحب نے کہا:

میرے کلام کے لیے فقط محاورۂ اہلِ اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔ یہ کہہ کے اپنا ایک شعر پڑھا:

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا کہ آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ''ی'' کو ظاہر کرو پھر کہیں گے کہ ''ی'' تقطیع میں گرتی ہے مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔
میرؔ صاحب کا یہ جواب دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی لیکن ہم ایک اور بات کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ خیال عربی کا لفظ ہے اور اس کے تلفظ میں ''ی'' نہایت صاف اور واضح ہے۔ اس لیے یہ اعتراض درست ہوسکتا ہے کہ ''ی'' دبتی ہے یا گرتی ہے لیکن جس موقعے پر میرؔ نے خیال کا لفظ استعمال کیا ہے، اس موقعے کا خالص اردو لفظ دھیان ہے اور اس میں ''ی'' کا تلفظ خفیف ہے۔ خیال کی جگہ دھیان نظم کرنے سے یہ اعتراض بھی اٹھ جاتا ہے۔ اسی سبب سے میرؔ نے کہا کہ محاورہ یہی ہے۔ ہے گا کے استعمال میں میرؔ کا یہ شعر نقل ہوا ہے:

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا مے خانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانے پر

''آبِ حیات'' میں آزادؔ نے اس شعر کے ذیل میں یہ لکھا ہے:

کسی شخص نے کہا حضرت اصل محاورہ فارسی کا ہے۔ اہلِ زبان نے ابرِ قبلہ کہا ہے

ابرِ کعبہ نہیں کہا۔ میر صاحب نے کہاں ہاں قبلے کا لفظ بھی آ سکتا ہے مگر کعبے سے مصرعے کی ترکیب گرم ہو جاتی ہے۔

اب یہاں پر قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ بقول بلگرامی صاحب کے اگر اہلِ شہرِ دہلی اس موقعے پر صرف ہے بولتے تو معترض کہتا ہے کہ ہے گا دیہاتیوں کا محاورہ ہے اور اہلِ شہر لکھنؤ دہلی اس مقام پر صرف ہے کہتے ہیں۔ لیکن معترض نے ابرِ کعبہ پر تو اعتراض کیا ہے۔ ہے گا کے استعمال پر کچھ نہ کہا۔

معلوم نہیں کیا سبب ہے کہ باوجود اس امر کے کہ تمام فصحا کے کلام میں اس کے صحیح محلِ استعمال پر ہے گا یا ہے گی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں بعض علمائے ادب ولسانیات کو اس کے بارے میں مغالطہ ہوا ہے اور بجائے مزید غور وفکر کرنے اور تلاش وتفحص کرنے کے نہایت سہل انگاری کے ساتھ اب تک لکھ دیتے ہیں کہ ہے کے ساتھ گا یا گی کا استعمال غلط ہے یا عامیانہ ہے۔ بعض کو گا یا گی سے صیغۂ مستقبل کا دھوکا ہوا ہے۔ جناب محمد زبیر صاحب فاروقی شوکت اِلٰہ آبادی نے اپنی تالیف عمدہ اردو عروض ۱۴۰۶ھ میں ضعفِ تالیف سے احتراز کے ذیل میں نمبر ۶ پر تحریر فرمایا ہے ''ماضی قریب کو مستقبل سمجھ کر علامتِ مستقبل کا اضافہ نہ کیا جائے مثلاً آتا ہے کو آتا ہے گا کہنا غلط ہے۔'' جیسا کہ اوپر کی بحث اور مثالوں سے یہ واضح کیا جا چکا ہے۔ ہے گا یا ہے گی فعلِ ناقص کی مستند اور نہایت فصیح شکلیں ہیں۔ ہے گا اور ہے گی کا کچھ تعلق صیغۂ مستقبل سے نہیں۔ فصحائے اکبر آباد کے ہاں یا یوں کہنا صحیح تر ہوگا کہ اکبر آباد کے فیض یافتہ فصحا کے ہاں آج بھی رائج ہے۔

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۹؍ دسمبر ۱۹۸۸ء)

☆......☆

حواشی:

۱۔ اس قسط کا اصل مسودہ دست یاب نہیں ہو سکا اور یہ متن روزنامہ جنگ (کراچی) میں شائع شدہ پہلی قسط (۹؍ دسمبر ۱۹۸۸ء) کا ہے جس میں یہ لفظ ''قلمچوں'' ہی لکھا گیا ہے۔ یہ بظاہر کتابت کی

غلطی ہے۔ اُردو لغت بورڈ کی لغت کے مطابق ''قلمچہ'' کا لفظ ''چھوٹا قلم'' کے معنی میں ہے۔ دوسرے معنی اصطلاحی ہیں جو ''چھوٹی ٹہنی'' کے مفہوم میں ہیں۔ لیکن اس کے ایک اور معنی ''چھوٹا قلم'' بمعنی چھوٹا بلور یا کرسٹل (Crystel) کے بھی ہیں جو بورڈ کی لغت میں قلمچہ کی سند سے بھی ظاہر ہیں (جلد ۱۴، ۱۹۹۲ء)۔ لغت نامۂ دہخدا کے مطابق قلمچہ ''شاخچۂ درخت'' (یعنی درخت کی چھوٹی شاخ یا ٹہنی) کے مفہوم میں آتا ہے۔ (شمارہ ۵۷، ۱۳۳۹ ہجری شمسی)۔ قادری صاحب نے یہ لفظ نجانے کس مفہوم میں استعمال کیا ہے، یا استعمال بھی کیا یا نہیں اور یہ محض اخبار (جنگ) کے حروف کار کا تصرف ہے، کچھ کہہ نہیں سکتے۔

۲۔ خرد افروز (مترجم حفیظ الدین احمد، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء) میں یہ قطعہ آخر میں نہیں بلکہ ابتدا میں حفیظ الدین احمد (مترجم) کے دیباچے میں درج ہے (ص ۵)۔

۳۔ اوسکی: قادری صاحب کے متن میں ''اوسکی'' ہے جو ''اُس کی'' کا قدیم املا ہے۔ تلفظ کی نشان دہی کا یہ قدیم طریقہ اعراب بالحروف کہلاتا ہے اور اس میں ضمّے (پیش) کے بجائے ''واؤ'' (و) اور کسرے (زیر) کے بجائے ''ی'' لکھی جاتی تھی، مثلاً اُدھر کو اودھر اور اِدھر کو ایدھر لکھا جاتا تھا۔

۴۔ مجلسِ ترقیٔ ادب کے مطبوعہ نسخے میں یہ مصرع یوں ہے: ''چاہا میں لکھوں لگا اپنا جی'' اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ ''آبِ حیات'' (مرتبہ ابرار عبدالسلام) میں اور بعض دیگر نسخوں میں بھی یہاں لفظ برباد کے بجائے ویران درج ہے۔ (ملتان: بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۵۔

۶۔ یہ اشعار میرؔ کی کلیات میں شامل نہیں ہیں۔ بعض محققین کے مطابق میرؔ سے ان کا انتساب درست نہیں ہے، مثلاً قاضی عبدالودود کا یہی خیال تھا، البتہ نثار احمد فاروقی کو میرؔ کی حیات میں لکھی گئی ایک قدیم قلمی بیاض میں یہ اشعار بہ تغیرِ متن ملے تھے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ابرار عبدالسلام کے حواشی مشمولہ آبِ حیات، محولۂ بالا، ص ۵۱۸) اور اس قدیم روایت کی بنیاد پر ان کو میرؔ کے اشعار تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

(۲)

اس قسط میں کچھ الفاظ اور محاوروں پر گفتگو کریں گے۔

ٹانک یا ٹنک [ٹ مفتوح]

قدیم ہتھیاروں میں کمان کی خاص اہمیت تھی۔ اس کی لکڑی اور تانت کی خاص طور پر آزمائش کی جاتی تھی۔ قدیم زمانے میں برصغیر میں عمدہ قسم کی کمانیں بنائی جاتی تھیں۔ ملتان، گجرات، لاہور، سرہند کی کمانیں مشہور تھیں۔ انھیں بہت قیمتی اور اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ مشرقی حصوں میں پٹنہ، بہار اور حاجی پور میں بھی کمانیں اچھی بنتی تھیں۔ تیر و کمان اور قادر اندازی کی بہت سی اصطلاحیں اور الفاظ اردو شاعری اور ادب میں رائج ہیں۔

۱۹۴۴ء میں انجمن ترقیِ اردو نے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی تجویز و نگرانی سے مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی کی مرتبہ فرہنگِ اصطلاحات پیشہ وراں کی جلد ہشتم شائع کی تھی۔ اس میں تیر و کمان سے متعلق فنی معلومات محنت اور کاوش سے جمع کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر تحریر میں اس سے بہت مدد لی گئی ہے۔

کمان کی کارکردگی کو جانچنے کے مختلف طریقے ہیں۔ کتنی دور تک مار کرتی ہے، اس کا تیر کتنے فاصلے پر جاتا ہے، کتنی قوت اور شدت سے نشانے پر پیوست ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ کمان اور تیر کی مار کتنی ہے اس کو اصطلاح میں ٹانک یا ٹنک کہتے ہیں، مولوی ظفر الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

> ''ٹانک، ٹنک'' تیر اندازی کی اصطلاح، مراد کمان کی قوت، تڑپ جو
> اس کی مار کی دوری اور قوت کے اندازے کے لیے بولی جاتی ہے۔

کمان کی قوت کی جانچ کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ اس کے چلّے
میں ایک معین وزن لٹکا دیا جاتا ہے۔ اگر وزن سے کمان کے سرے
مرکز کی طرف جھک آئیں تو کمان کمزور تڑپ کی سمجھی جاتی ہے۔
معمولی کمان کے لیے پانچ سیر کا وزن اور مخصوص کمان کے لیے پچیس
سیر تک کا وزن اس کی جانچ کا معیار سمجھا جاتا ہے اور یک ٹانک کمان
وغیرہ کہا جاتا ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آلاتِ حرب کے طور پر کام آنے والی اچھی اور عمدہ قسم کی کمان کم سے کم ایک ٹانک کی ہونی چاہیے یعنی ایسی کمان جو چوبیس یا پچیس سیر وزن لٹکا دینے سے نہ جھکے۔ اسی طرح اگر کمان دو ٹانک کی ہو تو نہایت سخت ہوگی۔ اس کی قوت، تڑپ اور مار بھی بہت زیادہ ہوگی اور اسی طرح اس کو چلانے کے لیے بھی بہت زیادہ طاقت، دم خم اور قادر اندازی کی ضرورت ہوگی۔ ایسی کمان کو چڑھانا اور اس سے نشانہ لگانا یا میدانِ جنگ میں استعمال کرنا معمولی آدمی کا کام نہیں۔

مولانا نظامی بدایونی، مراثیٔ انیس و دبیر، مطبوعہ ۱۹۳۳ء کے حاشیے پر لکھتے ہیں:

''ایک ٹانک وزن چوبیس یا پچیس سیر کا ہوتا ہے۔ اس وزن کو کمان
کے چلّے میں باندھ کر کمان کی قوت کا اندازہ کرتے ہیں۔ جو کمان
ایک ٹانک وزن سے نہیں جھکتی، اس کا تیر سو گز کے فاصلے تک نشانے
پر لگ سکتا ہے۔''

میر انیس اپنے مشہور مرثیے ''پھولا شفق پہ چرخ سے جب لالہ زارِ صبح'' میں لکھتے ہیں:

شانے پہ تھی شقی کے وہ دو ٹانک کی کماں
ارجن بھی جس سے سہم کے گوشے میں ہو نہاں
چار آئینہ وہ پہنے تھا بَر میں کہ الاماں
دب جائیں جس کے بوجھ سے رستم کے استخواں

کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بد خصال میں
جکڑا ہے پیلِ مست کو لوہے کے جال میں

ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا

مشہور لغت فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی نے اس ضرب المثل کے ذیل میں لکھا ہے:

''یعنی امیر کیسا ہی غریب ہو جائے جب بھی خلقت اس کی قدر و منزلت اور توقیر و عزت کرتی ہے یا یوں کہو کہ امیر لُٹ کھَس[1] جائے مگر پھر بھی دولت کی کھرچن اس کے پاس رہتی ہے۔''

یہ کہاوت برصغیر کی مختلف بولیوں میں بہ ادنیٰ تغیر و تبدل رائج ہے۔ خود اردو میں مختلف کتابوں اور مصنفوں کے ہاں اس کے الفاظ یا ان کی ترتیب مختلف ملتی ہے۔ لیکن مفہوم اور محلِ استعمال وہی ہے جو مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی نے بیان کیا۔

بعض لوگوں کو لٹے یا لٹا کا تلفظ لام کے پیش سے بھی کرتے سنا گیا ہے یعنی لُٹا، لُٹنا، لُوٹنا (چھین لینا، غارت گری کرنا وغیرہ کے مفہوم ہیں) لیکن یہ صحیح نہیں، اصل لفظ ہے لام کے زبر سے۔ لٹنا اور لٹنے کے معنی ہیں: لاغر ہونا، کمزور ہو جانا، بیماری سے دُبلا ہو جانا، ڈھیلا پڑ جانا وغیرہ۔

''کہتے ہیں کہ خان صاحب بیماری سے بالکل لَٹ گئے۔'' یعنی بیماری سے پہلے جیسے صحت مند توانا اور چاق و چوبند تھے۔ بیماری سے اُٹھ کر اب ایسے نہیں رہے کمزور ہو گئے، ڈھیلے پڑ گئے ہیں وغیرہ۔

۱۹۱۱ء میں گورکھپور سے دو عجیب اور دلچسپ رسالے نکلتے تھے۔ ایک کا نام تھا فتنہ اور دوسرے کا عطرِ فتنہ[2]۔ عجیب و دلچسپ میں نے اس لیے کہا کہ برصغیر کی کسی زبان میں اتنے چھوٹے حجم کا رسالہ آج تک نہیں نکلا۔ ۲۴ر جون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں صفحہ ایک پر

درج ہے:

''ہاتھی ہزار لٹا ہوا پھر بھی سوالاکھ ٹکے کا۔ یعنی ہاتھی کیسا ہی لُٹ گیا ہو،
کمزور ہو گیا ہو مگر وہ سوالاکھ ٹکے کو ضرور بک جائے گا۔''

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۶ر دسمبر ۱۹۸۸ء)

☆......☆

حواشی:

۱۔ کھَسنا یا کھَس جانا: پلیٹس کے مطابق کھَسنا کا ایک تلفظ کھِسنا بھی ہے، معنی ہیں: ڈوبنا، گرنا، ڈھے جانا، جھکنا، زوال پذیر ہو جانا۔

۲۔ مزاحیہ رسالے فتنہ اور عطرِ فتنہ ریاض خیرآبادی نکالا کرتے تھے۔ فتنہ ہفت روزہ تھا اور یہ پہلے ریاض الاخبار کے ضمیمے کے طور پر جاری کیا گیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۸ر جولائی ۱۸۸۲ء کو گورکھ پور سے نکلا (نادم سیتاپوری، انتخابِ فتنہ، ص ۲۸)۔ یہ بدھ کے روز ریاض الاخبار کے ساتھ سولہ صفحات کے ضمیمے کے طور پر چھپتا تھا، یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے سولہ صفحات کا اضافہ کیا گیا جو عطرِ فتنہ کے نام سے شائع ہوتے تھے (ایضاً)۔ لیکن نادم سیتاپوری نے حسرت موہانی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ گورکھ پور کا فتنہ مارچ ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا (ایضاً، ص ۳۴)۔ ۲۴ر مارچ ۱۸۹۸ء کو فتنہ کا آخری شمارہ شائع ہوا (ایضاً، ص ۳۸)۔ فتنہ دوبارہ ۱۹۰۲ء میں نکلا اور ۱۹۱۱ء میں بند ہو گیا (ایضاً، ص ۴۱)۔

☆......☆

(۳)

ڈانگر یا ڈَنگر [ڈ مفتوح، نون غنہ]

اردو کا عام لفظ ہے، ''ڈھور ڈنگر'' بھی استعمال کرتے ہیں۔

اردو انگریزی کی مشہور لغت جو اپنے مؤلف کے نام سے ہی مشہور ہوگئی ہے Platts کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جان ٹی پلیٹس نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے یہ لغت مرتب کی ہے۔ اس کام میں برصغیر کے اردو، فارسی، عربی کے علما اور سنسکرت کے فضلا نے بھی اس کی بے حد مدد کی اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان کی امداد و اعانت کے بغیر پلیٹس کے لیے اس کام سے عہدہ برآ ہونا محال تھا۔ اس کا اعتراف کما حقہٗ اس نے نہیں کیا۔ بہر حال اس لغت میں غلطیاں بھی کثرت سے ہیں اور اتنی کہ اقسامِ اسقام گنانے مشکل ہیں۔

بہر حال پلیٹس نے ڈنگر بمعنی جانور اور مویشی درج نہیں کیا، اس کے ہاں ڈنگر بمعنی موٹا، کمینہ، بدمعاش، غلام، نوکر، درج ہے۔ (صفحہ ۵۶۷)

البتہ وہ ڈانگر درج کرتا ہے (صفحہ ۵۶۳) اور اس کے معنی ہیں دُبلا پتلا، فاقہ زدہ، سینگوں والا مویشی، کمزور لاغر مویشی، رائی یا مولی کے ڈنٹھل جن میں پھول وغیرہ ہوں۔

اردو زبان و ادب کے مشہور نقاد، مؤرّخ اور نہایت فاضل نقاد مولانا امتیاز علی صاحب عرشی رام پوری (مرحوم) نے ایک نہایت عالمانہ کتاب تالیف کی تھی ''اردو میں پشتو کا حصّہ'' اس میں مولانا عرشی صاحب فرماتے ہیں:

''اہلِ دہلی ڈنگر بول کر بھینس کے علاوہ تمام سینگ والے جانور مراد

لیتے ہیں۔ روہیل کھنڈی، بوڑھے سینگ والے کو ڈنگر کہتے ہیں۔ یہی صورت ڈانگر کی بھی ہے کہ افغانی اس سے ہر سینگ والا جانور مراد لیتے ہیں اور لفظ کی تفہیم اس کی تخصیص سے مقدّم ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ یہ لفظ پشتو کی وساطت سے دہلی اور روہیل کھنڈ کی زبان میں داخل ہوئے ہیں۔ چنانچہ روہیل کھنڈی میں ''سوکھ کر ڈانگر ہوگیا'' عام محاورہ ہے جو انسانوں تک کے لیے بول دیا کرتے ہیں۔'' (بہ ادنیٰ تغیّر)

دُور ہونا [واوِ معروف]

عام مفہوم تو صاف اور سادہ ہے یعنی پرے، الگ، فاصلے پر ہونا، جدا ہونا وغیرہ۔

لیکن اس کے کچھ اور معنی قدیم محاورے میں تھے اور اب اس معنی میں خدا معلوم کیوں زبان و قلم دونوں سے خارج ہوگیا بلکہ اپنے قدیم مفہوم میں اس قدر اجنبی ہوگیا ہے کہ یہ محاورہ جب کسی شعر یا قدیم نظم و نثر میں نظر آجاتا ہے تو اس کا مفہوم متعین کرنے میں دِقت ہوتی ہے۔ غالباً اس تحریر سے پہلے اس کے اس مفہوم کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات نے صرف سرسری طور پر اشارے کیے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ جدید محاوروں میں آج کل جب کہتے ہیں کہ ''ان کو معمولی مت سمجھنا بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔'' یعنی بہت ہوشیار ہیں، تیز ہیں، گھاگ ہیں، سیدھے سادے نہیں، وغیرہ وغیرہ تو پہلے بالکل ان ہی معنوں میں دور ہونے کا محاورہ مستعمل تھا۔ یعنی اس کی تفصیل اور اس کا تجزیہ کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

(ا) سمجھ دار ہونا، عاقل ہونا، دانا ہونا، ہوشیار ہونا، معاملہ فہم اور کائیاں ہونا۔

مثال میرؔ

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

اس مثال کے بعد یہ خیال گزرتا ہے کہ جو معنی اوپر متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے [یعنی سمجھ دار اور ہوشیار ہونا وغیرہ] وہ درست نہیں کیونکہ اس شعر میں اتفاق سے دور ہونے کا عام رائج الوقت مفہوم بھی صحیح ہو جاتا ہے بلکہ بادی النظر میں وہی زیادہ صحیح اور بہتر معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ اور مثالوں پر جو نظم اور نثر سے فراہم کی گئی ہیں، غور کریں گے تو اس قدیم محاورے کا طلسم کھل جائے گا۔

(۲) مزید معنی ہیں: چالاک ہونا، عیار ہونا، مکار ہونا، اپنے مطلب کی بات کو پیشِ نظر رکھنا اور نہایت تدبیر سے اسے حاصل کرنے کے حالات کو پیدا کرنا۔ ایسے موقعے پر بہت پہنچے ہوئے بھی کہتے ہیں طنزاً اور کچھ کم نہ ہونا، بمعنی عیاری و مکاری، اب اس مفہوم میں مثالیں میر حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان سے دیکھیے:

میں سمجھی ہوں تم کو بہت دور ہو
چلو اب کہیں یاں سے کافور ہو

غرض شاہزادی بہت دور تھی
یہ شکل اس کو پہلے ہی منظور تھی

شریعت کے عالم میں مجبور ہیں
نہیں اپنے نزدیک ہم دور ہیں

میر میر حسن اور ان کے ہم عصر شعرا کے ہاں دور ہونا کے یہ معنی کثرت سے ملتے ہیں بلکہ ان کے بعد آنے والے شعرا کے ہاں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔

مرزا شوق مثنوی فریبِ عشق میں لکھتے ہیں:

حُسن میں رشکِ حُور جانتے ہیں
بہت اپنے کو دُور جانتے ہیں

پنڈت رتن ناتھ سرشار، سیرِ کوہسار جلد اوّل ۱۹۳۴ء مطبوعہ لکھنؤ میں صفحہ ۱۴۳ پر لکھتے ہیں:

مجھ کو ناداں نہ سمجھ، دُور ہوں، دانا ہوں میں

اس مصرعے میں بہت واضح طور پر دور ہونا بمعنی دانا، سمجھدار، ہوشیار کے استعمال ہوا ہے۔ ''امراؤ جان ادا''، مرزا ہادی رسوا لکھنؤ کا غیر فانی ناول ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

کس قدر دُور ہیں معاذ اللہ
کیسے مغرور ہیں معاذ اللہ

حکیم قطب الدین خان باطن آگرہ کے رہنے والے غالب کے ہم عصر تھے۔ اگرچہ ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ غالباً ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ میاں نظیر اکبر آبادی کا زمانہ پایا تھا، شاعری کی ابتدا میں ان سے اصلاح بھی لی لیکن باقاعدہ تلمذ میاں نظیر کے صاحب زادے میاں گلزار احمد اسیر اکبر آبادی سے تھا۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مشہور تذکرۂ شعرا ''گلشنِ بے خار'' کے جواب میں باطن نے بھی ایک تذکرہ مرتب کیا جو ''گلستانِ بے خزاں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اُس میں شیفتہ نے جن شعرا کی تعریف کی تھی میاں باطن نے اُن سب کی تنقیص کی ہے۔ گویا شیفتہ کی ضد، اور رد میں ہی اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ زیادہ تفصیلی اور تقابلی مطالعے کے لیے راقم سطور کا مضمون ''ارمغانِ شعرائے دہلی'' ملاحظہ ہو۔

یہاں مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ اس تذکرے میں باطن نے غالب کے احوال میں جو جملے لکھے ہیں، ان میں بھی دُور ہونا کے محاورے کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

''اصحابِ تذکرہ کی تحریریں دیکھیں اور ان کی تقریریں دیکھیں کیا مغرور ہیں اپنے نزدیک کتنے دُور ہیں۔ یارانِ صحبت ان سے زیادہ غرور میں چور ہیں۔''

(گلستانِ بے خزاں، ۱۸۷۵ء)

قطب الدین باطن سے بھی بہت قدیم انشاء اللہ خان انؔشا کے ہم عصر مرزا عظیم بیگ کا ایک مخمس مولانا محمد حسین آزاؔد نے ''آبِ حیات'' میں ذکرِ میر انشاء اللہ خان انؔشا کے باب میں درج کیا ہے۔ اس میں بھی دُور ہونا اسی معنی میں استعمال ہوا ہے:

نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دُور
پر خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کون سی ہے نہیں جس پہ یاں عبور
کب میری شاعری میں پڑے شبہ سے قصور
بن کر قمل[۱] نکالنے کو تم خلل چلے

اور بھی بہت سی مثالیں نظم و نثر میں اس عہد اور دور کے شعرا اور نثر نگاروں کے ہاں تلاش کی جا سکتی ہیں، جن میں دُور ہونا بالکل ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے اور ان تمام مثالوں کو بغور دیکھ کر یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ تقریباً سو برس پہلے تک یہ محاورہ دہلی، لکھنؤ، آگرہ، غرض ہر جگہ ٹکسالی محاورے کی طرح رائج تھا۔ پھر آہستہ آہستہ متروک ہونا شروع ہوا اور بالآخر زبان و قلم دونوں سے خارج ہو گیا۔

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۸ء)

☆..... ☆

حاشیہ

۱۔ قُمل: [ق مضموم نیز مفتوح] جوں یا چیچڑی کے معنوں میں آتا ہے (ماخوذ از اردو لغت (تاریخی اُصول پر) مطبوعہ اردو لغت بورڈ، کراچی)

☆..... ☆

(۴)

برصغیر قدیم تہذیبوں کا مرکز، دانائی، فراست اور حکمت وعلم کا گہوارہ رہا ہے لیکن عہدِ فرنگ میں اس عظیم ملک کے متعلق طرح طرح کی بدگوئیاں کی گئیں۔ اسے برصغیر کہنا بھی غلط ہے۔ یہ اصل میں براعظم ہے، عظیم تہذیبوں کا مرکز، شاندار ثقافتوں کا گہوارہ، جلیل القدر اقوام کا مسکن لیکن غلامی کے عہدِ فرنگ میں یہاں کی ہر چیز کو تحقیر کا نشانہ بنایا گیا۔ اس قدر کہ خود یہاں کے رہنے والوں کو اپنے اوپر اعتماد نہ رہا:

کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے مزاج

اور اس طرح کے محاورے، کہاوتیں وغیرہ رائج ہوگئیں جن سے یہاں کے باشندوں کا استحقار اور فرنگی حاکموں کا افتخار نکلتا تھا، ان میں سے ایک محاورہ ہے:

دانایانِ فرنگ احمقانِ ہند

افضل العلما مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی جو عربک کالج دہلی میں پروفیسر بھی رہ چکے تھے، اپنی تالیف ''محاوراتِ ہند'' (۱۸۹۰ء) میں اس محاورے کے تحت لکھتے ہیں:

> ''فرنگستان کے دانا ہندوستان کے احمق مشہور ومعروف ہیں۔ بعض ظریفانہ یہ معنی کہتے ہیں کہ دانایانِ فرنگ احمقانِ ہند کی برابر ہیں۔''
> (صفحہ ۱۰۱)

ذہین مگر ستم ظریف لوگوں نے کہاوت کے معنی ہی بدل دیے بلکہ اس کو اُلٹ کر ان ہی کے سر پر دے مارا اور اس کا مطلب یہ کر دیا کہ فرنگستان کا عقلمند سے عقلمند آدمی بھی ہند کے احمق ترین کے برابر ہونا مشکل ہے۔ چہ جائیکہ عام فرنگی یہاں کے عام ملکی سے بازی

نہ لے جاسکے۔

داب

عربی مادّے سے ہے۔ اُردو میں بطور اسم اور مذکر کے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے دو عام معنی ہیں:

(الف) رسم ورواج، عادت، موقع ومحل، طور طریقہ۔

(ب) شدّت، دباؤ، زور۔

دابِ صحبت کے معنی ہیں طور طریق۔ آدابِ مجلسی۔ عاداتِ حسنہ، خصائلِ حمیدہ۔ موجودہ دور میں یہ لفظ اور اس کی دوسری تراکیب تقریباً متروک ہیں۔ پچھلے تقریباً پچاس برس کی ادبی وعلمی تحریروں میں یہ لفظ ملنا مشکل ہے لیکن اس سے پہلے کے دور میں نظم اور نثر دونوں میں رائج تھا۔

آدابِ مجلسی کے معنی میں میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

کیا جانیں دابِ صحبت از خویش رفتگاں کا
مجلس میں شیخ صاحب اک گودڑ[1] جانتے ہیں

مرزا رفیع سوداؔ در مدحِ بسنت خان میں لکھتے ہیں:

مجلس کے داب سے یہ واں دور ہے کہ وارد
پروانہ بے اجازت نزدیکِ شمع واں ہو

مولانا محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں متعدد جگہ اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ خواجہ میر دردؔ کے حال میں لکھتے ہیں:

''...... اتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا اس لیے پاؤں ذرا پھیلا دیا۔ انھوں نے کہا یہ امر فقیر کے دابِ محفل کے خلاف ہے۔ ....''

پھر ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا دابِ شرفا نہیں یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔''

اَرداس [الف مفتوح]

ارداس اصل میں فارسی عرض داشت کی بدلی اور بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ ۱۸۷۹ء میں فیلن نے اسے سنسکرت سے ماخوذ قرار دیا اور اس کی تنقیح اس طرح کی: ارد = کہنا + آشا + امید۔

۱۸۸۴ء میں پلیٹس نے بھی اسے شاید سنسکرت سے ماخوذ کہا[۲] اور یہ مادّہ لکھا: اردنا + آشم .... مگر یہ بھی شبہ ظاہر کیا کہ شاید عرض داشت کی بگڑی ہوئی شکل ہو یہ سب محض غلط اور قیاس آرائیاں ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان سب سے پہلے ہنٹر-ٹیلر نے اسے صاف طور پر عرض داشت کی خرابی قرار دیا اور سنسکرت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا اور ان سب کے سامنے ہنٹر-ٹیلر کی یہ لغت اور تشریح موجود تھی۔ اگر اس لفظ ارداس کو فارسی اصل سے الگ کر کے سنسکرت سے ماخوذ قرار دیا جائے تو اس کی مثال ہمیں مسلمانوں کے اثر و نفوذ سے قبل کے مقامی ادب میں یا بولیوں میں تلاش کرنی ہوگی۔ بدھ مت، جین مذہب، پالی اور اَپ بھرنش الفاظ سے ابھی تک ارداس کے استعمال کی کوئی مثال دستیاب نہیں ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ ہندی کی عظیم و ضخیم لغت ہندی شبد ساگر میں جو ۱۹۶۵ء میں دوبارہ نو (۹) مجلدات میں شائع ہوئی ہے، اس لفظ کو واضح طور پر فارسی الاصل قرار دیا گیا ہے اور سنسکرت کے کسی مادے سے اسے جوڑنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ہندی شبد ساگر مطبوعہ ورانسی (بنارس) میں ارداس کے یہ معنی دیے ہیں جو اردو میں درج کرنے پر لطف سے خالی نہ ہوں گے:

۱۔ نویدن کے ساتھ بھینٹ

مثال:　ایہہ یدھ ڈھیل دےنہہ تب تائیں
دہلی کی ارداسیں آئیں
(ملک محمد جائسی)

۲۔ کسی نیک سفر یا زیارت کے لیے سفر کرتے وقت شروع میں کسی دیوتا کی پرارتھنا کر کے اس کے لیے کچھ بھینٹ نکال رکھنا۔

۳۔ وہ ایشور پرارتھنا جو نانک پنتھی ہر نیک کام، چڑھاوے وغیرہ کے آغاز میں کرتے ہیں۔ (ہندی شبد ساگر)

اردو میں اس کے وہی معنی ہیں جو عرض داشت کے ہیں۔
فیلن نے اپنی لغت میں یہ مثال درج کی ہے:

سن مائی کے دیولے سُن مری ارداس
آج ملاوا پیو کا تو جلیو ساری رات
(نظیر اکبر آبادی)

سب سیں نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو "واہ گرو"

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۳رجنوری ۱۹۸۹ء)

☆......☆

حواشی

۱۔　کود: [واوِ معروف] اردو لغت بورڈ نے معنی میں چھلانگ، جست لکھا ہے۔ لیکن فیلن نے کود کے ایک اور معنی شیخی، ڈینگ بھی دیے ہیں اور یہاں یہی معنی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

۲۔　اردو کے انگریز لغت نویسوں کے ہاں یہ رجحان بہت نمایاں ہے کہ وہ فارسی حتیٰ کہ عربی الفاظ کی اصل اور اشتقاق کو غیر ضروری طور پر سنسکرت میں تلاش کرتے ہیں، پلیٹس کے ہاں رجحان خاص طور پر واضح ہے جس کی وجہ بقول خالد حسن قادری صاحب کے "سنسکرت نوازی" ہو سکتی ہے۔

☆......☆

(۵ اور ۶)

یہ اقساط دست یاب نہ ہوسکیں۔

☆......☆

(۷)

پانی پی پی کے کوسنا

اردو میں پانی سے متعلق بہت سے محاورے رائج ہیں۔ پانی پی پی کے کوسنا بہت عام محاورہ ہے۔ جی بھر کے بُرا بھلا کہنا، شدت سے کوسنا، اس کے معنی ہیں۔ کوسنے کے لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ محاورہ عورتوں سے مخصوص ہو لیکن یہ محاورہ عورتوں سے مخصوص نہیں۔ پہلے اس کا استعمال عام تھا اور اب بھی سننے میں آتا ہے۔ مرزا جان طپش، مشہور شاعر، زبان داں اور عالم گزرے ہیں۔ اردو زبان کی مصطلحات اور محاوروں سے متعلق ان کی تصنیف شمس البیان فی المصطلحاتِ ہندوستان[1] بہت مشہور ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے مرزا علی نقی محشور کا یہ قطعہ درج کیا ہے:

کیا ظلم ہے دل میں بس مسوسا کیجے
جب یادِ لبِ جام کا بوسا کیجے
ایذا ہے سخت محتسب کے ہاتھوں سے
پانی پی پی کے اس کو کوسا کیجے

(شمس البیان۔ مخطوطہ ۱۷۹۳ء)

مرزا طپش نے شمس البیان میں ہی پانی کا ایک اور محاورہ دیا ہے۔ پانی سے پتلا کرنا، یعنی شرمندہ کرنا، خفیف کرنا۔ سند میں مصحفی کا یہ شعر ہے:

چشم نے رو رو کے دریا کر دیا
ابر کو پانی سے پتلا کر دیا

پانی لگنا [ل مفتوح]

پانی سے متعلق ایک اور دلچسپ محاورہ ہے: پانی لگنا۔ آج یہ محاورہ سننے میں بالکل نہیں آتا اور یہ تقریباً متروک سا ہے لیکن بھلے عام بول چال میں استعمال ہوتا تھا۔ نظم اور نثر دونوں میں اس کی مثالیں مستند زباں دانوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔

دیوانِ ذوق مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۹۰۳ء میں شائع کیا تھا۔ بعض مقامات پر آزاد نے تشریحیں بھی درج کی ہیں۔ پانی لگنا کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"........ بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق آتا ہے کہ...... امراضِ مہلک میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں مقام میں مر گیا۔ پانی لگا تھا........"

آب خنجر ہے جو زیرِ لب وفاداروں کو
ملکِ سرحد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے
(ذوق)

پنڈت رتن ناتھ سرشار اپنی لافانی تصنیف فسانۂ آزاد کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی ایک اور تصنیف ہے سیر کوہسار...... اس میں لکھتے ہیں:

"...... ہم سمجھتے تھے کہ وہاں کا پانی لگتا ہے۔ اور لوگ ماندے ہو جاتے ہیں اور شہروں کے جنگل ہیں........"

(سیرِ کوہسار۔ جلد اوّل، لکھنؤ ۱۹۳۴ء)

پانی مَرنا [م مفتوح]

پانی کا ایک اور عام محاورہ ہے: پانی مرنا۔ یہ آج بھی رائج ہے اور بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ مفہوم اس کا اس طرح ہے۔ دل میں چور ہونا، شبہے کو تقویت پہنچانے والی باتیں یا

حرکتیں کرنا، ایسا طور و انداز اختیار کرنا جس سے کہنے والے کے خیال کی تصدیق و تائید ہو..........وغیرہ۔

مرزا جان طپش نے شمس البیان میں سند میں اپنا یہ قطعہ درج کیا ہے:

روبرو کرنی پیار کی باتیں
تس پہ انکار عشق کرنا ہے
اے طپشؔ ہم نہ مانیں یہ انکار
تیری باتوں میں پانی مرنا ہے

پانی ملتان بہہ گیا

پانی مرنے کا محارہ آج بھی رائج ہے لیکن ایک اور دلچسپ محاورہ ہے جو تقریباً متروک ہوگیا اور اب نہ سننے میں آتا ہے نہ کہیں تحریر میں نظر آیا۔ محاورے میں کہتے تھے: پانی ملتان بہہ گیا۔ محمد حسین آزاد نے محولہ بالا دیوانِ ذوق میں صفحہ ۱۶ پر اس کی تشریح کی ہے:

"..........محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا یا کسی کام کا وقت گزر جاتا تو کہتے تھے۔ اب وہ پانی ملتان بہہ گیا۔ یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے، ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا دریائے شور میں جا پڑتا ہے پھر اسے ادھر آنے کا موقع نہیں۔ پس جب کسی امرِ فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اب اس کا موقع گزر گیا۔ اب نہ ہو سکے گا.........."

تھا ذوقؔ پہلے دلّی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا
(ذوق دہلوی)

میاں نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں:

وہ دیکھ کے خط آئینے میں کل بھر کر آہ لگا کہنے
اس سبز قدم کے آتے ہیں سب خوبی کے سامان گئے
جب میں نے نظیر اس سے یہ کہا اب غم کھائے کیا ہوتا ہے
ان باتوں کو مت یاد کرو وہ پانی بہہ ملتان گئے

(نظیر اکبرآبادی......روحِ نظیر مرتبہ مخمور اکبرآبادی)

پاتُراب [ت مضموم]

سفر کے لیے نقل وحرکت کو بھی کہتے ہیں اور اس کا ایک اور استعمال بطور محاورہ کے بھی ہوتا ہے۔ بعض لوگ ہر کام سے پہلے استخارہ ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض سفر کرنے کے لیے نیک شگون اور ساعت سعد ہونا ضروری جانتے ہیں۔ جس دن اور وقت سفر کرنا ہوا گر وہ دن اور وقت سعد نہ نکلے تو بہت مشکل پیش آ جاتی ہے۔ ادھر تو سفر ضروری ادھر سفر کا وقت، دن اور ساعتِ سعد نہیں۔ اس مشکل کے عمدہ نمونے کی ایک دلچسپ تدبیر یا حیلہ دریافت کیا گیا جو سعد ہو اس دن اور ساعت پر اپنے اسبابِ سفر میں کسی جگہ یا مکان پر کوئی چیز بھیج دیتے ہیں۔ گویا اس نیک ساعت پر سفر شروع ہو گیا۔ اب جس وقت اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق جانا ہے اس وقت چلیں گے اور اس جگہ قیام کریں گے یا اپنی وہ چیز ساتھ لے کے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس عمل کو پاتراب بھیجنا یا پاتراب لینا کہتے تھے۔

مرزا داغ دہلوی کہتے ہیں:

دیکھیے کب عدم کو جانا ہو
کر چکے داغ پاتراب بہت

(گلزارِ داغ)

کسی کا شعر ہے:

پاترابی سے زیادہ نہ تھا دنیا میں قیام
گو تفاول کے لیے بھی تو ہمیں ساز نہ تھی

(منقول از: روز نامہ جنگ، کراچی، ۱۷/مئی ۱۹۸۹ء)

☆......☆

حاشیہ

۱۔ طپش کی کتاب کا درست نام "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" ہے، اگرچہ عام طور پر اس کے نام میں "الہندوستان" کے بجاے "ہندوستان" ہی لکھا جاتا ہے۔ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) نے ۱۹۷۷ء میں اس کا ایک ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس کا سالِ تالیف محرم ۱۲۰۷ ہجری/ ستمبر ۱۷۹۲ء ہے۔ البتہ اس کی اشاعت ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء سے پہلے نہ ہو سکی۔ طپش کا اصل نام اسمٰعیل تھا اور جہاندار شاہ سے صحبت تھی۔ میر درد کے شاگرد تھے۔ اس لغت میں طپش نے اردو محاوروں کے معنی فارسی میں بیان کیے ہیں۔ صرف سو (۱۰۰) کے قریب صفحات پر مبنی ہونے کے باوجود یہ ایک اہم لغت سمجھی جاتی ہے۔ (تفصیلات: رؤف پاریکھ، لغوی مباحث (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۰-۱۹)

☆......☆

(٨)

پَر [پ مفتوح]

پر اردو کا عام اور کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ لیکن، مگر، وغیرہ کے معنی میں پلیٹس نے اسے سنسکرت بتایا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پراکرت اور مقامی بولیوں کے ذریعے اردو میں داخل ہوا ہے۔ روزمرہ کی بول چال کے علاوہ بعض حلقوں میں اسے بہت زیادہ پذیرائی بھی حاصل نہیں۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سنسکرت سے اس کا رشتہ ثابت ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن فارسی سے اس کا تعلق مستحکم ہے۔

مولوی محبوب علی رام پوری نے اپنی تالیف منتخب النفائس میں لکھا ہے:

''پر۔ بفتح بائے فارسی، لفظ فارسی ست بمعنی مگر، وحشی گوید۔ شعر

آں کہ ہرگز یاد مشتاقاں بمکتوبے نہ کرد

گرچہ گستاخی ست می گویم پر خوبے نہ کرد

(منتخب النفائس۔ کان پور، ۱۲۸۶ھ)

پَلیتھَن نِکالنا [پ مفتوح، یائے مجہول، تھ مفتوح، ن مکسور]

اردو کا عام محاورہ ہے ''پلیتھن نکالنا''۔ چپاتی پکاتے وقت اسے بیلنے اور توے پر ڈالنے سے پہلے جو آٹا استعمال کرتے ہیں اُسے پلیتھن کہتے ہیں۔ روٹی بیلن سے بیلنے سے پہلے ہلکا ہلکا آٹا پھیلا دیتے ہیں پھر اس پر پیڑے کو دبا دبا کر ٹکیہ بناتے ہیں اور بیلن سے اچھی طرح دبا دبا کر چاروں طرف پھیلا کر بیلتے ہیں اور گول پتلی چپاتی بنا لیتے ہیں۔ زائد پلیتھن کو تھپک کر جھاڑتے ہیں اور چپاتی توے پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سارے عمل میں خشک آٹا

کافی کام آتا ہے اور اچھی طرح دبایا اور جھٹکا جاتا ہے۔

اس تمام عمل سے **پلیتھن** نکالنے کا مفہوم دبانا، ستانا، پریشان کرنا، دق کرنا، تنگ کرنا، بھرکس نکالنا پیدا ہوا۔ اور اسی مفہوم میں آج بھی عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔

پلیتھن پکانا

سوداؔ کے ہاں ایک نسخے میں **پلیتھن** پکانا بھی ملتا ہے۔

نان پا کو جو دیکھوں بھر کے نظر
مجھے کہتا ہے یوں وہ گیدی خر
ٹکے مشرف کے گھر لگاؤں گا
اور **پلیتھن** ترا پکاؤں گا

لیکن یہ شعر کلیات سودا مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ اور نسخۂ جانسن میں اس طرح درج ہے:

تکے مشرف کے گھر لگاؤں گا
اور **پلیتھن** ترا نکالوں گا

اس شعر کے کچھ معنی نہیں نکلتے۔ سوائے اس کے کہ اس شکل میں **پلیتھن** کا محاورہ جدید اور درست ہو گیا۔ یہ بات بھی شبہے سے خالی نہیں کہ سوداؔ نے لگاؤں گا اور نکالوں گا کو قافیہ قرار دیا ہوگا۔ نسخۂ جانسن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سوداؔ نے اس کو خود اپنے اہتمام سے لکھوا کر جانسن کی نذر کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ شعر درست نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے یہ شعر مشہور لغت مرتبہ ٹیلر۔ ہنٹر ۱۸۰۸ء میں **پلیتھن** پکانا کے ذیل میں ملا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی اصل شکل میں قوافی لگاؤں گا اور پکاؤں گا ہی ہوں گے۔

مُشرِف [م مضموم، ر مکسور] نگران کے معنی میں آتا ہے۔ اسی لغت میں درج ہے کہ مطبخ کا حساب کتاب رکھنے والے اور نگرانی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں[1]۔ ترجمے میں اس نے لکھا ہے:

''مطبخ کے نگراں کے گھر رشوت پہنچاؤں گا اور پھر تجھے ستاؤں گا۔''

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم سے یہ دو محاورے الگ الگ چلے آئے تھے۔ پلیتھن پکانا بمعنی تکلیف پہنچانے کے اور پلیتھن نکالنا بمعنی بُری طرح مارنے پیٹنے اور بھرکس نکالنے کے۔ جب چپاتی پر زیادہ پلیتھن لگ جاتا ہے تو اسے بھی جھٹک کر اور ہاتھ سے تھپکی دے کر جھاڑتے ہیں۔ لیکن بعد میں پلیتھن پکانا متروک ہو گیا اور پلیتھن نکالنا جاری رہا۔ حالانکہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔

نوراللغات میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

ٹکّی مشرف کے گھر لگاؤں گا
اور پلیتھن ترا پکاؤں گا

ہنٹر اور ٹیلر (۱۸۰۸ء) نے اپنی لغت میں ٹکّے پڑھا ہے اور اس کے ترجمے میں رشوت پہنچانا درج کیا ہے۔ قدیم طرزِ تحریر میں ی [یائے معروف و مجہول] کے لکھنے میں کوئی فرق ملحوظ رکھا جاتا تھا نہ احتیاط برتی جاتی تھی۔ ''ی'' اور ''ے'' دونوں یکساں ہی لکھتے تھے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ سودا کے ہاں بھی یہ لفظ ٹکّی ہو گا اور اس کو بعض نے ٹکّے پڑھا ہو۔

ٹِکّی لگانا [ٹ مکسور، ک مشدد]

ٹکّی لگانا خود اپنی جگہ پر اردو کا محاورہ ہے۔ چھوٹی روٹی یا ٹکیہ کو بھی ٹکّی کہتے ہیں۔ اس محاورہ میں تین مفہوم خاص ہیں۔

(۱) ایسے مراسم و تعلقات پیدا کرنا جن سے نفع حاصل ہو۔

(۲) اپنا فائدہ اور نفع حاصل کرنا۔ معمولی روزی کمانا۔

(۳) اپنا کام نکالنا۔ اپنے مطلب کی بات کرنا۔

میر تقی میر کا شعر ہے:

یاں پلیتھن نکل گیا اور غیر
اپنی ٹکّی لگائے جاتا ہے

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بلوچی میں ملاّ کے روزینے کو بھی ٹکی کہتے ہیں۔اس لیے عین ممکن ہے کہ اردو میں ٹکی کے لفظ نے بلوچی کے ذریعہ ہی راہ پائی ہو۔

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۴رمئی ۱۹۸۹ء)

☆......☆

حاشیہ

۱۔ مُشرِف: پلیٹس کے مطابق مُشرِف کے معنی اعلیٰ اور بالا کے علاوہ ایک معنی معائنہ کار، مشاہدہ کرنے والا، جانچنے والا اور محکمہ مالیات کا افسر بھی ہیں۔

☆......☆

(۹)

انسانی زندگی جن معمولات کی عادی ہو جاتی ہے ان میں اگر ذرا سا بھی خلل واقع ہو تو انتشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وقت پر بارش ہو یا وقت پر نہ ہو اور ضرورت کے قدر ہو یا نہ ہو، معمولی سے تغیرات سے دُور رس اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔ قحط، کال اور آفاتِ ارضی و سماوی ہیں اور آج کی دُنیا میں مختلف ممالک ان مرحلوں سے گزر رہے ہیں۔

کال

قحط کے سوا اور معنی میں بھی آتا ہے یا یوں کہیے کہ سنسکرت اور مقامی پراکرتوں اور بولیوں میں یہ لفظ کثیر المعنی ہے۔ یہاں اس کے صرف ایک پہلو سے بحث ہے یعنی کمی، قحط وغیرہ۔

کال کے معنی صرف غلّے اناج وغیرہ کی کمی یا فقدان ہی نہیں ہے جو عام طور پر وقت پر صحیح مقدار و ضرورت کے مطابق بارش نہ ہونے سے واقع ہو بلکہ یہ کمی اور فقدان بارش کی کثرت اور ضرورت سے زیادہ اور بے وقت ہونے پر بھی واقع ہو سکتا ہے۔

دُنیا کے مختلف ممالک دونوں قسم کے کالوں سے گزر رہے ہیں۔ اگر پانی اور بارش کی کمی کی وجہ سے اناج پیدا نہ ہو تو اسے اَن کال کہتے ہیں۔

ایک مشہور زباں داں شاعر اور نقاد احمد حسن صاحب گزرے ہیں۔ میرٹھ میں قیام تھا اور مجدّ دِالسنۂ شرقیہ احمد حسن میرٹھی کے نام سے مشہور تھے۔ جناب سر شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن کی جنوری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں ان کا ایک مضمون بعنوان ''تہذیب کی ترقی کا طوفان'' شائع ہوا تھا۔ اس میں مجدّ دِالسنۂ شرقیہ لکھتے ہیں

''کال خشک سالی ہی نہیں ہے بلکہ پن کال بھی وبالِ جان و مال ہے۔'' (صفحہ ۳۸)

پن کال کیا ہے؟ پانی کی کمی یا قلت نہیں بلکہ پانی کی کثرت کے سبب فصلوں کی تباہی سے پڑنے والا قحط پن کال کہلاتا ہے۔

میر مہدی مجروح کے نام غالب لکھتے ہیں:

''قصہ مختصر وہ اَن کال تھا کہ مینھ نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے۔ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بھی بہہ گئے۔ جنھوں نے ابھی نہیں بویا تھا، بونے سے رہ گئے ....''

(عودِ ہندی۔ مطبعِ مجتبائی۔ ۱۸۶۸ء)

پُوری پڑنا [واوِ معروف]

اردو کا محاورہ ہے۔ مراد اس سے ہے کافی ہونا، کفایت کرنا۔ جو توقعات، مطالبات اور ضروریات ہوں ان کے قدر ہونا۔ اس محاورے میں جنس کی تذکیر و تانیث سے قطعِ نظر کی جاتی ہے۔ اگر جنس مؤنث ہے تو پوری کا لفظ بادی النظر بھی درست معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ذکر اور اشارہ جنسِ مذکر کی طرف ہو اس وقت بھی پوری پڑنا ہی کہا جائے گا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں میر کے احوال میں لکھا ہے:

''ایک بکری پالی۔ اس کے چار تھن تھے۔۔ بچہ ہوا تو دودھ ایک ہی تھن میں اُترا۔ وہ بھی اتنا تھا کہ بچے کو پوری نہ پڑتی تھی ......''

تخت پوش [ت مفتوح، خ ساکن، واو مجہول]

بظاہر اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ تخت کے اوپر بچھانے کا کپڑا یا فرش، دری یا قالین وغیرہ ہوگا۔ برصغیر کے بعض علاقوں میں لکڑی کی بڑی چوکی کو صرف تخت ہی کہتے ہیں۔ مشرقی رہن سہن کے خاندانوں میں نشست و برخاست کے لیے اسی طرح کے

بڑے بڑے تخت استعمال کیے جاتے تھے لیکن بعض دوسرے علاقوں میں صرف اس تخت کو تختہ بوش کہتے ہیں۔ فارسی میں تختہ پوش لکڑی کے تخت یا چبوترے کو کہتے ہیں۔ پشتو میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجاب کے بعض علاقوں میں بھی تخت پوش کے یہی معنی ہیں۔

اردو کے مشہور عالم، محقق اور نقاد جناب امتیاز علی صاحب عرشی مرحوم نے اپنی گراں قدر تالیف ''اردو میں پشتو کا حصہ'' میں اس لفظ پر دلچسپ بحث کی ہے۔ مولانا عرشی کا بیان ہے:

> ''تخت پوش کے متعلق قاضی محمد صادق اختر (معیار الاغلاط) نے لکھا ہے کہ اہلِ بنگالہ تخت کو کہتے ہیں۔ نیز یہ لفظ اصل میں تخت پوست تھا۔ کابل و قندھار میں امرا کے محلات کے اندر لکڑی کے تخت صحن میں بچھے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک دو صاحبِ خانہ اور اس کے رفقا کے لیے خوش رنگ کھالوں سے آراستہ کر دیے جاتے ہیں اور انھیں تخت پوست کہتے ہیں۔ اہلِ بنگالہ نے غلط فہمی سے سب تختوں کو تخت پوست کہنا شروع کر دیا جس نے رفتہ رفتہ تخت پوس کی شکل اختیار کر لی۔ امیر مینائی نے لکھا کہ میں نے بعض آدمیوں کو تختہ پوش بولتے سنا ہے جو غلط در غلط ہے۔''
>
> ''میں [مولانا عرشی] عرض کرتا ہوں کہ پلاٹس (Platts) نے تخت پوش لکھ کر تخت کی پوشش، بیٹھنے کا گدا، ڈھکا ہوا اسٹیج بھی معنی لکھے ہیں۔ راورٹی (Raverty) نے اسٹیج، پلیٹ فارم اور لکڑی کے فرش کے لیے تخت پوش لکھ کر اسے پشتو بتایا ہے۔ چوں کہ اختر [قاضی محمد صادق] نے اس لفظ کا وطنِ اصلی کابل و قندھار کو قرار دیا ہے اور راورٹی (Raverty) کے بیان کے مطابق اہلِ افغانستان اس کا تلفظ تختہ پوش کرتے ہیں اس لیے میں [مولانا عرشی] اس سے یہ نتیجہ

نکالتا ہوں کہ ہمارے یہاں کا تخت پوش جسے امیر مینائی غلط در غلط
فرماتے ہیں اسی پشتو تختہ پوش کی شکل ہے........"

تختہ ہونا/دُکان تختہ ہونا [ت مفتوح، د مضموم]

تخت اور تختہ کا ذکر ہوا ہے تو اردو کے ایک محاورے پر اور غور کر لیتے ہیں محاورے تو اردو میں بہت ہیں جن میں تخت اور تختہ کے الفاظ آتے ہیں اور سب متروک بھی نہیں ہوئے۔ جدید اُردو کی تحریر اور تقریر میں برابر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک محاورہ تھا، تختہ ہونا، دکان تختہ کرنا یا تختہ ہونا۔ پہلے دکانیں بند کرنے کے لیے تختے لگا دیے جاتے تھے اس لیے دکان تختہ کرنا یا ہونا دکان بند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ دکان بند ہو جانا، بازار سرد ہو جانا، سرد بازاری ہونا، وغیرہ۔ میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

دکانیں حُسن کی آگے ترے تختہ ہوئی ہوں گی
جو تو بازار میں ہوگا تو کب یوسف بِکا ہوگا

☆......☆

(۱۰)

بعض نام اشخاص ومقامات کے اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں اور زبان وادب میں تمثیلات، تلمیحات اور محاوروں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں۔

تِلاوڑی [۱] [تِ مکسور، وساکن]

سرہند شریف کے مضافات میں ایک جگہ کا نام ہے۔ کسی زمانے میں یہ جگہ سنسان، غیرآباد اور اس وجہ سے غیر محفوظ سمجھی جاتی تھی۔ ایسے مقامات جرائم پیشہ عناصر کے لیے شکار گاہ اور پناہ گاہ دونوں کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ تلاوڑی کے علاقے میں ڈاکو، چور، لٹیرے اس کثرت سے تھے کہ یہ جگہ ضرب المثل ہوگئی تھی۔ مرزا رفیع سوداؔ نے لکھا ہے:

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہ زنی تلاوڑی کی

سوداؔ ہجویات کا بادشاہ ہے۔ دہلی کے ایک کوتوال کی بدانتظامی سے ناخوش ہوکر ایک زوردار ہجو لکھی۔ یہ شعر اسی ہجو کا ہے۔ چاوڑی بازار دہلی کا مشہور، بارونق اور پُر ہنگامہ تجارتی مرکز ہے اور وسطِ شہر میں واقع ہے۔ ایسی مرکزی جگہ بھی اگر چور، اُچکوں اور رہزنوں سے محفوظ نہ ہو تو بدانتظامی کا کیا ٹھکانہ ہوگا اور صاحبان بست وکشاد کے نظم ونسق پر کیسا داغ ہوگا۔ سوداؔ نے اسی لیے تلاوڑی کو چاوڑی بازار کے مقابلے میں کم خطرناک اور مخدوش بتایا ہے۔

مرزا جان طپش نے اپنی کتاب شمس البیان فی المصطلحاتِ ہندوستان [۲] میں اس تلمیح کو وضاحت سے لکھا ہے:

''تلاوڑی نام صحرا ایست کہ در نواحِ سرہند واقع واکثر قطاع الطریق دراں میدان قافلہ غارت کنند و در عرف حال این لفظ عموماً بر جمیع محلِ خطر اطلاق دارد۔ مرزا رفیع در ہجوِ کوتوالِ دتی انتظامی شاجہاں آباد گوید:

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہ زنی تلاوڑی کی

چوں بازارِ چاوڑی مسکنِ غلّہ فروشاں باتصال جامع مسجد و در عین آبادی شہر واقع ست۔ معنی شعر مشتمل بر صنعتِ متضاد موزوں شدہ و باعتقادِ قائل نتیجہ آں بدنسقیٔ کوتوال مذکور است......''

ترجمہ:

''تلاوڑی'' ایک جنگل کا نام ہے جو سرہند کے نواح میں واقع ہے۔ اس میدان میں اکثر چور، ڈاکو قافلوں کو لوٹتے ہیں اور اب عام بول چال میں اس لفظ کا اطلاق تمام خطرناک مقامات پر ہوتا ہے۔ شاجہاں آباد کے نظم ونسق کے ذمے دار کوتوال کی ہجو میں مرزا رفیع نے کہا ہے:

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہ زنی تلاوڑی کی

چاوڑی بازار غلّہ فروشوں کا مسکن جامع مسجد کے متصل عین آبادیٔ شہر میں واقع ہے۔ اس کے معنی صنعتِ متضاد پر مشتمل ہیں اور کہنے والے کے اعتقاد کے مطابق ذکر کردہ کوتوال کی بدانتظامی کا نتیجہ ہے۔''

یعنی یہ کہ شہر میں واقع بازار میں لٹیروں، چوروں اور رہزنوں کی بھرمار دیکھ کر

تلاوڑی اور وہاں کی رہزنی آدمی بھول جاتا ہے۔

توڑے دار بَندُوق [واو مجہول، ب مفتوح، واو معروف]

اب تو آتشیں اسلحے نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ جدید سے جدید ہتھیار پر بھی نہایت قلیل مدت میں قدامت کا زنگ چڑھنے لگتا ہے۔ پُرانے زمانے میں خودکار آتشیں اسلحہ نہ ہوتے تھے۔ بندوقیں توڑے دار ہوتی تھیں۔ اس کو چلانے کے لیے پہلے بھرا جاتا تھا پھر ایک فلیتے کے ذریعے، فلیتے کو سُلگا کر اسے چلاتے تھے۔ اس عمل سے بعض الفاظ اور محاورے زبان اور ادب میں راہ پا گئے ہیں۔ مثلاً:

بندوق کا توڑا بُجھا ہُوا ہونا

اس کے معنی تھے بندوق کا بروقت نہ چل سکنا۔ اگر کوئی کام بروقت اور توقع کے مطابق نہ ہو اس وقت بھی اس محاورے سے کام لیتے تھے۔ بعض دفعہ نمی کی وجہ سے یا عدم احتیاط اور بے تدبیری کے سبب توڑے دار بندوق کا فلیتہ سیل جاتا تھا، ایسی حالت میں اچھی طرح سُلگتا نہ تھا، بعض دفعہ کسی اور سبب بجھ جاتا تھا تو بندوق چل نہیں سکتی تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں ذوقؔ کے اس شعر کی تشریح کے سلسلے میں یہ معلومات درج کی ہے:

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا مرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

تیتَر کے مُنْھ لَچھمی [یائے معروف، ت مفتوح، م مضموم، ل مفتوح]

چوروں اور ٹھگوں کی اپنی مصطلحات ہوتی تھیں جنھیں ان کے گروہ اور قبیلے سے باہر کے لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اسی طرح ان کے ہاں مختلف توہمات بھی رائج تھے۔ جس وقت وہ ڈاکہ زنی اور بٹ ماری کے لیے نکلتے تھے تو مختلف چیزوں اور اشاروں سے مختلف شگون لیتے تھے۔ ایسے وقت میں اگر تیتر کی آواز دائیں طرف سے سنائی دیتی تھی تو اسے

نیک شگون سمجھا جاتا تھا اور مال ہاتھ لگنے کی توقع ہوتی تھی۔ پچھمی ہندو علم الاصنام میں ثروت اور دولت کی دیوی ہے۔ اس لیے مراد یہ ہوئی کہ تیتر کے منھ سے آواز سننے پر مال و دولت کی دیوی کی برکت حاصل ہو جاتی ہے اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اس کا استعمال ایک اور موقعے پر ہونے لگا۔ جس وقت کسی نااہل آدمی کے ذمے ایسے کاموں کا فیصلہ ڈال دیا جائے جو اس کی بساط سے باہر ہوں تو اس وقت بھی یہ محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ تیتر جیسے حقیر و مشتِ پر جانور کے منھ پر دولت کے حصول کا انحصار ہو۔

☆......☆

حواشی:

۱۔ قادری صاحب نے "ت" پر واضح زبر لکھا ہے لیکن درست زیر ہے۔ ملاحظہ ہو: پلیٹس۔

۲۔ طپش کی کتاب کا درست نام "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" ہے، اگرچہ اس کا نام بالعموم "ال" کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے، جیسا کہ قسط سات (۷) کے حواشی میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

☆......☆

(۱۱)

اردو میں پاکستان کی علاقائی[۱] زبانوں کے بہت سے الفاظ اور محاورے رائج ہیں۔ سرائیکی، بلوچی، افغانی، ہندکو، پنجابی، سندھی، پشتو غرض مشکل سے کوئی ایسی زبان شمال مغربی برصغیر کی ہوگی جس کے الفاظ، محاورات اور تلمیحات اردو نے نہ اپنائے ہوں۔

اسلامی عہد میں ان علاقوں سے قبیلوں اور خاندانوں کی نقلِ مکانی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ خاص علاقوں کے لوگ میدانی علاقوں میں داخل ہو کر مخصوص مقامات پر مقیم ہو گئے اور وہاں نئی بستیاں قائم کیں۔ بعض آگے چل کر نظم و نسق اور تحصیل وصول میں خودمختار ہو گئیں اور ریاستیں کہلانے لگیں یا بعض کو تعلقہ کہا جاتا تھا۔

پشاور اور سرحد کے علاقوں سے بعض خاندان اور قبائل روہیل کھنڈ کے علاقوں میں جا کر بس گئے۔ رام پور، شاہجہاں پور، فرخ آباد، قائم گنج اور اسی طرح کی بہت سی بستیاں پٹھانوں کی قائم کردہ ہیں اور وہ قدیم خاندان آج تک موجود ہیں۔

ان نو آبادیوں میں ابتدا میں پشتو بولی جاتی تھی اور [آج سے] کچھ عرصے قبل تک بڑے بوڑھے، عورتیں اور مرد پشتو بخوبی جانتے تھے۔ نژادِ نو شاید بولنے پر تو قادر نہیں لیکن ان کی اردو میں پشتو کے الفاظ، محاورے، تلمیحات اور ضرب الامثال موجود ہیں۔ بعض سکۂ رائج الوقت بن کر نواحی علاقوں کی اردو میں بھی سمو گئے ہیں اور بعض مقامی طور پر ہی بولے جاتے ہیں۔

اردو کا جو لب و لہجہ روہیل کھنڈی اردو کہلاتا ہے۔ اس میں پشتو کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

مشہور عالم و زباں داں مولانا امتیاز علی صاحب۔ عرشی رام پوری کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ خود ان کا خاندان کئی صدی پیشتر پشاور، سرحد، سے [۲] روہیل کھنڈ اور رام پور منتقل ہوا تھا۔ انھوں نے اُردو میں پشتو کے اثرات پر مفید کتاب تالیف کی ہے جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔

آج کے مضمون میں ان کی اسی کتاب سے کچھ تلخیص التقاط کر کے پیش کی جاتی ہے:

رائے خورے

رام پور میں ہی نہیں غالباً بھوپال، ٹونک، جاورہ اور تمام افغانی آبادیوں میں دستور ہے کہ کسی کے گھر میں بیٹا پیدا ہو تو زچہ اور بچہ کے کام سے نپٹ کر خاندان کی عورتیں صحن میں، اگر گھر میں بالا خانہ نہ ہو، ورنہ کوٹھے پر چڑھ کر ''رائے خورے'' پکارتی ہیں اور اس کے بعد خاندان اور پڑوس میں مٹھائی بانٹتی ہیں۔

یہ رسم بھی افغانستان سے آئی ہے، اس کے آغاز کا قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا بدلہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ ایک حاملہ بیوی اور ایک بیوہ بہن۔ دو عورتیں گھر بھر میں تھیں۔ بہن دعائیں مانگتی تھی کہ بیٹا پیدا ہو جو بڑھ کر باپ کا انتقام لے۔ اتفاق سے بیٹا ہی پیدا ہوا۔ بچے کی پھوپھی فرطِ خوشی سے مکان کی چھت پر چڑھ گئی اور آس پاس کی عورتوں کو بلند آواز سے پکارنے لگی: ژازہ خورِے داغے زُوی۔ یعنی بہنو! آؤ بیٹا آیا۔ ہندوستان آ کر الفاظ بدل گئے مگر روح اتنی خوش آئند تھی کہ پٹھانوں کی دیکھا دیکھی دوسری مسلمان قوموں نے بھی اس رسم کو اپنا لیا۔ اب روہیل کھنڈ میں یہ تمام مسلمانوں کی قومی رسم شمار ہوتی ہے۔ [عرشی]

حَد زِیات [ح مفتوح، ز مکسور]

افغانستان اور دوآبے کی پٹھان بستیوں اور بالخصوص روہیل کھنڈ میں جب کسی چیز کی تعداد یا مقدار کا اندازہ معین کرنا ہو تو جہاں دوسرے علاقوں میں کہتے ہیں زیادہ سے

زیادہ، وہاں لوگ کہتے ہیں حدزیات۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ حدزیات پندرہ بیس آدمی ہوں گے۔

عرشی صاحب کا قول ہے کہ دکن میں اسی کو حدزیاست بنالیا ہے۔

غُٹہ/غوٹہ [غ مضموم/ واو مجہول]

پشتو کا ایک لفظ غوٹہ بہ واوِ مجہول کھوٹا کے وزن پر، اس کے معنی ہیں بے ہوش۔ مستوراتِ رام پور نے اسے مخفف کر کے غُٹہ بنالیا ہے اور مرض کی سختی سے کوئی بے ہوش ہو جائے تو کہا جاتا ہے۔ غُٹہ پڑ گیا۔ [عرشی]

تور [واوِ مجہول]

روہیل کھنڈی اردو میں تور اسمِ مذکر ہے۔ بہ واوِ مجہول بروزن گور بمعنی قبر۔ اصل لفظ پشتو کا ہے اور اس کے معنی ہیں اندھیرا، خوف، دہشت اور بہتان کے معنی بھی دیتا ہے۔

روہیل کھنڈ میں خوف اور بہتان کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ''خدا آندھی کے زور اور حاکم کے تور سے بچائے۔ عورتیں خفگی میں کہا کرتی ہیں: ''یا اللہ میں کس تور میں پکڑی گئی ہوں۔''

پٹھانوں میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے دب کر صلح کرے تو ایک دو اپنی لڑکیاں بھی غالب اور زورآور خاندان میں بیاہتا ہے۔ اس قاعدے کو لڑکی تور میں دینا کہتے ہیں۔ ساس بہو کی لڑائی میں بہو کی زبان سے یہ جملہ سننے میں آتا ہے:

''کیا میں تور میں آئی ہوں جو تم سے دن رات جوتیاں کھاؤں'' [عرشی]

ڈَڈّہ [ڈ مفتوح، ڈ مفتوح بتشدید]

روہیل کھنڈی اردو میں ڈڈہ اسم اور مذکر ہے۔ اس کے معنی سہارا، پشتہ، تکیہ، دستہ وغیرہ ہیں۔

''ڈَڈّہ پشتو میں پہلو اور ڈڈہ لگول ایک پہلو پر لیٹ جانا ہے۔ رام پور میں اتنا عام

ہے کہ عالم، جاہل اور مرد عورت سب دن رات بولتے ہیں۔ روہیل کھنڈ کے دوسرے مقامات پر بھی حتیٰ کہ دیہات میں لوگ ڈ ڈّہ لگالو یا کرسی یا مسہری کا ڈ ڈّہ کہا کرتے ہیں۔" [عرشی]

☆.....☆

حواشی

۱۔ ان زبانوں کو علاقائی یا صوبائی کے بجے پاکستانی زبانیں کہنا چاہیے۔

۲۔ اب اس صوبے کا نام سرحد کے بجائے خیبر پختون خوا ہے۔

☆.....☆

(۱۴)

اُتّو [الف مضموم، ت مشدد، واو معروف]

اردو میں عام طور پر بولتے ہیں مار مار کے اُتّو بنا دیا۔ یہ اُتّو کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے اور اردو میں کس کس طرح استعمال ہوتا ہے؟

پلیٹس (Platts) نے خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرت کا لفظ ہے۔ (وِرت۔ اس کی اصل بتائی ہے) صاحبِ نوراللغات نے اس کو فارسی سمجھا ہے۔

اسٹین گاس (Steingass) نے اپنی فارسی اور انگریزی لغت میں اسے ہندی قرار دیا ہے مگر ہماری رائے میں یہ عربی الاصل لفظ ہے۔ یعنی طَوَی، یطوِی، اِطو یعنی کپڑا لپیٹنا، تہہ کرنا۔

اردو میں اتّو کے یہی معنی ہیں۔ کپڑے میں لپیٹ کر، تہہ کر کے نقش و نگار ڈالنا۔ یہ تو اس لفظ کے ماخذات تھے۔ اردو میں یہ کثیر المعنی لفظ ہے۔ عربی میں ط سے تھا اردو میں ط کو آسان حرف ت سے بدل دیا۔ صوتیات کو بھی اردو کے مطابق ڈھال دیا۔ ت پر زیادہ تر پیش بولا جاتا ہے لیکن کم تر بغیر پیش کے بھی ملتا ہے۔ اسی طرح ت مشدّد ہے لیکن بعض مقامات پر بغیر تشدید کے بھی یہ لفظ دیکھا گیا ہے۔ اس طرح عربی اِطو سے اردو میں اتّو بن گیا۔ اس کو سنسکرت یا فارسی یا پراکرت کی کسی بولی سے ماخوذ سمجھنا شبہے سے خالی نہیں۔

اردو میں اور بہت سے معنوں کے علاوہ مندرجہ ذیل توجہ کے لائق ہیں:

اُس آلۂ آہنی کو کہتے ہیں جس سے کپڑے کو مٹکے پر دبا کر نقش و نگار بناتے ہیں، مگر اصطلاح میں اُن نقوش کو کہتے ہیں جو اس طرح بنائے

جاتے ہیں۔(نوراللغات)

۲۔ چُننا اور شکنیں ڈالنا۔مثلاً انگر کھے پر اُتو کردو۔

۳۔ اُتو کرنا۔مار مار کے اُتو بنانا = اتنا مارنا کہ جسم پر نشان پڑ جائیں۔
ادھ مُوا کر دینا۔داغؔ کا شعر ہے:

اتنے کوڑے دل پہ مارے زلف نے
ہائے بیچارے کو اُتو کر دیا

(نوراللغات)

۴۔ اُتو کرتے ہوئے چلنا: پاؤں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے ایسے چلنا کہ نشان بن جائیں۔جس شخص کے پاؤں میں لنگ ہو اس پر بطور پھبتی کے کہتے ہیں:

ملا ہے ہم کو نامہ بر بھی ایسا
کہ اُتو کرتا چلتا ہے زمیں پر (داغؔ)

اس شعر کے ذیل میں مولوی نورالحسن صاحب نیر،صاحبِ نوراللغات نے لکھا ہے:(ظرافت سے) اُچھلتے چلنے کی جگہ [استعمال ہوتا ہے]۔مگر یہ بات درست نہیں۔ظرافت نہیں طنز۔

۵۔ اُتو کردینا = بے وقوف بنانا۔بدحواس کر دینا۔پریشان کر دینا۔

۶۔ اُتو کش۔اُتو گر = کپڑے پر بیل بُوٹے بنانے والا۔

۷۔ اُتو ہو جانا = نشے میں دُھت ہو جانا۔

فارسی میں اُتو بغیر تشدید کے بھی دیکھا گیا ہے۔

بغیر من کہ بتن نقشِ بوریا دارم
اتو کشیدہ کہ دارد قبائے عریانی (اشرفؔ)

(مشدد):

جامہ ہر چند اتو بیشتر زیبا تر است (صائبؔ)

نِکَسنا [ن بکسور، ک مفتوح]

بعض الفاظ پاکستان کی مختلف زبانوں میں یکساں طور پر ملتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک زبان میں ایک طرح اور دوسری طرح ہیں۔ اس لیے لفظ کے بارے میں حتمی طور پر حکم لگانا کہ یہ محض فلاں زبان کا لفظ ہے خاصا غیر محتاط کام ہے۔ جس طرح افراد نقلِ مکانی کرتے ہیں اسی طرح الفاظ بھی نقلِ مکانی کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح قبائل اور خاندان ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر بس جاتے ہیں، لیکن وہاں کے پابندِ محض نہیں ہوتے اسی طرح الفاظ بھی پورے علاقے میں پھیل جاتے ہیں۔ الفاظ کا نفوذ واثر افراد سے زیادہ دُوررس بھی ہوتا ہے اور دیر پا بھی۔

قدیم اردو کا ایک فعل ہے نکسن۔ نکسنا فعلِ لازم ہے اور نِکسانا فعل متعدی۔ پشاور اور اس کے نواحی علاقوں میں مستعمل تھا۔ ہند کو بھی ہوسکتا ہے۔

پلیٹس (Platts) نے اس کو سنسکرت قرار دے کر اس کا مادّہ (نِک + سَک) قرار دیا ہے اور سنسکرت لفظِ نِش ک سَ (تِی) اور اس سے پراکرت میں دخیل لفظ نِکّ س (ئی) بتایا ہے۔ اول تو پراکرت کی اصطلاح خود بہت مبہم ہے، دوسرے یہ تمام قیاس آرائی محض سنسکرت نوازی پر مبنی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک درست نہیں۔ پلیٹس نے نِکسنا فعلِ لازم سے اس کا فعلِ متعدی نکاسنا قرار دیا ہے۔ یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا بلکہ فعل متعدی نکسانا ہے۔

نِکسنا کے معنی ہیں نکلنا، چلنا، جاری ہونا، باہر آنا۔

دورِ اوّل کے ایک شاعر ہیں محمد احسنؔ، ان کا شعر ہے

ترے تل سوں مجھے نت سودا کا مینھ ہے اے ظالم
عجب نہیں ہے اگر تو تیل نِکساوے مرے سر سوں

محمد حسین آزادؔ نے ''آبِ حیات'' میں لکھا ہے:

"میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا:

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اُپا ہے گا ہے
اے فلک بہرِ خدا رخصت۔ آ ہے گا ہے

مرزا [رفیع سودا] سن کر بولے میر صاحب بچپن میں ہمارے پشور [پشاور] کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا۔ بے چارے میر سوز ہنس کر چپکے ہو رہے "

سِر ہونا [س مکسور]

اردو کا محاورہ ہے سر ہونا (سین کے زیر سے) یعنی کسی بات کے پیچھے پڑ جانا یا کسی شخص کے پیچھے پڑ جانا۔

غالب نے ایک جگہ سر ہونا (سین کے زبر سے) لکھا ہے۔ شعر اور غزل دونوں بہت مشہور ہیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غالب کے اولین شارح اور عالم بے بدل مولانا نظم طباطبائی نے اپنی مشہور شرحِ دیوانِ غالب مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۸ھ میں اس شعر کے ذیل میں لکھا ہے۔

"یہ محاورہ ہے کہ ہم اس بات کے سَر ہوگئے یعنی سمجھ گئے۔ یعنی جب تک تری زلف میرے حال سے باخبر ہو میرا کام تمام ہو جائے گا۔"

اس شعر کی شرح پر میرے والد صاحب قبلہ جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری کے قلم کا مندرجہ ذیل حاشیہ درج ہے

"یہ کہاں کا محاورہ نکالا؟ ہم اس بات کے سر ہوگئے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ در پے ہوگئے، کر کے چھوڑا، سمجھنے کی قید نہیں۔ سمجھنا تو سر ہونے کا نتیجہ ہے اور وہ جب تک شعر میں بیان نہ کیا جائے

کیوں کر متعین ہو۔"

مثلاً مرزا داغؔ دہلوی فرماتے ہیں:

دیکھتے ہی شکل رازِ دل سے ماہر ہو گئے
پھر نہ وہ ٹالے ٹلے جس بات کے سر ہو گئے

دوسرے اس محاورے میں (سِر) زیر کے ساتھ ہے اور غالبؔ نے زبر سے لکھا ہے۔ اصل میں غالبؔ نے (زلف کا سَر ہونا) ایسا عجیب محاورہ لکھا ہے جس کی کوئی مثال عجم و ہند کے شعرائے فارسی و اردو کے کلام میں نہیں ملتی اور وہ مطلب بتانا جو شارح (نظم طباطبائی) نے بتایا ہے غلط ہے۔ زلف کے سَر ہونے کے معنی غالبؔ نے زلف کے کھلنے کے لیے ہیں یعنی زلفوں کا بکھرنا، پریشان ہونا اور یہ نتیجہ ہوگا آہ کے اثر کا لیکن ایسے اثر کے لیے ایک عمر چاہیے، اس وقت تک کون جیتا ہے۔"

[حامد حسن قادری۔ ۲۴، فروری ۱۹۴۰ء، آگرہ]

اس غزل کے سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ دیوانِ غالبؔ کے اکثر و بیشتر نسخوں میں ردیف اسی طرح سے ملتی ہے یعنی ہونے تک۔ یہی جدید محاورہ بھی ہے اور اسی طرح زبان زدِ عام ہے لیکن غالبؔ نے خود ہونے تک نہیں لکھا تھا۔ غالبؔ نے لکھا تھا "ہوتے تک"۔ دیوانِ غالبؔ کا جو نسخہ ان کے سامنے ۱۸۶۳ء میں چھپا تھا اور جس پر لکھا ہے:

"مطبعِ مفیدِ خلائق آگرہ میں اہتمام سے منشی شیونراین کے چھپا۔"

اس نسخے میں صفحہ ۶۳ پر یہ پوری غزل موجود ہے اور تمام غزل میں ردیف ہوتے تک ہے یعنی:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

☆……☆

(۱۳)

پیرِ مُغاں / بانوانِ مُغاں شیوہ [یاے معروف، کسرۂ اضافت، رِ م مضموم/کسرۂ توصیفی ن، یاے مجہول]

پیرِ مغاں کی ترکیب شاعری میں بہت عام ہے۔شراب خانے کے مالک کو کہتے ہیں۔اسی سے مُغ بچہ وغیرہ بھی اخذ کیے گئے ہیں۔غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اس کی دلچسپ تشریح کی ہے۔یہ خط سید آفاق حسین صاحب آفاقؔی کے مرتب کردہ نادراتِ غالب میں شامل ہے۔

غالبؔ نے لکھا ہے:

''بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف نون جمع کا ہے یعنی بیبیاں۔ ''مغاں شیوہ'' وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبیں کی ترکیب ہے یعنی وہ شخص کہ جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں کا سا ہے۔

مغ آتش کدہ کا کارفرما اور چونکہ بادشاہانِ پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کی عمائد و اکابر و اشراف و علما کو دیتے تھے اور شراب کو چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے۔یہ بھی مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں اس کو بقدرِ مناسب دیں۔بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، عالم فاضل، طرح دار، بذلہ گو، حریف ظریف ہوا کرتے تھے۔اس راہ

سے پارسیوں نے مغاں شیوہ مدح معشوقوں کی ٹھیرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیاں اور طرح دار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے اور اس کی نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔ قصہ مختصر۔ مغاں شیوہ اُس محبوب کو کہتے ہیں جو بہت گرم اور خوش اور شیریں حرکات اور چالاک ہو۔

مغاں شیوہ بانواں، مغاں شیوہ دلبراں، مغاں شیوہ شاہداں، خواہی بہ جمع خواہی بہ انفراد ترکیبِ مقلوب ہے یعنی بانوے مغاں شیوہ یا بانوانِ مغاں شیوہ۔ قس علیٰ ہذا اور الفاظ۔ مدح جنابِ سید الشہد امیں قطعہ ہے:

معذوری ارز حادثہ رنجی ازاں کہ نیست
از نازکی بہ طبع گوارا گریستن
مسکین نہ دیدۂ زمغاں شیوہ بانواں
در خواب گاہِ بہمن و دارا گریستن

حاصلِ معنی یہ کہ شاعر اپنے نفس کو یا کسو اور کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تو معاف ہے اگر وقائع وحوادثِ دہر سے آزردہ ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ تو بہت نازک ہے اور گریہ وزاری کی شدت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ بیاں بہ سبیل طعنہ وتعریض واقع ہے جیسا کہ دوسری بیت میں کہتا ہے کہ اے شخص تو نے خواب گاہِ بہمن و دارا میں پری زاد و نازک و مغاں شیوہ بیگمات کو روتے پیٹتے نہیں دیکھا کہ کیسے بادشاہانِ جلیل القدر کی بیبیاں تھیں اور کیسی طرح دار کہ جیسے مغ ہوتے ہیں اور پھران

پر کیسی مصیبتیں گزریں۔ ظاہرا تو نے یہ قصہ کتبِ تواریخ میں نہیں دیکھا اور وجہ بہمن و دارا کے نامِ خاص کی یہ ہے کہ بہمن ابنِ اسفندیار کو آغازِ شباب میں اژدہا نگل گیا ہے۔ اور دارا ابنِ داراب ابنِ بہمن عین جوانی میں سکندر کی لڑائی میں اپنے دو مصاحبوں کے ساتھ مارا گیا۔"

باندھنوٗ [نون غنہ، واو معروف]

الزام اور بہتان کے معنی میں اردو کا ایک قدیم لفظ ہے باندھنو، واوِ معروف کے ساتھ۔ اس لفظ کے اور بھی معنی ہیں:

۱۔ اختراع، افترا، بہتان، تہمت، الزام۔

۲۔ کپڑے رنگنے کا ایک طریقہ جس میں رنگ ریز جگہ جگہ کپڑے کی دھجیاں کس کر باندھ دیتا ہے۔ اس طرح اس جگہ رنگ نہیں چڑھتا اور پھر دوسرا رنگ وہاں رنگا جاسکتا ہے۔

۳۔ ایک قسم کا رنگین پھول دار ریشم۔

باندھنو باندھنا

اسی لفظ سے محاورہ نکلا ہے باندھنو باندھنا یعنی الزام لگانا، تہمت دھرنا، مفت میں بدنام کرنا۔ میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

گئے بہتوں کے سر لڑکوں نے جو یہ باندھنوں باندھے
شہید اک میں نہیں ان باندھوؤں کے سرخ چیروں کا

چیرا (چی را) چھوٹی پگڑی کو بھی کہتے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "سیرِ کوہسار" کی جلد اوّل میں لکھا ہے:

"قمرن: نہیں سانولا سانولا ہے مگر بہت نمکین ہے۔

مغلانی: تو اب بڑا خیال یہ ہے کہ لوگ باندھنو باندھیں گے۔"

خُمرا/خُمرہ[1] [خ مضموم]

خُمرہ ایک چھوٹا سا ڈھول ہوتا ہے جو فقیر گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔ یہ لفظ دونوں طرح سے ہے خمرہ اور خُمرا۔ [کذا][2]

عربی میں خمرۃ [خ اور ر پر زبر] خمیر کرنے کے برتن اور کھجور کی چٹائی کو کہتے ہیں۔

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے مخزن لاہور جنوری ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں ایک مضمون لکھا تھا۔ شہر دلّی کے دریوزہ گر فقیر۔ اس میں لکھتے ہیں:

> "دلّی کے گداگر فرقوں میں سے ایک قوم کا نام خمرہ ہے۔ خمروں کا بڑا جتھا ہے۔ شہر سے باہر صدر، تیلی واڑہ، سبزی منڈی اور پرانی عیدگاہ میں آبادی کے کناروں پر رہتے ہیں۔ خمریاں روزانہ بھیک مانگنے کے علاوہ محرم کے عشرے میں چار چار، پانچ پانچ اکٹھی ہوکر شہر میں آتی ہیں اور نوحہ اور مرثیہ پڑھ پڑھ کر بہت کچھ لے جاتی ہیں۔ دریوزہ گری کے سوا یہ قوم نواڑ بُنتی ہے (چٹائیاں بناتی ہے) ڈگڈگیاں اور جُھن جُھنے بناتی ہے۔"

مولوی محمد ناصر علی صاحب غیاث پوری نے ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے اربع عناصر شائع کی تھی۔ اس میں یہ حوالہ درج ہے:

خمرا: بوریاباف۔

ٹیپ [یائے معروف]

(ٹی پ) اردو کا خاص لفظ ہے۔ متعدد معنی کے علاوہ مندرجہ ذیل معنی خاص ہیں:

۱۔ چِپت

۲۔ رسید، تمسّک

۳۔ ماتھے پر پہننے کا ایک زیور

۴۔ گنجفے میں حریف کے ایک پتے کو دو پتوں سے لینا۔

ٹیپ کے لفظ سے کچھ محاورے بھی نکلے ہیں:

ٹیپ بھرنا : عمارت کی اینٹوں میں جو درازیں رہ جاتی ہیں ان میں مسالہ بھر کر مسطح اور خوش نما کرنا۔

ٹیپ ٹاپ : اوپری دکھاوٹ، سجاوٹ، آرائش۔

ٹیپ کا : عمدہ، اعلیٰ درجے کا۔

جو مصرع، شعر یا بند بار بار دُہرایا جاتا ہو اسے بھی ٹیپ کا کہتے ہیں۔[۳]

☆......☆

حواشی

۱۔ قادری صاحب نے صرف ''خُمرہ'' کی سرخی لگائی تھی۔ ہم نے وضاحت کی خاطر دونوں لفظ لکھ دیے ہیں کیونکہ اس میں کچھ غلط مبحث بھی ہے۔

۲۔ خمرا/خمرہ: قادری صاحب کی یہ بات بحث طلب ہے کہ خُمرہ اور خُمرا دونوں طرح سے ہے۔ بظاہر دونوں الگ الگ لفظ ہیں۔ پلیٹس کے مطابق خُمرا (آخر میں الف) مقامی لفظ ہے۔ یہ چٹائی بُننے والوں کی ایک ذات ہے اور چٹائی بُننے والے کو بھی کہتے ہیں۔ پلیٹس نے خمرہ (آخر میں ہائے مختفی) کو فارسی لفظ قرار دیا ہے اور معنی لکھے ہیں چھوٹا برتن، چھوٹا ڈھول وغیرہ۔ فرہنگِ آصفیہ کے مطابق خ مضموم ہے اور یہ مسلمان فقیر ہوا کرتے تھے جو اپنی نسبت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام قُنبر سے جوڑتے تھے اور یہ قُنبر سے قُنبرا ہوا اور بگڑ کر خمرا ہو گیا۔ ساتھ ہی لکھا ہے ''واللہ اعلم''۔ فیلن نے کم و بیش یہی بات لکھی ہے مگر اس نے قُنبر (ق مضموم) کی بجائے قَنبر (ق مفتوح) لکھا ہے۔ بہر حال اس کی اصل مشکوک کی ہی ٹھہرے گی۔

۳۔ ٹیپ/ٹیپ کا مصرع: درحقیقت ٹیپ کے ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ ہیں: گاتے ہوئے آواز کو بلند کرنے کا عمل۔ اسی سے ''ٹیپ کا مصرع'' کی اصطلاح نکلی ہے۔

☆......☆

(۱۴)

شگون لینا، فال نکالنا، استخارہ دیکھنا اور اس طرح کے بہت سے کام انسانی سرشت وقریحت[1] کے ایک خاص رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ رجحان انسانی طینت ومزاج کے بنیادی عناصر میں شامل ہے اور کسی خاص گروہ یا قبیلے یا ملک و مذہب سے واسطہ نہیں رکھتا۔ مزاج کی کیفیت کا اظہار افعال سے اور پھر فعل کی وضاحت قول سے ہوتی ہے اور یوں ہر زبان میں لاتعداد الفاظ اس طرح کے شامل اور داخل ہو جاتے ہیں جن سے مروجہ اوہام ورسومات کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً کسی خاص وقت چاند دیکھنا یا بلّی کا راستہ کاٹ جانا، آنکھ پھڑکنا، ہتھیلی میں کھجلی ہونا۔ غرض ان کا حصر وشمار مشکل ودشوار ہے۔

نظرِ بد لگنے کو عین الکمال بھی کہتے ہیں اور نظر لگنے کی یا اس سے بچنے اور محفوظ رہنے اور رکھنے کی تدبیریں مختلف علاقوں، زبانوں اور قوموں میں مختلف ہیں۔ اردو کے محاوروں میں اس کا ذکر بہت ہے۔

مرزا جان طپش صاحبِ ''مصطلحاتِ ہندوستان'' نے لکھا ہے:

ایڑی دیکھو [یائے مجہول]

بیائے مجہولِ ورائے ہندی و بیائے معروف رسیدہ درمحلِ دفعیۂ نظرِ بد گویند [یعنی نظرِ بد کو دفع کرنے کے محل پر کہتے ہیں]۔

قلندر بخش جرأت راست رباعی:

کل رنگِ حنا سے سرخ کر پانو کو
بیٹھا تھا چمن میں جو وہ سروِ دل جو

جیوں میں نے کہا کہ ہے کفِ یار پہ یہ بہار
ہنس کر لگا کہنے اپنی ایڑی دیکھو

جَو نُما گندُم فروش [واولین، ن مضموم]

جونما گندم فروش تو عام محاورہ ہے یعنی کہتا کچھ ہو، کرتا کچھ ہو، باطن اور ظاہر میں تباین ہو۔ دیکھنے میں نیک پارسا مخلص، لیکن حقیقت اس کے برعکس۔ اس طرح کے افراد ہم سب کے تجربے اور علم میں ہیں۔ کیا عجب کہ دوسرے لوگ خود ہمیں بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں۔

بہر حال مرزا جان طپش نے ایک محاورہ درج کیا ہے:

آب زیرِ کاہ [یائے مجہول، کسرۂ اضافت ر]

یعنی پانی ہو لیکن گڑھا اور پانی نظر نہ آئے۔ صرف گھاس دکھائی دے۔ آب زیرِ کاہ یعنی گھاس کے نیچے پانی۔ چلنے والا سمجھے کہ صاف اور مُسطّح گھاس ہے اور پاؤں رکھتے ہی پانی کیچڑ اور گڑھے میں جا پڑے۔

طپش اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

کنایہ کسے است کہ خود را بظاہر نیک وانماید و در باطن نہ چناں باشد

(ترجمہ) اس شخص سے کنایہ ہے کہ جو اپنے آپ کو بظاہر نیک دکھاتا ہو لیکن باطن میں ایسا نہ ہو۔

پھر سند میں انھوں نے مرزا حسن کا یہ شعر درج کیا ہے:

بچ نکلیو لختِ دل تیرے خدا ہمراہ ہے
اشکِ مژگاں کے تلے کا آب زیرِ کاہ ہے

پھر مزید لکھا ہے:

از شعرِ مولانا ظہوری محقق شد کہ ایں اصطلاح فارسی الاصل ست۔

ظہوری گوید: رباعی

کو دادگرے چوں تو کہ شاہش گویند
در سایہ وری ظلِ الٰہش گویند
مگذارد آب کاہ را در زیرش
زیں ہم کہ آب زیرِ کاہش گویند

آنکھوں میں آنی [واو مجہول]

شراب پینے کے بعد مختلف کیفیات نفس وجسم انسانی پر طاری ہوتی ہیں۔ نشے کا اثر آنکھوں سے بیشتر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مخمور آنکھیں اسی لیے کہتے ہیں۔ مرزا جان طپش لکھتے ہیں:

کنایہ از آمدِ سکر اگر چہ عموماً بر کُل مسکر اطلاق دارد لاکن بیشتر بر شراب مستعمل

ترجمہ: کنایہ ہے نشہ آنے سے۔ اگر چہ ہر قسم کے نشے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن زیادہ تر شراب کے نشے کے لیے (اس محاورے کا) استعمال کرتے ہیں۔

پھر سند میں اپنا یہ شعر درج کیا ہے:

دعوئ مے خواری اتنے ہی پہ تھا سرکار کو
پیتے ہی اک آدھ گھونٹ آنکھوں میں بس آنے لگی

آگ لینے کو آئے تھے

پہلے آگ جلانے کی اتنی سہولتیں نہ تھیں جتنی اب ہیں، لکڑیاں جلتی تھیں یا اُپلے سلگتے تھے۔ اب بھی دیہاتوں [کذا] میں یہی ہوتا ہے۔ پھر راکھ کے ڈھیر کے نیچے جلتی ہوئی لکڑی یا سلگتے ہوئے اُپلوں کو دبا دیتے تھے۔ جن گھرانوں میں حقہ پینے والے بزرگ ہوتے ہیں وہاں تو ہر وقت آگ موجود رہنے کا انتظام حقے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ اسی

طرح یہ بھی رواج تھا کہ اگر اپنے گھر میں آگ موجود نہیں تو پڑوس سے مانگ لائے۔ دو چار سلگتے ہوئے کوئلے، انگارے یا اُپلے کا ٹکڑا۔ جو آگ مانگنے آتا تھا اس کے پاس وقت نہیں ہوتا [تھا] کہ باتیں بنائے یا وقت ضائع کرے۔ ادھر آگ لی اور اُدھر واپس اُلٹے پاؤں اسی لیے اگر کوئی بہت عجلت میں آئے گویا ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ ادھر آیا اُدھر گیا۔ تو کہتے ہیں کہ آگ لینے کو آئے تھے۔

مرزا جان طپش لکھتے ہیں:

''در محلے گویند کہ دوستے بدیدنِ دوستے آید و بے مکث وتوقف زُود مراجعت کند''

ترجمہ: اُس وقت (اس محاورے کو) بولتے ہیں جب کوئی دوست اپنے دوست کو دیکھنے آئے اور بغیر رُکے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے جلد واپس چلا جائے۔

پھر میر تقی میر کا یہ شعر لکھا ہے:

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا
آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا[۲]

اس کے بعد طپش نے لکھا ہے:

ازشعرِ سعیدائے اشرف مستفادمی شود کہ در اہلِ ولایت ہم ایں اصطلاح مستعمل است۔ اشرف گوید:

دل را ز سینہ آں بُتِ سرکش گرفت و رفت
در خانہ من آمد و آتش گرفت و رفت

''و اگر گویند کہ در شعر سعیدائے (اشرف) رعایتِ عجلت ظاہر نیست یا با صطلاح ہندی مطابقت باید گو ہم واوِ عطف کہ در گرفت و رفت واقع شدہ مفیدایں معنی است۔''

ترجمہ: اگر یہ کہا جائے کہ سعیدائے (اشرف) کے شعر میں جلدی اور عجلت کا کوئی

قرینہ ظاہر نہیں یا یہ کہ اسے اردو (ہندی) کی اصطلاح کے مطابق ہونا چاہیے تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) درگرفت ورفت کے درمیان جو ملانے والا واو (واوِعطف) موجود ہے وہ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔

اَٹکھیلیاں سُوجھنا [الف مفتوح، یائے مجہول، واو معروف]

عام محاورہ ہے اور انشا اللہ خاں انشا کے اس شعر کی وجہ سے عوام میں بھی خواص کی طرح معروف ہے:

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اَٹکھیلی سے چَلنا [الف مفتوح، یائے مجہول، چ مفتوح]

لیکن ایک محاورہ اور بھی ہے جو اتنا عام یا مقبول نہیں [وہ ہے] اٹکھیلی سے چلنا۔

مرزا جان طپش لکھتے ہیں:

بفتحِ اول وسکون تائے ہندی [ٹ] وکاف ہندی [کھ] بیائے مجہول رسیدہ ولام و بیائے معروف۔ کنایہ از خوبیٔ رفتارِ معشوق۔ مؤلف گوید:

اٹکھیلی سے عجب کج وا کج پڑے ہے پاؤں
پامال کیوں نہ ہم ہوں بھلا ایسی چال کے

اٹکھیلی سے چلنا محبوب کی چال کی خوبی ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس محاورے میں اٹکھیلے نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے اس کے تلفظ کی وضاحت میں طپش نے خاص طور پر یائے معروف لکھا ہے۔ کافِ ہندی سے مراد گ نہیں بلکہ کھ ہے۔

☆...☆

حواشی

۱۔ قریحت: فطرت؛ طبیعت کا فطری رجحان یا میلان۔

۲۔ دیہاتوں: اس کا استعمال عام ہے مگر دیہات کافی ہے کیونکہ یہ جمع ہے دیہہ کی۔ دیہات کے بعد ''وں'' لگا کر اس کی مزید جمع بنانا چنداں ضروری نہیں۔

۳۔ آگ لینے آئے تھے: یہ محاورہ ذوق نے بھی اپنے ایک شعر میں باندھا ہے۔ کہتے ہیں:

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

(ذوق، کلیات، ج ۱، ص ۳۰۷)

☆......☆

(۱۵)

سَروِ چراغاں [س مفتوح، کسرۂ اضافت ر]

لوہے یا لکڑی کا ایک خوبصورت جھاڑ بناتے تھے اور اس کو روشنیوں سے سجاتے تھے یہ مختلف موقعوں پر کام آتا تھا۔ شادی بیاہ میں جب برات کا جلوس نکلتا تھا تو آرائش کے دوسرے سامان کے ساتھ روشنیوں کا ایک جھاڑ بھی ساتھ ہوتا تھا۔ محرّم کے موقعے پر بھی اس طرح کے جھاڑ تیار کرتے تھے۔ ان پر روشنیاں مختلف ادوار میں مختلف نوعیت کی ہونے لگیں۔ پہلے صرف چراغ ہوتے تھے پھر قندیلیں بھی لٹکانے لگے۔ گیس کے ہنڈوں کا رواج ہونے کے بعد رنگین بتیوں کو گیس سے روشن کرنے لگے۔

اب بڑے شہروں میں فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ قدیم وضع کی براتیں اور شادی کے جلوس سینما کے پردۂ سمیں پر ہی نظر آتے ہیں البتہ قصبات و دیہات میں بعض مقامات پر یہ روایت زندہ و تابندہ ہے۔

اردو شاعری میں شعرا نے سروِ چراغاں سے بہت کام لیا ہے۔

مولوی نور الحسن صاحب نیّر نے نور اللغات میں اس کی تشریح اس طرح درج کی ہے:

> ''لکڑی کے ٹکڑوں سے سرو کی شکل بناتے ہیں اور اس کی شاخوں پر چراغ روشن کرتے ہیں۔''

کیا بیاں عالم زوالِ حُسنِ خوباں کا کروں
روشنی جاتی رہی سروِ چراغاں رہ گیا (آتشؔ)

پروفیسر مولانا نثار احمد صاحب فاروقی نے اپنی وقیع تالیف ''تلاشِ غالبؔ'' میں غالبؔ کے ایک ہم عصر درگا پرشاد نادر دہلوی (ولادت ۱۸۳۳ء) کی شرحِ غالبؔ پر ایک مضمون شائع کیا ہے۔اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ درگا پرشاد نادر دہلوی لکھتے ہیں:

''سروِ چراغاں ایک لوہے کا جھاڑ ہوتا ہے جس میں صدہا لوہے کے دیے بنے ہوتے ہیں جن میں تیل بتی ڈالتے ہیں:

دکھا دوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا (غالبؔ)

فرصت دی کے لفظ میں یہ خوبی ہے کہ سروِ چراغاں ہمیشہ روشن نہیں ہوتا صرف محرّم کے عشرے میں اس کی روشنی کا تماشا ہوا کرتا ہے اور یہ روزِ غمی کہلاتے ہیں۔اسی طرح ہمارا دل ماتم سرا کا سروِ چراغاں ہے۔ اگر ہمارا یار کسی موقعے پر دیکھنا چاہے گا تو دکھلا دیں گے۔''

سونا سوگند [واو مجہول، واو لین]

اسی مضمون میں جناب پروفیسر نثار احمد صاحب فاروقی نے درگا پرشاد نادر دہلوی کی ایک اور شرح دی ہے۔اس کا اقتباس یہ ہے:

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالبؔ

سونا سوگند ایک خالص قسم کا سونا ہے۔دوسرے معنی یہ کہ سونا قسم ہوگیا ہے۔مراد اوّل سے ہے کہ بیداری سے رنگ زرد ہوگیا ہے۔''

غالبؔ کے اس مصرعے میں سونا سوگند کے الفاظ [سے] یہ مفہوم لینا کہ بیداری

سے رنگ زرد ہو گیا ہے، مثل خالص سونے کے درست نہیں۔ یہ نادر دہلوی کا قیاس مع الفارق ہے۔ نیند نہ آنے سے رنگ زرد ہو گیا ہے زرِ خالص کی طرح غالب کے شعر کا مفہوم نہیں۔ صرف پہلا مفہوم ہی درست ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ قسم کھانے کو بھی نیند نہیں آتی۔ یہ بات کہ کسی خالص قسم کے سونے کو بھی سونا سوگند [کذا] کہتے ہیں محض امرِ اتفاقی ہے۔

Platts (پلیٹس) نے سونا سوگند کے تحت لکھا ہے:

خوشبو کی مانند عمدہ سونا[1]

زرِ خالص

عمدہ آدمی

اعلیٰ صلاحیتوں کا آدمی

سوہرائی [واوِ مجہول]

اس لفظ میں واو کا تلفظ واوِ مجہول سے ہے۔

سوہرائی بہار کے علاقے میں ایک دیہاتی تیوہار کا نام ہے جس میں عام طور سے گوالے حصّہ لیتے ہیں۔ یہ تیوہار کارتک مہینے کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد گائے کو خوش و خرم رکھنا ہے اور گائے کو خوش رکھنے کے لیے اسے رقص پر آمادہ کرتے ہیں۔ گائے رقص تو کیا کر پاتی ہے کچھ اُچھل کود کرتی ہے اور اس اُچھل کود کے لیے بھی بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ زیادہ تر تو وہ بھاگتی دوڑتی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی گائے کے بچے کے پاس سُور یا کوئی دوسرا جانور کھڑا کر دیتے ہیں اور گائے یہ سمجھ کر کہ وہ اس کے بچھڑے کے درپئے آزار ہے اس پر حملہ کرنے کو دوڑتی ہے۔ کبھی کالا کمبل کسی چیز پر لپیٹ کر اسے دوڑاتے ہیں۔ غرض گائے خوش ہوتی ہو، نہ ہوتی ہو، اس کا پلیتھن نکل جاتا ہے اور دیکھنے والے ضرور خوش ہوتے ہیں۔

کہاوت ہے: بوڑھ گائے سوہرائی کے سادھ۔ یعنی بوڑھی گائے کو بھی سوہرائی

کے ارمان باقی ہیں۔ اس کہاوت کواس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شخص طاقت و استطاعت اور موقع ومحل کے خلاف کام کرنا چاہے۔

سُوم [واؤِ معروف]

اردو کا عام لفظ ہے۔ عربی لفظ شوم کا مخرب ہے۔ شوم بھی مستعمل ہے، مفرد بھی اور مرکب بھی۔ مثلاً شوم بخت، یا شومیِ قسمت یا شوم بختی، بدنصیبی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ سوم کے بھی یہی معنی ہیں۔ لیکن اس کے معنی کنجوس اور حد سے زیادہ بخیل کے بھی ہیں۔ بخیلی اور حد سے بڑھی ہوئی کنجوسی بھی ایک نوع کا مرض اور ایک طرح کی بدبختی ہی سمجھنی چاہیے۔ غالبًا اسی وجہ سے سوم میں یہ معنی بھی شامل ہوگئے:

ایک کہاوت ہے:

سوم پوچھے سوم سے کاہے جیا ملین
گانٹھی کا کچھ گر گیا یا کاہو کو کچھ دین
گانٹھی کا کچھ گر گیا نہ کاہو کا کچھ دین
لیتے دیتے دیکھ لیا وا سے جیا ملین

یعنی ایک کنجوس نے دوسرے کنجوس سے پوچھا کیوں تمھارا دل ملول ہے۔ کیا گرہ سے کچھ گر گیا یا کسی کو کچھ دینا پڑ گیا۔ اس کنجوس نے جواب دیا کہ نہ تو میری گرہ سے کچھ گرا اور نہ مجھے کسی کو کچھ دینا پڑا مگر کوئی اور شخص کسی اور شخص کو کچھ دے رہا تھا۔ بس لیتے دیتے دیکھ لینے ہی سے میرا دل ملول ہوگیا۔

سَنکارنا [س مفتوح، نون غنہ]

قدیم اُردو کا لفظ ہے۔ اس کی اصل سنسکرت ہے۔ سنکار اسمِ مذکر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ معنی اس کے [ہیں] اشارہ، ایما، آنکھوں کا اشارہ، سر کی جنبش، اشارے سے بلانا۔ اسی سے سنکار دینا اور سنکارنا فعل ہیں۔ یعنی اشارہ کر دینا، پیچھے لگا دینا، شہہ دینا،

ہشکار دینا، ترغیب دینا وغیرہ۔

میر تقی میر کے ہاں کثرت سے ملتا ہے:

آج میرے خون پر اصرار ہے ہر دم تمھیں
آئے ہو کیا جانیے تم کس کے سنکارے ہوئے
(میر)

مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
غمزے ہیں بلا ان کو نہ سنکار دیا کر
(میر)

سَنمُکھ [س مفتوح، ن ساکن، م مضموم]

سنمکھ بھی قدیم اردو میں رائج تھا۔ خاص طور پر شاعری میں۔ یہ بھی سنسکرت کا لفظ ہے جو مقامی پراکرتوں کے ذریعے اردو میں داخل ہوا۔ اس کے معنی ہیں مدِ مقابل، سامنے، آمنے سامنے، مخالف۔[۲]

میر کا شعر ہے:

رکھا عرصہ جنوں پر تنگ مشتاقوں کی دوری سے
کسے مارا ہے اس گھتیے نے سنمکھ ہو کے میداں میں
(دیوان سوم)

مرزا احسن علی احسن مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں ان کا یہ شعر مع غزل کے درج کیا ہے:

کل جو اس شوخ سے سنمکھ ہو لڑائیں آنکھیں
برق نے ابر کی چادر میں چھپائیں آنکھیں

☆......☆

حواشی

۱۔ سونا سوگند/سُوگندھ: تعجب ہے کہ قادری صاحب جیسے فاضل آدمی نے یہ کیسے لکھ دیا کہ پلیٹس نے سونا سوگند کے تحت "خوشبو کی مانند عمدہ سونا" لکھا ہے۔ اول تو پلیٹس نے سونا سُوگندھ (یعنی آخر میں ھ) لکھا ہے سوگند نہیں۔ پھر سوگندھ کے اس نے جو ہجے رومن میں دیے ہیں (پلیٹس تحتی مرکبات اردو حروف میں نہیں دیتا) یعنی sugandh اس سے ظاہر ہے کہ وہ اسے واوِ معروف سے سُوگندھ لکھ رہا ہے۔ پلیٹس نے اس کے معنی sweet or pure as gold لکھے ہیں۔ سونا سوگندھ کے دیگر معنی اس نے یہ دیے ہیں: pure, spotless, innocent اور پھر لکھا ہے a man of high birth or great ability۔ جبکہ قَسَم کے معنی میں لفظ سوگند (saugand) ہے اور اس میں واوِ لین ہے، بغیر "ھ" کے۔ پلیٹس نے بھی قسم کے معنی میں رومن اور ناگری دونوں میں واوِ لین سے اس کا تلفظ ظاہر کیا ہے۔ سُوگندھ یعنی سُو+گندھ میں سُو اچھا یا عمدہ کے معنی میں ہے اور گندھ یعنی بُو۔ شاید اسی سے قادری صاحب کو التباس ہوا ہوگا۔ فیلن نے بھی سَوگند (saugand) (بواوِ لین) قسم یا حلف کے معنی میں دیا ہے اور سونا سُوگندھ میں فیلن نے آخر میں "ھ" بھی لکھی ہے اور واوِ معروف سے اس کا تلفظ کیا ہے اور فیلن نے سونا (gold) کے تحت میں sona sugandh دیا ہے، معنی دیے ہیں: خالص، سونے کی طرح خالص۔ یہ اس نے صفت کے تحت لکھا ہے۔ پھر اسے اسمِ مذکر کے طور پر درج کر کے اس نے معنی دیے ہیں: اعلیٰ نسل کا اور باصلاحیت آدمی۔

۲۔ سنمکھ: میر امن کی گنجِ خوبی میں بھی ایک شعر ہے جس میں لفظ سنمکھ استعمال ہوا ہے:

پلٹنیں اور توپیں جب سنمکھ ہوئیں
مرہٹے ہیبت کے مارے مُڑ گئے
(ص ۳)

☆……☆

(۱۶)

کم صلا [ک مفتوح،ص مفتوح]

خفیہ پیغام رسانی تاریخ انسانی میں مختلف اعتبارات سے کافی اہم مقام رکھتی ہے۔عہدِ جدید میں تو فوجی اور سیاسی لحاظ سے اسے اتنی ترقی حاصل ہوئی ہے کہ باضابطہ سائنس کا درجہ دیا جاتا ہے۔لیکن ہمیشہ سے اسے تخریبی سے زیادہ تفریحی کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

اردو کی بعض کتابوں میں ایک لفظ ملتا ہے کم صلا، اس کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ یہ خفیہ تحریر کا ایک اصول ہے جس کی تفصیل اس شعر میں مخفی ہے:

کم صلہ او حط لہ در سع
حرف منقوطش را بجایش دع

اس شعر کے حل میں وہ اصول مخفی ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ پہلے مصرعے کے الفاظ جن حروف پر مشتمل ہیں وہ بدل جاتے ہیں لیکن جو نقطہ دار حروف ہیں وہ نہیں بدلتے یعنی یہ حروف ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں:

ک م۔ص لا۔او۔ح ط۔ل ہ۔در۔س ع۔[گویا م کے بجائے ک لکھا جائے گا، لا کے بجائے ص، وعلیٰ ہٰذا القیاس]

اس اصول کے مطابق لفظ سلامت اس طرح لکھا جائے گا:

س : ع
لا : ص

م : ک

ت منقوط ہونے کے سبب ت ہی رہے گی یعنی سلامت کو عصکت لکھیں گے اور جو شخص اس اصول سے واقف ہے وہ صحیح لفظ نکال لے گا۔

یہ عمل تو خیر ظاہر ہے کہ زیادہ تر تفریحی نوعیت کا ہے ورنہ جدید علمِ خفیہ پیغام رسانی میں تو اگر کلیدی اصول خود خفیہ نہ رکھا جائے اور شائع و عام کر دیا جائے تو سارا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

علمِ تکسیر [یائے معروف]

اس طرح کے بہت سے علوم یا علوم کی شاخیں ہیں جن سے مختلف کام لیے جاتے رہے ہیں اور ایک کام وہی تعبیر و تفاول کا ہے جو فطرتِ انسانی کی کمزوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اسی طرح کے ایک علم کو علمِ تکسیر کہتے ہیں۔ اس علم کا ذکر ایک دلچسپ تاریخی کتاب میں ملتا ہے۔

حمید الدین خان عہدِ عالم گیری کے امرا میں شامل تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی کارنامے سرانجام دیے اور نیچۂ عالم گیری کا لقب پایا۔ اس نے بعض واقعات یادداشت کی صورت میں ترتیب دیے ہیں۔ کتاب کا نام ''احکامِ عالم گیری'' ہے۔ اس میں نمبر ۳۸ کے حاشیے پر درج ہے:

> ''در ایّامے کہ عازمِ صوبہ داریٔ دکن بودیم در برہان پور بادرویشے صاحبِ تکسیر ملاقات شدہ بود۔ بعضے از نکاتِ آں علم از استاد فرا گرفتہ شد۔ خود ہم گاہے تصرّفے نمودہ می شد۔
>
> چنانچہ در قواعدِ تکسیر مقرر است کہ حروفِ مشترکہ از سطورِ تکسیر اگر حذف کنند مضمونے بالفظے کہ افادۂ معنی می کند برمی آید۔ چنانچہ از۔ حکومت۔ و۔ حیلت۔ اگر در سطر کردہ حروفِ مکرر را حذف کنند۔ کل۔

یوم۔ وملیک۔ برمی آید۔ بقلب ملیک کل یوم می شود یعنی حکومت کہ
باحیلت باشد مدام و مستقیم باشد۔''

عالم گیرؒ کے متعلق حمید الدین نیچہؒ عالم گیری نے یہ معلومات فراہم کی ہیں کہ جس زمانے میں وہ دکن کی صوبے داری پر مامور کیے گئے تھے تو برہان پور میں ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ یہ درویش علمِ تکسیر کا بھی ماہر تھا۔ استاد سے بعض نکات ورموز اس علم کے حاصل کیے اور خود بھی گاہے گاہے تصرف فرماتے تھے۔

علمِ تکسیر کے قواعد میں مقرر ہے کہ دو الفاظ کے حروف ایک سطر میں لکھے جائیں اور پھر جو حرفِ مشترک ہو انھیں کاٹ دیا جائے۔ اس عمل کے بعد جو حروف باقی رہیں ان سے الگ الگ الفاظ بنائے جائیں اور پھر انھیں الٹ کر یا جس طرح با معنی فقرہ نکلتا ہو اس طرح ترتیب دیا جائے۔ پھر اس کے مفہوم کو سمجھا جائے اور تعبیر لی جائے۔ مثلاً حکومت اور حیلت کے حروف الگ الگ لکھنے سے یہ حل نکلتا ہے:

ح ک و م ت

ح ی ل ت

ان میں سے مشترک حروف ح، ت، کو خارج کیا، اب جو حروف باقی بچے ان سے مندرجہ ذیل الفاظ بنتے ہیں:

کُل، یوم، ملیک۔ ان کو اُلٹنے سے فقرہ۔ ملیک کُل یوم بنتا ہے۔ مراد اس سے یہ ہوئی حکومت اگر حیلہ (چالاکی، عیاری، زیرکی، ذکاوت وغیرہ) کے ساتھ ہو تو اس میں دوام اور استقلال ہوتا ہے۔

گر [ک مفتوح]

کر اُردو کا عام اور سہل لفظ ہے۔ ایک تو مصدر کرنا سے علامتِ مصدری 'نا' ہٹا کر فعل وامر ''کر'' بنتا ہے لیکن اس وقت ایک اور لفظ ''کر'' سے مقصد ہے۔

''کر'' کی اصل سنسکرت ہے۔ پراکرتوں اور مقامی علاقائی بولیوں میں وہیں سے دخیل ہوتا ہوا اردو میں داخل ہو گیا اور اس سفر میں برابر معانی کا انبار سمیٹتا گیا۔ اس کے بہت سے معنی ہیں۔ یہاں سب کا اندراج مقصود نہیں۔ صرف بعض لکھے جاتے ہیں:

۱۔ مال گزاری، محصول، خراج، باج، چنگی، ٹیکس

۲۔ ہاتھی کی سونڈ

۳۔ روشنی کی کرن

۴۔ جڑ

۵۔ کمر، دھوتی

۶۔ ہاتھ، دست

۷۔ سر کے بالوں کی جڑوں کی خشکی

میر نے اپنی مثنوی ''کدخدائی بشن سنگھ'' میں 'کر' بمعنی ہاتھ استعمال کیا ہے۔ اگرچہ قلیل الاستعمال ہے لیکن یہ خوبی ہے کہ بشن سنگھ کی مناسبت ہے سنسکرت اصل کا لفظ استعمال کیا ہے ورنہ شعر میں 'کر' کی جگہ 'دست' کا لفظ بھی آ سکتا تھا۔

ساقیا موسمِ جوانی ہے
کر و بادہ کی کامرانی ہے [1]

انشاءاللہ انشا نے بھی اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

دھر اپنی چھاتیوں پر بین، کر دکھاتے ہیں
جوان کی بانسری لیتی ہے کوئی چھین جھپٹ [2]

محمد حسین آزاد نے بھی ''آبِ حیات'' میں ایک شعر اس معنی کا دیا ہے یعنی خراج، باج، پابندی۔

تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا
یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے 'کر' ہے

''کَر''، سنسکرت کے علاوہ فارسی الاصل بھی ہے۔ جدید اردو میں تنہا مستعمل نہیں لیکن کر وفر آتا ہے بمعنی شان، شوکت، دبدبہ، خوبصورتی، قوت وغیرہ لیکن قدما کے ہاں تنہا۔ ''کر'' بھی ملتا ہے۔

نظیرا کبرآبادی اپنی نظم ''برسات کی بہار'' میں لکھتے ہیں:

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں

کر باندھنا/لگانا

اسی سے محاورہ نکلا ہے، کر باندھنا یا کر لگانا معنی ہیں۔

محصول عائد کرنا، ٹیکس لگانا
کوئی کام یا بات لازم کر دینا
حکمِ قطعی نافذ کر دینا

کسی پر ''کر باندھنا'' یا لگانا اصل میں مالیات کی اصطلاح ہے۔ مجازاً معنی ہیں اٹل حکم دے دینا۔ میر تقی میر نے دیوانِ دوم میں لکھا ہے:

جس ہاتھ میں رہا کی اس کی کمر ہمیشہ
اس ہاتھ مارنے کا سر پر بندھا ہے کر سا[۲]

کرورا/کروڑا/کڑوڑا [واوِ مجہول]

اب ذکر 'کر' کا نکلا ہے تو ایک اور لفظ کرورا یا کڑوڑا یا کروڑا پر بھی غور کر لیجیے۔ ضروری نہیں کہ باہمی تعلق ہو۔

ان الفاظ کے متعدد معنی ہیں لیکن ان معانی کے دو پہلو خاص ہیں:

۱۔ تکلیف، مصیبت، آفت، زحمت، کال
۲۔ حاکم، داروغہ، محتسب۔

مولانا الطاف حسین حالؔی نے ''حیاتِ جاوید'' مطبوعہ۔ آگرہ ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے:

''اور سورہ غاشیہ میں فرمایا کہ اے پیغمبرؐ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ کچھ ان پر کروڑا نہیں ہے۔''

مولوی نورالحسن صاحب نیرؔ نے نوراللغات میں منیرؔ شکوہ آبادی کا یہ شعر دیا ہے:

غیروں کو آپ مجھ پہ کرورا بناتے ہیں
طالب میں ایک کا ہوں نہ خواہاں کرور کا

یہ شعر انھوں نے ''کرورا بنانا'' کی مثال میں دیا ہے اور معنی اس کے ترجیح دینا لکھے ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتے۔ یہاں معنی ہیں غیروں کو آپ مجھ پر حاکم، افسرِ نگراں، محتسب وغیرہ مقرر کرتے ہیں۔[۱۲]

☆☆

حواشی

۱۔ کرّ و بادہ: قادری صاحب کو التباس ہوا ہے۔ اول تو سنسکرت اور فارسی الفاظ کا اس طرح مرکبِ عطفی میں لانا بالعموم درست نہیں سمجھا جاتا۔ دوسرے یہاں ''کر'' غالباً فارسی کا کر ہے نہ کہ سنسکرت کا۔ اشٹین گاس کے مطابق ''کر'' فارسی میں طاقت اور زور کے معنی میں ہے۔ پلیٹس نے اس کے ایک معنی خواہش (desire) بھی لکھے ہیں اور بظاہر شعر میں ''بادہ'' اور ''جوانی'' کے ساتھ انھی معنوں کی مناسبت نظر آتی ہے۔

۲۔ یہاں بھی ''کر'' ہاتھ کے بجائے طاقت کے معنوں میں معلوم ہوتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہاں ''کر'' کمر، کولھے وغیرہ کے معنوں میں آیا ہو کیونکہ ''کر'' کے ایک معنی پلیٹس نے the loins, the hip and loins; the waist بھی دیے ہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ''کر'' یہاں کرودھ یعنی ''غصہ'' یا ''غضب وغیظ'' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہو۔

۳۔ میر کے اس شعر میں ''کر'' خواہش یا ارادہ کے معنی میں ہے اور میر نے لفظ ''کر'' کے ایک معنی کمر

سے فائدہ اُٹھایا ہے جو پہلے مصرعے میں آیا (چونکہ کر کے ایک معنی کمر کے بھی ہیں)۔ میر کے ہاں اس طرح کے صنائع بدائع بہت ہیں۔

۴۔ رعایتِ لفظی بھی ہے۔ کرور یہاں کروڑ (یعنی سو (۱۰۰) لاکھ) کے معنی میں بھی ہے۔

☆……☆

(۱۷)

آج کی قسط میں کچھ الفاظ۔

غازی

غازی عام لفظ ہے۔ اس کے معنی اور مفہوم میں کچھ نہ اختلاف ہے نہ اِشکال۔ عام اور معروف معنی [ہیں:] جہاد و جنگ کرنے والا اور اس میں کامیاب ہونے والا۔ یہ عربی الاصل لفظ ہے۔ لیکن اس کے ایک اور دلچسپ معنی بھی ہیں۔ یعنی نٹ اور بازی گر کو بھی کہتے ہیں۔ زمین سے بلندی پر رسی تان کر اس پر چلنے والے یا بانسوں پر کھڑے ہو کر انھیں ٹانگوں کی طرح استعمال کرنے والے یا اسی طرح کے دوسرے کرتب دکھانے والے کو بھی غازی کہتے ہیں۔

مولوی محمد لاد صاحب کی مشہور فارسی لغت ہے مویدالفضلاء اس کی ۱۸۹۹ء کی اشاعت کان پور میں حصہ دوم صفحہ ۴۷ پر درج ہے:

''غزا کنندہ نیز بازی گر کہ پائے چوبیں بستہ آید''

(ترجمہ: جنگ کرنے والا اور بازی گر جو لکڑی کی ٹانگیں باندھ کر آتا ہے۔)

فارسی میں شیخ سعدی نے بھی نظم کیا ہے اور مولوی محبوب علی صاحب رام پوری نے اپنی مشہور کتابِ لغت منتخب النفائس (۱۲۸٦ھ) میں اس کی مثال درج کی ہے:

''غازی = نٹ باز۔ سعدی

نمی بینی کہ آہنگِ حجازی

فرو ماند زبانگِ طبلِ غازی (ص۱۲۲)''

بھیگی بلّی بتاتا ہے

اگر کوئی شخص کام چور اور کاہل ہو [اور] جو خدمت اور کام اس کے ذمے ہو اسے تن دہی سے پورا کرنے کے بجائے ٹال مٹول کرتا ہو، سستی، جلد بازی اور نکمّے پن سے کام لیتا ہو تو ایسے موقعوں پر یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ افضل العلماء مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے اپنی تالیف محاورات ہند مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۰ء میں درج کیا ہے۔

''جلد بازی میں ٹالتا ہے۔'' ص ۲۲

اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک امیر کا ایک نہایت کاہل اور نکما مصاحب تھا۔ امیر نے ایک بار اس سے پوچھا کہ ''باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں؟ تو بجائے اس کے کہ اٹھ کر باہر جاتا اور دیکھ کر آتا کہ کیا کیفیت ہے بولا: ''ہو رہی ہے۔'' امیر نے کہا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ ہو رہی ہے یا نہیں۔ یہاں بیٹھا بیٹھا باتیں بناتا ہے۔ بولا: ابھی ایک بلّی باہر سے آئی تھی، اسے چُھو کر دیکھا تو بھیگی تھی۔ اس سے سمجھا کہ بارش ہو رہی ہے۔

دَہ یَکی [دَ مفتوح، یَ مفتوح]

اردو میں بطور مالیات اور محاصل کی اصطلاح کے استعمال ہوتا ہے۔ بنیادی مفہوم تو دس پر ایک ہے یعنی دس فی صدی کمیشن لیکن دستوری اور جرمانہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ میر امن دہلوی کی مشہور کتاب ہے باغ و بہار، اس کے ۱۸۵۱ء کے ایڈیشن مطبوعہ لندن میں آزاد بخت بادشاہ کی سیر کے بیان میں ہے:

> ''دوسرے روز میں اس کے مکان پر جاتا دہ یکی بطریق محصول کے اس کے مال سے لیتا اور پروانگی کوچ کی دیتا۔'' (صفحہ ۱۸۳)

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں میر حسن کے بیان میں لکھا ہے:

> ''انھوں نے کہا: ''بھیا اتنی بڑی کتاب کو کون دیکھے گا۔ وہ اپنا دہ یکی کا قانون یہاں بھی جاری کرو۔ اس کنایہ میں یہ اشارہ تھا کہ پنڈت

صاحب (دیاشنکر نسیم) فوج شاہی میں منشی تھے اور بموجب قانون
حکومت کے سب کی تنخواہوں میں سے دہ یکی کاٹ لیتے تھے گھر گھر
سب اس شکایت کا چرچا تھا............'' (صفحہ ۲۵۶، لاہور ۱۹۱۳ء)

لاش کو آگے دَھرنا [دہ مفتوح]

یہ بھی اردو کا محاورہ ہے۔ اب تقریباً متروک ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس کی تشریح کی ہے:

''ہندوستان کا قدیم دستور ہے کہ جب سپہ سالار لڑائی میں مارا جاتا
ہے تو اس کی لاش کو آگے لے کر تمام فوج کے ساتھ دھاوا کر دیتے
ہیں۔''

سرہند پر جب درّانی سے فوجِ شاہی کی لڑائی ہوئی اور نواب قمر الدین خاں مارے گئے تو میر منّوان کے بیٹے نے یہی کیا اور فتح یاب ہوا۔

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے
(سودا)

وارِ مَرداں خالی نباشد

افضل العلماء مولوی سبحان بخش صاحب اپنی تالیف محاوراتِ ہند (۱۸۹۰ء) میں اس کہاوت کے تحت لکھتے ہیں:

''مردوں کا وار چُوکا نہیں کرتا کچھ نہ کچھ اثر کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر
خسروؒ، حضرت سلطان المشائخ کے مُرید نے شاعری میں حضرت
نظامی گنجویؒ کا بہت مقابلہ کیا ہے۔ ان کی سب کتابوں پر کتابیں
تصنیف کی ہیں۔ ان میں یہ شعر بھی کہا ہے:

دبدبۂ خسرو یم شد بلند
زلزلہ در گورِ نظامی فگند

اس شعر پر ننگی تلوار غیب سے پیدا ہو کر آئی۔ حضرت سلطان المشائخ امیر خسرو کے پیر نے امیر خسرو کے بچانے کے لیے ان کو اپنی بغل میں لے لیا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس وقت تلوار میں سے یہ آواز آئی۔ وارِ مرداں خالی نباشد اور حضرت کی آستین کٹ گئی۔ کہتے ہیں کہ مدت تک ان کے مرید طالبوں کی ایک آستین بڑی ایک چھوٹی ہو جاتی تھی۔ اب یہ مثل ہو گئی۔"

(منقول از: روزنامہ جنگ، کراچی، ۲؍اگست ۱۹۸۹ء)

☆……☆

(۱۸)

اَٹک [الف مفتوح، ٹ مفتوح]

اٹک اردو کا عام فہم لفظ ہے۔ برصغیر کی مختلف زبانوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے یہ کھوج لگانا کہ سب سے پہلے کب اور کس زبان میں استعمال ہوا اور اردو میں کس راستے داخل ہوا غیر ضروری بھی ہے اور مشکل بھی اسی سے فعل 'اٹکنا' اور اسم 'اٹکاؤ' وغیرہ بھی نکلتے ہیں۔ لفظ کے معنی آسان اور سادہ ہیں۔ اس میں کسی قسم کی مشکل اور دقت نہیں۔ عام و معلوم معنی کے علاوہ مندرجہ ذیل مفاہیم میں بھی مستعمل ہے:

۱۔ ممانعت، پابندی۔ فقرہ: سرکار کے اٹکاؤ سے باہر نہیں جاسکتے۔

۲۔ پرہیز۔ فقرہ: آپ کو شراب سے کیا اٹکاؤ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب راجا مان سنگھ کی افواج دریائے اٹک کو پار کرنے سے ہچکچا رہی تھیں تو اس نے یہ کہا:

سب ہی بھوی گوپال کی تا میں اٹک رہا
جا کے من اٹک ہے سو ہی اٹک رہا

یعنی ساری زمین خدا کی مِلک ہے تو کس چیز میں اٹک رہا ہے۔ جس کے دل میں شبہ ہے بس وہی اٹک رہے گا۔

۴۔ دودِلا۔ متأمل: اٹکے گا سو بھٹکے گا۔

۵۔ ناجائز تعلق ہونا۔

لاہور کی ہوس ہے نہ ملتان کی ہوس
اٹکی ہوں اک مغل سے ہے توران کی ہوس (جان صاحب)

ماما اٹکی ہوئی ہے نوکر سے
ناؤ ٹھہری ہوئی ہے لنگر سے

ریختی کا یہ شعر صدیقہ بیگم سیوہاروی کے ایک قدیم مضمون سے نقل کیا گیا ہے۔[۱]

۶۔ الجھنا، جھگڑنا۔ فقرہ: نہ کسی سے اٹکو نہ مار کھاؤ۔

۷۔ منحصر ہونا، وابستہ ہونا، متعلق ہونا۔ فقرہ: ہمارا کام کچھ تم پہ ہی نہیں اٹکا ہے۔

۸۔ رکاوٹ دور ہونا، بے دھڑک ہونا۔ فقرہ: سکھ کھلنے پر بہو بیٹی کا اٹکاؤ دور ہو جائے گا۔[۲]

اُٹھک بیٹھک [ی لین]

قدیم استادوں کے ہاں بچوں کو سزا دینے کے بعض دلچسپ طریقے رائج تھے۔ اب بھی مدرسوں میں ان پر عمل درآمد ہوتا ہو تو تعجب نہیں۔ عام سزا تو ایک وہی ہے یعنی مرغا بنانا۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس سے ناواقف ہو۔ اسی طرح اُٹھک بیٹھک کرنا بھی عام سزا ہے اور قمچیاں مارنے سے ذرا کم سمجھی جاتی ہے۔ بچہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کان پکڑ لیتا ہے اور پھر بیٹھتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ورزش میں اس پانچ بار میں تو نہیں لیکن سو پچاس بار میں ضرور بے چارے کا پلیتھن نکل جاتا ہے۔

نماز میں رکوع اور سجود اور قیام کے باعث شعرا نے بطور مزاح اسے اُٹھک بیٹھک سے تعبیر کیا ہے۔ داغ دہلوی کہتے ہیں:

ہے نماز ان زاہدوں کے ضعفِ ایماں پر دلیل
سامنے اللہ کے جاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے

دہقانیوں نے اسی اُٹھنے بیٹھنے سے اُٹھک بیٹھک تراش لیا ہے۔

فقرہ: چوں جی! یائی اٹھک بیٹھک نے نواج [نماز] کہے ہے۔(فیلن ۱۸۷۹ء)

اَجگُت [الف مفتوح، ج ساکن، گ مضموم]

اَجگُت قدیم اردو کا لفظ ہے۔ دوسری بولیوں میں بھی مستعمل ہے، بطور اسم اور صفت دونوں کے آتا ہے۔ اس کی دوسری شکلیں اور تلفظ بھی ملتے ہیں۔ مثلاً اَجُکت [ج مضموم اور کاف ساکن] اور اَجُگت [ج مضموم اور گاف ساکن]

بطور اسم کے:

۱۔ عجیب وغریب شے، اعجوبۂ روزگار، تعجب خیز بات

دوہا: اک اَجگُت میں ایسا دیکھا
ایک گدھا دو سینگ
چیونٹی کے گل پگھا دیکھا
کھینچیں ارجن بھیم (کبیر)

یعنی میں نے ایک اعجوبۂ روزگار دیکھا۔ ایک گدھے کے دو سینگ تھے، چیونٹی کے گلے میں رسی بندھی تھی اور وہ ارجن اور بھیم کو کھینچ رہی تھی۔

۲۔ غیر معمولی طور پر ذہین۔ محیرُ العقول اوصاف کے شخص یا بچے کو بھی کہتے ہیں۔ نابغۂ روزگار۔ مثال:

یہ لڑکیاں اجگت کرے لا، چھوے برس کے وا۔ سوتک لے گن جالس (بھوجپوری)

یعنی یہ لڑکیاں عجیب وغریب بات کرتی ہیں۔ صرف چھے برس کی عمر ہے اور سو تک گنتی گن لیتی ہیں۔

۳۔ بُرائی، بدی، غلط کام اور آزار و تکلیف کے معنی بھی اس میں شامل ہیں۔ مثال:

جان بوجھ اجگت کرے تاسے کہا بسائے۔

یعنی جو جان بوجھ کر غلط کام کرے اس کے ساتھ کوئی کیا کر سکتا ہے۔

۴۔ عجیب اور تعجب انگیز۔مثال:

سُتل رَہ لَوں، سَپَن اک دیکھ لَوں، سَپَن دیکھ لَوں اجگت۔(بھوجپوری)

ترجمہ: میں سوئی ہوئی تھی، میں نے اک خواب دیکھا۔خواب دیکھا عجیب۔

اَجگر [الف مفتوح، ج ساکن، گ مفتوح]

اجگر بمعنی اژدہا دوسرا لفظ ہے لیکن اردو میں اجگر کام نہ کرنے والا، سُست، کاہل، پڑیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔مثال:

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام
داس ملوکا یوں کہے سب کے داتا رام

'اجگر' بوجھل، بھاری کے معنی میں بھی آتا ہے۔فقرہ: پتھر تو اجگر ہے مَسکتا بھی نہیں۔

اُجگر کے داتا رام

یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کا مقسوم رزق پہنچاتا ہے۔ناکارہ اور کاہل کو بھی۔

فارسی میں کہتے ہیں: اگر نہ ستانی بہ ستم می رسد یعنی جو چیز جس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے، جو رزق جس کے لیے اتارا گیا ہے اگر نہ لے تو اسے زبردستی دیا جاتا ہے۔

☆......☆

حواشی

۱۔ انکنا یعنی ناجائز تعلق ہونا کی ایک سند یہ شعر بھی ہے:

جھلکی دکھا کے مجھ کو فضیلت جو ٹل گئی
انکی تھی مولوی سے فرنگی محل گئی (جان صاحب)

۲۔ یہ انکنا کی نہیں بلکہ انکا دور ہونا کی سند ہے۔انکنا کے تحت اس کے معنی لکھنا بھی تسامح ہے۔

☆......☆

(۱۹)

اَدھیلا [یاے مجہول]

ایک زمانہ تھا کہ روپیہ آنے پائی کا حساب رائج تھا۔صاحب لوگوں کے ہاں بھی پاؤنڈ،شلنگ اور پینس چلتا تھا بلکہ ہمارے ہاں تو اس نظام کو ختم کر کے بقول زرکاروں کے عشری نظام نافذ کر دیا گیا۔ جب بھی صاحب لوگ اسی پُرانے پاؤنڈ شلنگ پینس پر جمے رہے۔ بالآخر انھیں بھی بدلنا پڑا، تو پہلے ہمارے ہاں روپے میں سولہ آنے اور ایک آنے میں چار پیسے ہوتے تھے۔ روپے میں چونسٹھ پیسے، ایک پیسے میں تین پائیاں تھیں۔ نصف روپے کے سِکّے کو اَٹھنّی اور چوتھائی روپے کے سکّے کو چَوَنّی اور دو آنے کے ایک سکّے کو دُونی کہتے تھے۔ اَٹھنّی یعنی نصف روپے کے سکّے کو بعض جگہ ادھیلی بھی کہتے تھے۔ ایک پیسے کے نصف سکّے کو دھیلہ بعض جگہ ادھیلا بھی کہا جاتا تھا۔ یعنی ایک پیسے میں دو دھیلے یا ادھیلے ہوتے تھے۔

Platts نے ادھیلا یا دھیلا کو سنسکرت بتایا ہے۔اس کا کچھ تعلق سنسکرت سے نہیں ہے اور جو مادّہ Platts نے دیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ اس لفظ کی مختلف شکلیں، مختلف اضلاع میں رائج رہی ہیں۔ سہارن پور میں بیشتر الفاظ کو مشدّد بولتے ہیں، وہاں دھیلاّ کہتے تھے۔ مغربی اضلاع میں بغیر تشدید کے صرف دھیلا۔ مارواڑی میں ادیلو/ دھیلو رائج تھا۔ اب وہ سکّہ ہی غائب ہو گیا تو الفاظ بھی خارج ہوتے جاتے ہیں۔

قدیم زری نظام میں دھیلا یا ادھیلا ساڑھے بارہ دام یا چار دمڑی کے مساوی ہوتا تھا۔ تانبے کا سکّہ تھا۔ اگر کسی چیز کی تحقیر کرنی ہوتی یا بے وقعت شے سے تعبیر کرتے تو اسے

ادھیلیا، ادھیلچی یا ادھلائی کہتے۔ ادھیلی جیسا ابھی کہا گیا نصف روپے کو کہتے تھے، آٹھ آنے کا سکہ اَٹھنّی۔ اس لیے ادھیلی کی شرکت سے مراد ہوا کرتی ہے، کاروبار یا جائیداد میں آدھے کی شرکت۔

اَرمان [الف مفتوح، رساکن]

ارمان اردو کا لفظ ہے۔ فیلن (۱۷۸۹ء) نے دلچسپ تشریح کی ہے، یعنی اسے سنسکرت سے ماخوذ بتایا ہے جو غلط ہے۔ لفظ اتنا عام اور کثیر الاستعمال ہے کہ اس کے معنیٰ بتانے کی ضرورت نہیں[1]۔ عام محاوروں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ارمان رہ جانا، ارمان نکالنا، ارمان پورا ہونا، ارمان جاتا رہنا وغیرہ لیکن:

ارمان آنا:

تأسف، پچھتاوا، پشیمانی کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جرأت کا شعر ہے:

کسی کی قدر جیتے جی نہیں معلوم ہوتی ہے
کرے گا قتل پر پیچھے تجھے ارمان آوے گا

اَرْواح [الف مفتوح، رساکن]

ارواح جمع ہے روح کی، مگر اردو میں زمانۂ قدیم سے واحد بھی مستعمل ہے۔ قدیم دکنی ادب میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ کئی سو برس کے بعد بھی زمان و مکان کے فعل سے بھی اس کے استعمال میں فرق نہیں آیا اور اٹھارھویں صدی کے شمالی ہند کے اردو ادب میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

نور اللغات، آصفیہ اور دوسری مستند قدیم لغات میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ مندرجہ ذیل مثالوں میں ان ہی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

ارواح بھر جانا:

نیت اور طبیعت سیر ہو جانے کے موقعے پر کہتے ہیں، ارواح بھر گئی۔

فقرہ۔آم کھاتے کھاتے ارواح بھر گئی۔

ارواح پھر جانا:

کثرت کی وجہ سے جی ہٹ جانا، طبیعت جھک جانا۔

فقرہ۔مٹھائی منہ پر رکھی نہیں جاتی، ارواح پھر گئی۔

ارواح لگی رہنا یا لگی ہونا:

طبیعت اٹکی رہنا، دل پڑا رہنا۔

فقرہ۔کیسا ندیدہ لڑکا ہے، جلیبیوں میں ہی ارواح لگی رہتی ہے۔

بطور واحد کے دکن اور شمالی ہند کے مستند قدیم اور جدید شاعروں نے ارواح کو روح کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔نور اللغات نے میر انیسؔ کا یہ شعر درج کیا ہے:

ارواحِ رسولانِ زمَن روئے گی اس کو
سر پیٹ کے زینب سی بہن روئے گی اس کو

اَڑی [الف مفتوح]

مشکل، تنگی، گومگو کی حالت، مصیبت، آفت، کمی، ضرورت، غربت وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مثلاً، ہماری اَڑی نکال دو۔یعنی اس وقت ہمیں جو مشکل پڑی ہے یا جو کام اٹکا اور رُکا ہوا ہے اسے پورا کردو۔

اَڑی بھڑی:

مصیبت کا وقت۔مثال: اپنا وہی جو اڑی بھڑی میں کام آئے یا متر وہ مر جائے جو اڑی میں کام نہ آئے۔[۲]

اَڑی پر آنا:

چوسر ایک کھیل ہوتا ہے جس میں خانوں پر بنی ہوئی جگہ میں گوٹیں رکھتے ہیں۔

چوسر میں گوٹ کا ایسے خانے میں پھنسنا جہاں پِٹ جانے کا اندیشہ ہو اور مقصد یہ ہو کہ جلد اس خانے سے نکل جائے۔ فقرہ: میرا پانسہ اڑی پر کبھی نہیں آتا۔ (نوراللغات)

اَڑے کام سَنوارنا [الف مفتوح، س مفتوح، نون غنہ]

بگڑی بات بنانی، نجات، خلاصی دینی۔

فیلن نے اپنی لغت میں 'بہاری' کے ایک گیت کے بول دیے ہیں۔

۱۔ اڑے کام مُرلی کے سنوارے سانول ساہ بہاری نے [۳]

۲۔ سنگھ (شیر) چڑھی دیبی ملیں گڑوڑ چڑھے بھگوان، بیل چڑھے شیو جی ملے
اڑے سنوارے کام۔ [۴]

اَڑی دَھڑی [الف مفتوح، دھ مفتوح]

تفکرات اور پریشانیوں کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ اس گھر کی ساری اڑھی دھڑی میرے سر ہے۔

۲۔ پرائی اڑی دھڑی اپنے سر لیتا پھرتا ہے۔

۳۔ اڑی دھڑی قاضی کے سر پڑے۔ [۵]

سَلاطین [س مفتوح، ی معروف]

اوپر ارواح کے سلسلے میں بیان ہوا کہ اردو میں واحد بھی مستعمل ہے۔

سلاطین جمع ہے سلطان کی لیکن اردو میں ایک خاص معنی میں واحد استعمال ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد دیوانِ ذوق ۱۹۰۳ء میں صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:

''جو شہزادے قرابتِ قریبی کے لحاظ سے ایک وقت میں دعویدار سلطنت کے ہو سکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے۔ مثلاً شاہِ موجود کا چچا، بھائی وغیرہ۔''

ایک امر قابلِ لحاظ یہ ہے کہ اس موقعے پر واحد استعمال نہیں ہوتا تھا یعنی یہ نہیں

کہہ سکتے تھے کہ فلاں شہزادہ سلطان ہے بلکہ اگر وراثت کے اعتبار سے وہ دعویدار ہے تو صرف ایک کو بھی اس موقعے پر سلاطین ہی کہیں گے۔

چونکہ سلاطین دعویدار تخت و سلطنت کے ہوتے تھے اس لیے شاہِ موجود کو ان سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت قبضہ کر لیں۔ اس لیے سلطنت کے ان دعویداروں کا اکثر و بیشتر وقت قید و بند میں گزرتا تھا۔

چمنستانِ شعرا میں خواجہ احسن اللہ خاں کا ایک شعر نقل ہوا ہے:

قید میں رکھا ہے کیوں اس کو سلاطینوں کی طرح
کب دِوانے نے فلک ہے تجھ سے مانگا تخت و تاج

دیکھیے سلاطین واحد اور اس کی جمع سلاطینوں استعمال ہوئی ہے!

☆.....☆

حواشی

۱۔ ارمان: یہ عجیب بات ہے کہ "معنی لکھنے کی ضرورت نہیں"۔ قدیم فارسی لغت نویسوں میں یہ مَرَض عام تھا اور لغت میں بعض الفاظ کا اندراج کر کے معنی کے بجائے لکھ دیتے تھے "معروف است"۔ تو پھر لغت میں اس کے اندراج کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ممکن ہے کوئی لفظ کسی قاری کے علم میں نہ ہو لہٰذا لغت میں ہر لفظ کے معنی لکھنے چاہییں۔ "ارمان" خواہش، تمنا اور آرزو کے معنی میں ہے اور جب خواہش پوری نہ ہو تو ارمان کا لفظ حسرت کے معنوں میں آتا ہے اور تاسف کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

۲۔ جن فقروں کو قادری صاحب نے "مثال" قرار دیا ہے وہ انھوں نے فیلن سے لفظ بلفظ لیے ہیں۔ فیلن نے "اڑی" کے اندراج میں اڑی بھڑی، اَڑے تُھڑے، اڑے کڑے، اڑے وقت" لکھ کر اس کے معنی دیے ہیں: مشکل وقت، مفلسی، ضرورت۔ پھر تین فقرے لکھے ہیں جن میں سے دو کو قادری صاحب نے درج کیا ہے۔ تیسرے فقرے (مت دو مر . .) کے بعد فیلن

نے ''کہاوت'' لکھا ہے۔اس کے علاوہ تیسرا فقرہ جو فیلن نے دیا ہے ''ہماری اڑی نکال دو'' اسے قادری صاحب نے لفظ ''اڑی'' کی وضاحت میں لکھ دیا ہے۔

۳۔ بعض علاقوں میں نرسی نام ہوتا ہے کسی شخص کا اور ''ساہ'' یہاں دراصل ''شاہ'' تخریب ہے۔

۴۔ فیلن نے اس کے معنی یوں لکھے ہیں: شیر پر سوار دیوی ملی اور پرندے پر سوار وشنو، شیو بیل پر چڑھے ملے اور میری مشکلات حل ہو گئیں۔

۵۔ یہ ساری مثالیں قادری صاحب نے فیلن سے لی ہیں لیکن فیلن نے قاضی کے سر ''پڑے'' لکھا ہے، قادری صاحب نے ''پڑی'' لکھا تھا۔

☆……☆

(۲۰)

شمع کا چور

شمع کا چور کسے کہتے ہیں؟ یہ اصطلاح پچھلی کسی قسط میں بیان ہو چکی ہے۔ فارسی میں دُزدِ شمع تھا جس کا ترجمہ اردو میں بالکل لفظی کر لیا گیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں۔

''شمع عربی میں بمعنی موم ہے پھر موم بتّی کو کہنے لگے۔ فارس میں آ کر چربی کی بھی بننے لگی مگر نام شمع ہی رہا۔ ہند میں چربی ناپاک ہے اس لیے نہ شمع تھی نہ اس کا نام تھا۔'' (آبِ حیات۔ لاہور ۱۹۱۲ء ص ۵۵)

اَکل کُھرا [الف مفتوح، ک مفتوح، کھ مضموم]

جو شخص مردم بیزار ہو، اکیلا رہنا پسند کرتا ہو، ہم جِنسوں اور دوستوں سے گریزاں ہو، ہر کام الگ، ہر بات جدا، ہر وقت علیحدہ، اسے عام بول چال میں اَکل کُھرا کہتے ہیں۔ پھر بے مروّت اور کچھ خود غرض آدمی کے لیے بھی آنے لگا۔ اصل میں تھا تنہا اور اکیلا بیٹھ کر کھانے والا جو عام بول چال کی زبان میں اَکل کھرا ہو گیا۔

فارسی میں بھی تنہا خور کہتے ہیں یعنی اکیلے اور تنہا کھانے والا۔ اردو میں بھی ادبی طور پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ خود غرض، دوسروں کی ضرورت اور تکلیف سے بے پروا شخص۔

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالؔی ''حیاتِ جاوید'' (مطبوعہ مفیدِ عام پریس آگرہ ۱۹۰۳ء) میں لکھتے ہیں:

''تنا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں

کو خبر نہیں ہونے دیتا۔''

اصل لفظ تھا تنہا خور، اردو میں آ کر کثرتِ استعمال سے ''ہ'' ساقط ہوگئی اور اب 'تنا خور' ہوگیا۔ معنی وہی ہیں جو اقتباس سے ظاہر ہیں۔

پَرچین سازی [پ مفتوح، ی معروف]

قدیم شاہی عمارات پتھر پر نقش و نگار اور فن کارانہ کام کے لیے مشہور ہیں۔ یہ نقش و نگار دو نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم اُبھرے ہوئے کام کی ہے یعنی جو نمونہ گل کاری اور بیل بوٹوں کا ہوتا ہے اس کی باقی زمین کو کھود کر اس نمونے کو ابھار دیتے ہیں۔ اس اُبھرے ہوئے نقوش کی فن کاری کو مُثبَت کاری کہتے ہیں۔ دوسرا طریقہ ہے کہ جو نقوش ہوں انھیں کھودتے ہیں اور پھر ان میں دوسرے رنگ کے قیمتی پتھروں کو تراش خراش کر بٹھاتے ہیں اور مُسَطّح کرتے ہیں۔ اس عمل کو جو مثبت کاری کے برعکس ہوتا ہے۔ ٭منّبَت کاری کہتے ہیں۔

پروفیسر عبداللہ صاحب بلگرامی ''حلِ غوامض'' ۱۸۸۵ء صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں:

> ''پرچین۔ کیل وغیرہ کا کسی چیز کے اندر کر کے مضبوط کرنا۔ اہلِ عمارت کی اصطلاح میں پتھر کے ٹکڑوں کو دوسرے پتھر میں جڑ کر گل بوٹے ہموار طور پر بنانا او سے [اُسے] ٭منّبَت کاری کہتے ہیں اور ٭منّبَت کاری میں جو باریک خطوط گُل بوٹے ہوتے ہیں اوس [اُس] کے بنانے کو پرچین سازی کہتے ہیں۔''

پَنیری [پ مفتوح، ی مجہول]

اس تلفظ کے ساتھ اس کے معنی ہیں: چھوٹے چھوٹے پودے۔ میر حسنؔ ''مثنوی سحرالبیان'' میں لکھتے ہیں:

کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پَنیری جمادیں کہیں کھود کر

پَنیری [پ مفتوح، یاے معروف]

پنیری کا دوسرا تلفظ ہے پَ نی رِی یعنی پنیر سے متعلق اور اسی سے محاورہ بنا ہے۔

پنیری جمانا:

بات کا ڈول ڈالنا۔ اپنے مطلب کی بات کا آغاز کرنا، اپنے مقصد کے لیے موقع پیدا کر کے بات کرنا وغیرہ وغیرہ۔

عِشق ہے

اردو کا قدیم محاورہ ہے۔ اب بالکل متروک ہے۔ معنی اس کے ہیں آفریں، مرحبا۔ شاباش، بطور کلمۂ تعریف کے استعمال ہوتا تھا اور اس کا استعمال 'کو عشق ہے' سے ہوتا تھا۔ قدیم شعرا کے ہاں اکثر استعمال ہوا ہے۔ میر تقی میرؔ نے لکھا ہے:

عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے
ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں

اس شعر کے سلسلے میں جناب علامہ شمس صاحب نے "حضرت شاہ احمد رضا خان صاحبؒ کے نعتیہ کلام کا تحقیقی جائزہ" (مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۹۴ پر) تحریر فرمایا ہے:

"یہاں عشق معنی معروف میں تو فصیح ہے لیکن میرؔ نے اس کے جو معنی لیے ہیں میرؔ کے دور میں تو قریب الفہم تھے یعنی آفریں لیکن آج کل نہیں۔ اس کلمے میں تنافر اور مخالفتِ قیاس لغوی موجود ہے۔ آپ کو کسی اردو لغت میں عشق کے معنی آفریں کے نہیں ملیں گے۔"

کسی اردو لغت میں عشق کے معنی آفریں نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ عشق کے معنی آفریں کے ہی [کذا] نہیں اور میرؔ کے اس شعر میں عشق اپنے معنی معروف میں یعنی محبت کے معنی میں استعمال ہی نہیں ہوا۔ اس شعر میں عشق کے اگر معنی معروف لیے جائیں تو شعر فصیح کیا معنی بامعنی بھی نہیں رہتا۔ میرؔ نے عشق کے معنی آفریں کے لیے بھی نہیں [ہیں] بلکہ

دلچسپ بات یہ ہے کہ میرؔ نے تنہا عشق کا لفظ بھی نہیں استعمال کیا، اس نے پورے محاورے 'کو عشق ہے' استعمال کیا ہے۔ 'کو عشق ہے' کے معنی اس نے لیے یعنی عقل کو مرحبا، شاباش، آفریں ہے۔ اس لیے اس کلمے میں نہ تنافر ہے نہ مخالفتِ قیاسِ لغوی۔

میرؔ کے دیوانِ اوّل کی ایک پوری غزل کی ردیف ہی یہ ہے 'کو عشق ہے' جس کے مطلعے میں دونوں جگہ یہی معنی ہیں:

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے
اس دل جلے کی تاب کے لانے کو عشق ہے

میرؔ کے بعد مگر میرؔ سے زیادہ مشہور غزل غالبؔ کی ہے جس کے ایک شعر میں یہی محاورہ نظم ہوا ہے:

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ 'کو عشق ہے' کا محاورہ اس قدر جلد متروک ہو گیا تھا کہ ہمارے بعض علمائے شعر و ادب کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا۔ علامہ نظم طباطبائی جید عالم اور نفیس شعری مزاج کے بزرگ تھے۔ ان کی شرحِ غالبؔ ادبِ فائقہ کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے اس شعر کے ذیل میں یہ تحریر فرمایا ہے:

''اس شعر میں معلوم ہوتا ہے کہ ''کا'' کی جگہ ''کو'' کاتب کا سہو ہے۔''

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علامہ ''کو عشق ہے'' تک نہ پہنچے اور اس کو سہوِ کاتب پر محمول فرمایا۔ پھر اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن عجب نہیں کہ ''کو'' ہی کہا ہو تو معنی ذرا تکلف سے پیدا ہوں گے یعنی واماندگی کو میرے قدم سے عشق ہو گیا ہے اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزلِ مقصود کی طرف جاؤں۔''

اس کے بعد حضرت طباطبائی نے آگے چل کر تحریر فرمایا ہے کہ:

''فارسی والوں کے محاورے میں عشق بمعنی سلام و نیاز بھی ہے اور اس صورت میں ''کو'' صحیح ہے یعنی ہم واماندگی کے نیاز مند ہیں کہ اس کی بدولت ''اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے۔''

اب ان تحریروں پر غور کر کے دیکھیے کہ ''کو عشق ہے'' کا محاورہ اس درجے اوجھل ہو گیا تھا کہ ہمارے بزرگ عالموں کی نظر نہیں پہنچ سکتی۔ فارسی والوں کے محاورے میں عشق بمعنی سلام و نیاز ہو یا نہ ہو غالبؔ کے اس شعر میں میرؔ کے شعر کی طرح صرف ''عشق'' استعمال نہیں ہوا۔ پورا محاورہ ''کو عشق ہے'' استعمال ہوا ہے اور ''کو عشق ہے'' کے معنی ہیں مرحبا، شاباش، آفریں، کلمۂ تحسین۔

غالبؔ کے شعر کے یہ معنی نہیں کہ واماندگی کے سبب چوں کہ ہمارا قدم جو منزل میں ہے وہاں سے اٹھ نہیں سکتا اس لیے ہم واماندگی کے نیاز مند ہیں۔

بلکہ مفہوم یہ ہے کہ ہماری واماندگی کو مرحبا اور تحسین و آفریں کہ ہم اس کے سبب منزل سے قدم اُٹھانے کے لائق نہیں۔ اٹھا ہی نہیں سکتے۔ نہ یہ کہ واماندگی کو میرے قدم سے عشق ہو گیا ہے اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزل کی طرف جاؤں۔

☆......☆

حاشیہ

۱۔ اکل: قادری صاحب نے اکل کھرا لکھتے ہوئے اکل کے کاف پر ہر بار بالالتزام تشدید لکھی ہے لیکن پلیٹس، فیلن اور بورڈ کی لغات میں تشدید نہیں ہے۔ بغیر تشدید ہی کے درست ہے۔ البتہ اس کا تلفظ اِکل یعنی الف مکسور سے بھی درست ہے۔ اَکل یا اِکل دراصل اکیلا کے معنوں میں ہے۔

☆......☆

(۲۱)

اردو کا مزاج بنیادی طور پر شہری ہے۔ یہ شہری مزاج ہونا اس کی خوبی بھی ہو سکتی ہے اور خامی بھی۔

انگریزی کا مزاج بنیادی طور پر دہقانی ہے۔ جس طرح فرانسیسی کا مزاج شہری ہے۔ اس وقت مقصود صرف اتنا ہے کہ بے شمار وہ الفاظ جو شہری معاشرت اور مدنی معیشت سے تعلق نہیں رکھتے وہ اردو میں راہ نہ پا سکے۔ اگر چہ قدیم اردو ادب میں جو دکن، اودھ، پنجاب اور سندھ وغیرہ کے علاقوں میں پیدا ہوتا رہا اس میں مقامی ماحول کے اثرات اور ان کے ارتسامات الفاظ کی شکلوں میں ملتے ہیں، بعض کے خط واضح ہیں اور آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں، بعض کی شناخت میں مشکل ہوتی ہے۔

پچھلی نصف صدی اردو زبان کے لیے اس لحاظ سے بہتر گزری کہ بلا امتیاز نئے الفاظ، فقرے اور استعارے اردو میں داخل ہوئے اور اب ان میں سے بیشتر عوامی اور ادبی دونوں سطحوں پر مضبوطی سے قدم جما چکے ہیں۔ اس بات کے واسطے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

گونڑ [واوِ معروف، نون غنہ]

کسان کھیت میں ہل چلاتا ہے۔ ہل کے پھل سے زمین میں لکیریں پڑتی جاتی ہیں جن میں بعد میں بیج بوئے جاتے ہیں۔ اس لکیر کو انگریزی زبان میں furrow کہتے ہیں۔ یہ لفظ انگریزی زبان میں صرف کسان، کاشتکار اور دہقان تک محدود نہیں رہا بلکہ ادب اور شعر میں بھی داخل ہو گیا اور رنج و فکر اور تردد و پریشانی پر جو گہری لکیریں پڑ جاتی ہیں

استعارتاً انھیں furrows of sorrow کہتے ہیں۔ اس لفظ کے جاننے، سمجھنے اور استعمال کرنے کے لیے صرف انگریزی سے واقفیت کافی ہے کسی اور قسم کی تخصیص ضروری نہیں۔

اب آپ اس انگریزی لفظ کا مترادف اردو میں تلاش کیجیے تو کوئی اس طرح کا واضح لفظ نہیں ملتا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی لغت میں مندرجہ ذیل الفاظ ملتے ہیں:

ریگ ہاری۔ شیار۔ ہلائی۔ باہ۔ جہاز کے گزرنے کا نشان پانی پر۔
لکیر۔ نالی۔ کچی زمین پر پہیوں کا نشان۔ ہل چلانا۔ نالیاں یا لکیں
بنانا۔ شکن ڈالنا۔

لیکن ان میں سے کوئی لفظ بھی ادبی کیا عوامی سطح پر بھی ہمارے مقصد کو حل کرتا نہیں ملتا۔ یہ نہیں ہے کہ furrow کا متبادل لفظ نہیں۔ کسان اور کاشتکار کی زندگی میں اس کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ مختلف علاقوں میں اور زبانوں میں یقینی طور پر مختلف الفاظ رائج ہوں گے۔ بلکہ ایک ہی لسانی علاقے یا صوبے کے مختلف اضلاع میں مختلف الفاظ ہوں گے۔ ہم نے اب تک ان کی قدر نہیں پہچانی۔

اردو میں بچوں کے ادب کے سلسلے میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا نام نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو والے اپنی خلقی ناقدر شناسی کے سبب اس نشانِ راہ کو تقریباً مٹا چکے ہیں۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

کلاسیکی نظمیں ہیں۔مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی بچوں کو اردو سکھانے کی کتابیں صرف اپنے ابتدائی حروف سے ہی مشہور ہوگئی تھیں اور صرف پانا۔ جانا والی کتاب کہنا شناخت کے لیے کافی تھا۔تو ان میں سے ایک کتاب میں انھوں نے furrow کے لیے کونڑ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

یہ لفظ بھی نہ نوراللغات میں ہے نہ فرہنگِ آصفیہ میں اور نہ ہی ان کے متقدمین فیلن (Fallon) اور پلیٹس (Platts) میں ہے۔[1]

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ کونڑ کا لفظ اضلاعِ میرٹھ میں عام طور پر رائج ہوگا اور ہریانی، کھڑی بولی، برج، راجھستانی، پنجابی، کشمیری، سندھی اور شمالی مغرب کی دوسری بولیوں میں اس کے مترادف الفاظ دوسرے ہوں گے۔

چِھمارُو/بَجُکا [چ مفتوح، واو معروف/ب مفتوح، ج مضموم]

کسان جب کونڑ میں بیج ڈال چکتے ہیں تو مٹی برابر کر دیتے ہیں۔اب بڑا خطرہ چڑیوں سے ہوتا ہے کہ موقع پا کر وہ بیج چگ لیتی ہیں اور اس طرح کسان کی ساری محنت برباد ہو جاتی ہے۔اسی سے محاورہ نکلا ہے:

اب پچھتاوت کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

جب تک بیج میں سے اکوا پھوٹے اور کونپلیں نکلیں چڑیوں اور بعد میں بڑے پرندوں کو اُڑانا اور بھگانا بھی ایک بڑا کام ہے۔بعض کسان کھیتوں میں بھوسے اور گودڑ وغیرہ سے آدمی کا پتلا بنا کر بانس اور ڈنڈے لگا کر کھڑا کر دیتے ہیں جو دور سے ڈراؤنی شکل کا نظر آتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پرندے وغیرہ اس کو رکھوالا اور آدمی سمجھ کر ڈر جائیں اور کھیتی خراب نہ کریں۔انگریزی میں اس طرح کے پتلے کے لیے نہایت عام لفظ ہے scarecrow۔ ادب، شاعری، افسانہ اور عام گفتگو میں استعارتاً بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔اردو میں کوئی لفظ آسانی سے ہاتھ نہیں لگتا۔بابائے اردو کی محولہ بالا ڈکشنری میں اس لفظ کے

ذیل میں درج ہے:

''ڈراؤنا (کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے لیے جو شکل بنا دیتے ہیں)۲۔کم رو۔ بدلباس، بدقطع (شخص)۔''

چشمارو فارسی کا بہت عام اور مستند لفظ ہے اکثر لغاتِ فارسی میں مل جاتا ہے اور scarecrow کے ہی معنی رکھتا ہے۔لیکن اردو میں اس کا استعمال بالکل نہیں ملتا۔ظاہر ہے کہ کونز کی طرح یہ لفظ بھی زرعی معیشت اور دیہاتی معاشرت کا عام لفظ ہونا چاہیے اور قیاس چاہتا ہے کہ مختلف بولیوں میں اور لسانی علاقوں میں مختلف الفاظ رائج ہوں گے۔

اردو کا دامن بھی سرے سے تہی نہیں ہے۔افضل العلما مولوی سبحان بخش صاحب اپنی تالیف محاورات ہند (۱۸۹۰ء) میں، جس کے حوالے سے پہلے گزر چکے ہیں، لکھتے ہیں:

بجّکا[۲]: کھیت کی حفاظت کے لیے پھونس کا پتلا بنا کر کھیت کے اندر کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ وحشی جانور ڈر کر کھیت نہ کھائیں۔اس کو فارسی میں چشمارو کہتے ہیں۔(صفحہ۲۹)

☆......☆

حواشی

۱۔ کونز: یہ لفظ اردو لغت بورڈ کی لغت میں درج ہے اور اسمٰعیل میرٹھی کی سند بھی موجود ہے۔وہ سند یہ ہے:

''ہل کے پیچھے کونز میں ہاتھ سے بیج ڈالتے جائیں گے۔''

(۱۸۹۴ء، اردو کی چوتھی کتاب، ص۱۹۴)

۲۔ بجّکا: اس کا ایک املا واوِ معروف سے یعنی ''بجّوکا'' بھی ہے۔

☆......☆

(۲۲)

چھانڈ نا [نون غنّہ]

اوراس سے چھانڈ جس کے معنی قدیم اردو میں استفراغ کرنا، اُلٹی یا قے کرنا اور اس سے ہی معنی پیدا ہوئے ہیں، نکالنا، چھوڑ نا وغیرہ کے۔

قدرت اللہ قاؔسم نے مجموعہ نغز میں عظیم بیگ عظیؔم کا ایک شعر یاد ہے:

علم تو کم ظرف کو لاتا ہے اولٹا[الٹا] جہل پر
عاقبت کتے کو کھی پچتا نہیں، دیتا ہے چھانڈ

حضرت سید محمد مرزا صاحب مہذؔب لکھنوی نے کئی مجلدات میں نہایت ضخیم لغت ترتیب دی ہے۔ اس کا نام ہے مہذب اللغات، چھانڈ نا کے ذیل میں حضرت مہذؔب لکھنوی نے درج فرمایا ہے:

''ڈالنا۔ چھوڑنا۔ اردو۔ متروک

مر جائے لہو چھانڈ نہ گونگا ہو وہ کیوں کر جو شخص کہ دیکھے
سرخی تری آنکھوں کی اور ابرو کی کھچاوٹ سرے کی گھلاوٹ
(انشاء اللہ خاں انشاؔء)

قولِ فیصل: اس جگہ ڈالنا یا اگلنا مستعمل ہے۔

ہماری رائے میں فاضل مؤلف نے اس لفظ کی تحقیق نہیں فرمائی۔ صرف انشاؔء کے مندرجہ بالا شعر سے جو معنی نکلتے تھے ان پر قیاس کر کے معنی درج فرما دیے۔ اگر یہ بات ذہن میں ہو کہ چھانڈ کے بنیادی معنی قے اور استفراغ کے ہیں اور چھانڈ نا یا چھانڈ دینا کے

معنی اُلٹی کر دینا یا تے کر دینا ہیں تو انشاء کے شعر میں بھی یہ معنی صاف سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

ایک جملۂ معترضہ یہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ لغت میں قولِ فیصل کے کوئی معنی نہیں۔ لغت میں قولِ فیصل ہو نہیں سکتا اور تاریخی اصول پر اگر مبسوط لغت مرتب کی جائے تو متروک کے بھی کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔

قطار لڑانا

اردو کا قدیم محاورہ ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق میں ذوق کا یہ شعر مع تشریح کے درج کیا ہے:

برنگِ بیضۂ نو روز توڑے دل اس نے
ہزاروں، ایک ہمارا ہے کس قطار میں دل

''بہارِ نوروز میں لوگ ہار جیت پر انڈے لڑاتے تھے۔ اس کے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی ہیں بیس بیس تیس تیس انڈے لے کر اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑایا جاتا تھا۔ جس کا انڈا آخر کو ٹوٹتا اس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا۔ اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ رسم ایران، توران اور افغانستان سے ہو کر ہندوستان آئی تھی۔''

بال پڑنا

چینی یا مٹی کے برتن میں بے احتیاطی کے سبب سے باریک سی لکیر پڑ جاتی ہے، اس سے وہ برتن ناقابلِ استعمال سمجھا جاتا ہے۔ قدیم اردو کا ایک لفظ اسی معنی میں جھوجھرا یا جھوجھڑا بھی ہے اور اس کے معنی ہیں ٹوٹا ہوا، بال پڑا ہوا برتن۔ چینی یا مٹی کا برتن جسے اگر پختگی کے واسطے بجا کر دیکھیں تو ٹھنٹھناتی آواز نہ نکلے۔

جھوجھرے پڑنا[1] [واو مجہول]

جھوجھری آواز کہتے ہیں بال پڑے ہوئے برتن کی سی آواز [کو]۔ ٹھس آواز۔ کپڑے سینے میں اگر سلائی میں زیادہ جھول رہ جائے تو اس موقع پر بھی جھوجھرے پڑنا کہتے ہیں۔

میر تقی میرؔ کے دیوانِ سوم میں یہ شعر ملتا ہے:

دے دن کہاں کہ مست سر انداز خُم میں تھے
سر اب تو جھوجھرا ہے شکستہ سبو کی طرح

جَم [ج مفتوح]

سنسکرت کا لفظ یَم بھی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ ہندو علم الاصنام میں یہ ملک الموت ہے۔ اس کے معنی موت، ہم زاد اور جنوبی سمت کے محافظ کے بھی آتے ہیں۔ اردو میں ناگوار اور ناقابلِ برداشت شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تیسرے معنی اس کے سوہانِ روح، ناگوارِ خاطر تکلیف دہ شے [یا] حالت، یا شخص کے بھی ہیں۔

چھاتی کا جم اسی سے نکلا ہے اور مفہوم ہے اس کا، کوئی شخص یا چیز جو چھاتی پر فرشتۂ اجل کی طرح دھری رہے۔ چھاتی کا پتھر۔ میر تقی میرؔ کے دو اشعار دیکھیے:

بے چین مجھ کو چاہتا ہے ہر دم ہے زیرِ خاک
چھاتی پہ بعدِ مرگ بھی دل جم ہے زیرِ خاک

کبھو دل رکنے لگتا ہے جگر گاہے تڑپتا ہے
غمِ ہجراں میں چھاتی کے ہمارے ہیں یہ جم دونوں

چَپَڑوَخ [چ مفتوح، پ مفتوح، ڑ ساکن، واو مفتوح]

پشتو کا لفظ ہے۔ روہیل کھنڈی اردو میں عام ہے۔ جناب مولانا امتیاز صاحب

عرشی نے اپنی کتاب میں، جس کے حوالے پہلے بھی دیے جا چکے ہیں، یہ لکھا ہے۔ ہم تلخیص درج کرتے ہیں:

''چپڑ وخ پشتو میں ایک کھیل کا نام ہے۔ جو گول پتھروں سے کھیلا جاتا ہے۔ روہیل کھنڈ میں چَپَڑ وَخ کے التزامی معنی شور وغل مراد ہوتے ہیں اور بچے شور مچاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ارے یہ کیا چَپَڑ وَخ مچا رکھی ہے یا لگا لی ہے۔''

سِلَفچی/سِلَپچی/چِلَمچی [س مکسور، ل مفتوح/اس مکسور، ل مفتوح/چ مکسور، ل مفتوح]

اردو میں بے سبب اور بے ضرورت انگریزی کے الفاظ اس درجے بولے جاتے ہیں کہ اچھے خاصے قدیم الفاظ متروک ہو رہے ہیں۔ منھ ہاتھ دھونے کے برتن کے لیے اب انگریزی لفظ سِنک [sink]، واش بیسن یا بیسن اس درجے عام ہو گیا ہے کہ گویا اردو کا ہی لفظ ہو۔ حالانکہ اسی مقصد کے لیے جو برتن پہلے استعمال ہوتا تھا اسے چلمچی یا سلپچی یا سلفچی کہتے ہیں اور اب تک یہ بالکل متروک نہیں ہوا۔ شریف قدیم گھرانوں میں یہ برتن آج بھی موجود ہے اور بعض جگہ استعمال بھی ہوتا ہے۔ انگریزی واش بیسن ایک جگہ ضرور لگا ہوتا ہے ورنہ مقصد اس کا بھی وہی ہے جو سلفچی کا اور کوئی وجہ نہیں کہ انگریزی واش بیسن کو سلفچی ہی نہ کہا جائے۔ بہرحال یہ لفظ اپنی اصل میں پشتو ہے۔ مولانا عرشی فرماتے ہیں:

''دراصل چلمچی اور سلپچی یہ دونوں لفظ پشتو سے آئے ہیں۔ پہلا جوں کا توں رہا اور دوسرا سلپچی کی شکل میں مروج ہو گیا۔ رہا سلفچی تو وہ بھی اسی کا محرّف ہے۔''[۲]

☆......☆

حواشی

۱۔ جھوجرا/ جھوجھرا: پلیٹس نے جھوجرا لکھ کر اسے جھوجھرا سے رجوع کرایا ہے۔ گویا جھوجرا (ایک ''ھ'' سے) اور جھوجھرا (دو ''ھ'') دونوں املا درست ہیں۔

۲۔ سلفچی: پلیٹس نے سلفچی کو چلپچی سے رجوع کرایا ہے اور چلپچی کا ایک اندراج ہندی/ فارسی لفظ کی حیثیت سے کر کے معنی لکھے ہیں: حقّے کا ایک حصہ جو چلم کے نیچے لگایا جاتا ہے۔ چلپچی کا دوسرا اندراج پلیٹس نے ترکی لفظ کی حیثیت سے کیا ہے اور معنی واش بیسن (wash-basin) لکھے ہیں۔ غالباً فارسی یا ترکی سے پشتو میں گیا ہوگا۔ اصلاً پشتو ہونے کی کوئی دلیل چاہیے۔ پلیٹس نے سلچی کا بھی اندراج کیا ہے اور اسے ہندی کہہ کر چلپچی سے رجوع کرادیا ہے۔

☆......☆

(۲۳)

غَلتی [غ مفتوح، ل ساکن]

ت سے، ط سے نہیں۔ فوراً یہ خیال گزرتا ہے کہ یا کاتب نے درست نہیں لکھایا مولف سے سہو ہوا۔ لیکن یہ بات نہیں یہ دو لفظ الگ الگ ہیں اور دونوں با معنی ہیں۔ ط سے غلط اور ت سے غَلَت۔ ط سے غلطی کے معنی تو سب جانتے ہیں۔ لیکن ت سے غَلَت یا غَلتی سے زیادہ واقف نہیں۔ اگر حساب کتاب میں خطا یا گنتی اور ہندسوں میں غلطی ہو تو اسے ت سے غَلتی کہتے ہیں۔ غَلتی کے معنی ہیں حساب و اعداد میں خطا ہونا۔ یہ عربی الاصل لفظ ہے۔

مودی خانہ [واو مجہول]

مسلمانوں کے عہدِ اقتدار میں بہت سی اصطلاحیں رائج تھیں، دفتری الفاظ تھے جو سب متروک ہو گئے۔ ان میں سے بعض الفاظ سودا اور میر کے قصائد، مثنویات اور ہجویات اور دوسری منظومات میں کثرت سے آتے ہیں۔ مثلاً رُوَساء اور امرا کا مال گودام یا اسٹور ہاؤس یا جہاں غلہ جنس اور دوسرا سامان ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ اسے مودی خانہ کہتے تھے۔

بُیُوتات [ب مضموم، واو معروف]

اور [مودی خانہ کی طرح] بیوتات بھی اسی قسم کا ایک لفظ ہے۔ آج بالکل غیر اور نامانوس نظر آتا ہے۔ پروفیسر سید عبداللہ بلگرامی نے اپنی تالیف حل غوامض (۱۸۸۵ء) میں، جس کا حوالہ پہلے بھی گزر چکا ہے، لکھا ہے:

''بیوتات عربی لفظ جمع الجمع ہے۔ بیت بمعنی خانہ کے ہے [اور بیت

کی جمع بُیُوت ہے] مگر اصطلاحِ اہلِ عرف میں مودی خانہ کو کہتے ہیں جہاں غلہ وغیرہ جنس وسامان کھانے کا رکھا رہے۔ بیوتات سے مراد دراروغۂ مودی خانہ ہے۔"

سوداؔ کے مشہور شہر آشوب میں ہے:

اودھر [اُدھر] سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جاؤ
دیوان و بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے

دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر
مانند کنھیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے

میم وجیم [یائے معروف، یائے معروف]

یہ دو حرف بھی قدیم دفتری کارروائیوں اور مراسلات میں استعمال ہوتے تھے یعنی م اور ج۔ حساب کتاب اور دوسرے مطالبات کے متعلق کاغذات دفتر میں پیش ہوتے تھے۔ ان کی جانچ پڑتال کی جاتی اور تنقیح کے بعد فیصلہ اور منظوری کے مراحل طے ہوتے تو جس عرضی یا کاغذ کی جانچ پڑتال ہو جاتی تو اس پر جیم [ج] لکھ دیا جاتا۔ یعنی جائزہ لیا گیا اور اگر جائزے کے بعد وہ منظور بھی ہو جاتی تھی تو پھر اس پر نشان میم [م] بنایا جاتا۔ یعنی عرضی تمھاری منظور ہو گئی ہے۔ سیاہے[۲] کا جائزہ ہو گیا۔

سوداؔ نے شہر آشوب میں لکھا ہے:

عرضی پہ ہوا میم سیاہے پہ کیا جیم
پروانہ میں تم پر ہوں تصدق مری جاں ہے

مودی[۳] [واوِ مجہول]

برصغیر کی فلمی دنیا میں مودی کا لفظ بمبئی کے پارسی اداکار سہراب مودی کے سبب

شاید زیادہ مشہور ہوا۔ اردو کا قدیم لفظ ہے اور مغل عہد میں سرکاری و دفتری اصطلاح کے طور پر بہت رائج تھا۔ یہ تمام لغتوں میں مل جاتا ہے۔ Platts، جس کی لغت کا بار بار حوالہ آتا ہے، اس کو بڑا مرض ہر لفظ کی اصل سنسکرت سے ملانے کا ہے۔ خواہ سنسکرت سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ مودی لفظ کو بھی موصوف نے سنسکرت الاصل قرار دیا لیکن کوئی مادہ اس کا تلاش نہ کر سکے۔ اصل یہ ہے کہ سنسکرت سے اس لفظ کا کوئی تعلق نہیں یہ عربی مؤدّی سے ہے۔

تادّی: مہیا کرنا، اسباب بہم پہنچانا، ادا کرنا، تیار کرنا، انجام دینا، مُؤدّی اسی فعل سے اسم فاعل ہے۔ بمعنی مہیا کرنے والا۔ ادا کرنے والا۔ بہم پہنچانے والا۔

اردو میں اناج غلّے اور پرچون کے دکاندار کو بھی کہتے ہیں۔ حلوائی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس لفظ مُودی کے اور معنی یہ ہیں:

۱۔ بنیا، تاجر، دکاندار

۲۔ غلے اناج کا بیوپاری

۳۔ روساء کے ہاں توشہ خانے کا مہتمم

سودا کی مشہور نظم ویرانی شاہ جہاں آباد میں ہے:

کہو جو مودی سے جا کر دو آب کے حالات
جواب دے ہے کہ ہے اونٹ تو فرشتے کی ذات

ماپنا [پ ساکن]

اس لفظ کے وہی معنی ہیں جو ایک زیادہ عام لفظ ناپنا کے ہیں۔ دہلی کے قدیم محاورے میں اکثر ناپنا کی جگہ ماپنا بولتے اور لکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبِ حیات (مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء) میں صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں:

''قُلانچ، قلاش یا قلاچ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اس سے کپڑا ماپنے کا پیمانہ ہے۔''

ایک دوسری مثال ایک مذہبی رسالے سے اخذ کی جاتی ہے۔ ''نوٹ کے متعلق سب مسائل'' عربی زبان میں حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ کا مختصر رسالہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا حامد رضا خاں صاحب نے ۱۳۲۹ھ میں بریلی سے شائع کیا تھا۔ اس میں درج ہے:

''جب ماپ کی چیز ماپ یا تول کی چیز تول سے بیچی، حرمت ربا کی
علت وہ خاص اندازہ یعنی ماپ یا تول ہے۔''

اسی سے محاورہ نکلا ماپا شوربا اور گنی ڈلیاں (یا بوٹیاں)[۴] یعنی کسی چیز کی قلت اور کمی کو ظاہر کرنے کے لیے بولتے ہیں۔

ہنٹر۔ ٹیلر نے اپنی لغت مرتبہ ۱۸۰۸ء میں ہدایت کا یہ شعر درج کیا ہے:

نہیں ہم پاس جز خونِ دل و لختِ جگر پیارے
مثل مشہور ماپا شوربا ہے اور گنی ڈلیاں

☆......☆

حواشی

۱۔ مودی اور مودی خانہ: پلیٹس کے بقول مودی خانہ میں جو ''مودی'' ہے وہ اصلاً سنسکرت کا لفظ ہے اور کسی زمانے میں حلوائی کے معنوں میں رائج تھا، بعد میں ''بیوپاری، غلّے کا تاجر، دکاندار یا بنیا'' کے معنوں میں آ گیا۔ مودی خانہ اسی لیے غلّے کے کسی تاجر کی دکان یا گودام کے معنوں میں آتا ہے۔

۲۔ سیاہہ: بہی کھاتا، روزنامچہ جس میں رقم وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے۔

۳۔ مودی: پلیٹس نے اس کا تلفظ واو مجہول سے دیا ہے۔ قادری صاحب نے مُودی اور مُوڈی لکھا ہے۔ لیکن قادری صاحب نے سند میں سودا کا شعر دیا ہے اور سودا کے شعر میں مودی یا مُودی تو وزن میں ہے لیکن مُوڈی نہیں۔

۴۔ ماپا شوربہ..... یہ محاورہ نہیں کہاوت ہے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی رائج ہے: نپا شوربہ اور گنی بوٹیاں۔ یہ گھر میں غربت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے آتی ہے۔ (علمی اردو لغت)

☆......☆

(۲۴)

مُلاحِظہ [م مضموم، ح مکسور]

تمام زبانوں کا عام قاعدہ ہے کہ بعض الفاظ اپنے عام معنی میں استعمال نہیں ہوتے یا عام معنی کے علاوہ مرادی معنی بھی دیتے ہیں۔ مثلاً عام لفظ ہے مُلاحِظہ۔ لَحَظَ کے معنی عربی میں ہیں گوشۂ چشم سے دیکھنا۔ انتظار کرنے کے معنی بھی ہیں۔ اردو میں عام طور پر تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ دیکھنا، نظر کرنا، مطالعہ کرنا، جانچنا۔

۲۔ رسوخ، اثر۔

۳۔ مروت، لحاظ۔

مروت اور لحاظ کے معنی میں مولوی نورالحسن صاحب نیرؔ صاحبِ ''نوراللغات'' کا خیال ہے کہ یہ عورتوں کا محاورہ ہے۔ لیکن عورت مرد کی ہماری رائے میں کوئی تخصیص نہیں۔ بلاامتیاز سب بولتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ اپنے ترجمۂ قرآن ''موضحِ قرآن'' میں سورۂ بقرہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

''بے شک خدائے تعالیٰ نہیں شرماتا اور کسی کا ملاحظہ نہیں اس کو کہ بیان کرے کوئی مثل مچھر کی۔''

اسی سے لحاظ اور لحاظ کرنا اور اس جذبے اور احساس کی نفی کی صورت میں بدلحاظی بھی بولا جاتا ہے۔ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ اپنی ایک کتاب ''لمعۃ الضحیٰ

فی اعفاء اللحی ''میں لکھتے ہیں: ''.......... بدلحاظی کے کپڑے پہنیں۔ کنبے بھر کی سب غیریں سامنے آنے کے لیے بہنیں۔''

مکھو چلنا/ پھیلنا، ماکھو دوڑنا [م مفتوح، کھ مشدد، واو مجہول]

افواہ، گپ، بے پر کی اڑانا، خوش باشوں کے دل پسند مشغلے تھے اور طرح طرح کے الفاظ، استعارے، محاورے اور فقرے اس فنِ شریف سے نکلے ہیں۔ کچھ حد درجہ مقامی رہے اور کچھ تقریر و تحریر کے ذریعے زیادہ وسیع حلقوں تک پھیل گئے۔ اگر چپکے چپکے کوئی بات پھیلائی جائے جس میں اِخفا کے علاوہ سازش کا عنصر بھی ہو تو اس کے لیے مکھو چلنا یا پھیلنا بھی بولتے تھے۔ آغا شاعر دہلوی کے ایک مضمون میں جو کراچی کے اردو نامہ نمبر ۴۰ میں شائع ہوا تھا، یہ جملہ ملتا ہے:

''آخر چند روز بعد ایک بڑی سازش ظہور پذیر ہوئی۔ اس کی مکھو یوں چلی..........''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاورہ دوسری طرح بھی مستعمل تھا۔ کیوں کہ افضل العلماء مولوی سبحان بخش صاحب اپنی تالیف محاورات ہند مطبوعہ ۱۸۹۰ء میں لکھتے ہیں:

''ماکھو دوڑ گئی۔ یعنی چپکے چپکے شہرت پھیل گئی۔''

ٹپک نویس [ٹ مفتوح، پ مفتوح]

پہلے زمانے میں خبریں مہیا کرنے والے اور معاملات و حالات کی اطلاعات فراہم کرنے والے کو وقائع نگار کہتے تھے۔ مغلیہ عہد میں وقائع نگار کو بڑا منصب اور اہم کام ہوتا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ان کا بڑا منظم نظام تھا۔ تمام شہزادوں کے درباروں میں امرائ وَ ساء گورنر اور حکام کے ہاں شاہی وقائع نگار مامور ہوتے تھے اور یہ براہ راست شہنشاہ کے احکام کے ماتحت ہوتے تھے۔ مقامی دربار کے ماتحت نہیں تھے۔ ایک طرح سے مقامی حکام و گورنر اور شہزادے ان وقائع نگار سے خائف رہتے تھے۔ اخبارات تو نہیں تھے

اس لیے عوامی اطلاعات کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں انھیں نیوز رپورٹر کہہ سکتے ہیں۔ تو جو سنی سنائی اور بے بنیاد افواہوں پر اپنی خبروں کی بنیاد رکھتا تھا جدید عہد میں یعنی عہدِ مغلیہ ختم ہونے اور صحافی دور شروع ہونے کے بعد والے زمانے میں انھیں ٹپک نویس کہتے تھے۔

حاضری

اس لفظ کے عام معنی تو ظاہر ہیں۔ افضل العلماء مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی ''محاوراتِ ہند'' میں لکھتے ہیں:

> ''مردہ کو دفن کر کے آتے ہیں تو قریب یا آشنا کے گھر سے کھانا آتا ہے۔ دہلی میں اس کو حاضری کہتے ہیں اور دیہاتی اور قصباتی اس کو کڑوا پانی کہتے ہیں۔ دہلی میں یہ ٹھہرا ہوا ہے کہ فی کس ایک شیرمال، ایک آبی روٹی، اس پر گولی کے چار کباب، ایک مولی اور پیاز ترشا ہوا اور کچھ پودینہ بجائے سالن کے ہوتا ہے اور شیعوں کے ہاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حاضری ہوتی ہے، بڑی محفل کرتے ہیں۔''

بدھیا بَلا سے مَری آگرہ تو دیکھا

دلچسپ محاورہ ہے۔ اب بالکل سننے میں نہیں آتا۔ ''محاوراتِ ہند'' میں ہی مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے اس کی دلچسپ تفصیل درج کی ہے:

> ''ایک دھوبی کا مشہور قصہ ہے۔ جو شوقِ دیدِ آگرہ میں دو منزلہ مارتا ہوا آگرہ پہنچا۔ وقتِ واپسی بیل مر گیا۔ اس کا یہ مقولہ ضرب المثل ہوگیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نقصان ہوا بلا سے دل کی ہوس پوری ہوگئی۔''

اِکوانجھ [۲] [الف مکسور، نون غنہ]

اولاد کی خواہش کسے نہیں ہوتی اور اس کے لیے خواہش مند کیا کچھ نہیں کرتے۔ جس عورت کے اولاد نہ ہوتی ہو اس کو سلیس زبان میں بانجھ کہتے ہیں۔ اس لفظ میں جو محرومی اور مایوسی کی کیفیت ہے اس میں اس غریب کا کچھ قصور نہیں ہوتا جس پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ باوجود اس بات کے سمجھنے کے کہ خود اس کا کوئی قصور نہیں، دوسروں کا رویہ نہیں بدلتا۔ بہرحال کم سے کم اردو کی ایک کہاوت میں اسے اچھا بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں:

''بانجھ اچھی اکوانجھ بری'' مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی ''محاوراتِ ہند'' میں اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ''بانجھ وہ جو کبھی نہ جنے۔ اکوانجھ وہ جو ایک دفعہ جن کر رہ جائے۔ بانجھ سے تو مضمون اَلیاس احدی الرّاحتین [۳] کا پیدا ہوتا ہے اور اکوانجھ سے انتظاری اور امید چلے جاتی ہے۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ یہ محاورہ نہیں کہاوت ہے۔

۲۔ اِکوانجھ/ اِکونج: اکوانجھ کا اندراج لغت بورڈ، پلیٹس اور فیلن میں نہیں ہے۔ لیکن ان لغات نے ان معنوں میں لفظ اِکونج (بواوِ لین) درج کیا ہے۔

۳۔ اَلیاس احدی الراحتین: قادری صاحب نے ''الرّاحین'' لکھا ہے۔ الراحتین چاہیے۔ لہٰذا تصحیح کی گئی۔ یہ عربی کہاوت ہے، مراد یہ کہ مایوسی دو راحتوں میں سے ایک راحت ہوتی ہے یعنی ایک راحت تو مطلوب و مقصود تک پہنچنا ہے اور دوسری راحت ناکامی ہے (انسان مایوس ہو کر کوشش کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔)

☆......☆

(۲۵)

تھیگلی [یائے مجہول][1]

پیوند اور جوڑ کو کہتے ہیں۔ تھیگلی لگانا یعنی پیوند اور جوڑ لگانا۔ اسی سے محاورہ نکلا ہے: آسمان میں تھیگلی لگانا یعنی بڑبولا پن کرنا، گپ ہانکنا، دون کی لینا، شیخی کی باتیں کرنی، چالاکی کی باتیں کرنی، حیلہ بازی کرنا۔[2]

آسمان پر تھیگلی لگاتی ہے: مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی ''محاوراتِ ہند'' میں لکھتے ہیں:

> ''جب یہ محاورہ کسی عورت کی جانب بولا جاتا ہے تو قائل کا مقصود اس سے اس عورت کی قحبگی اور فاحشہ ہونے کا ثبوت ہے۔''

قَحبہ [ق مفتوح، ح مفتوح]

''قحبہ'' کا لفظ خود دلچسپ ہے۔ بدکار، آوارہ، فاحشہ کے معنی میں آتا ہے۔ طوائف اور کسبی کا مترادف ہے۔ عربی لفظ ہے اور مادہ اس کا قَحَبَ ہے، معنی ہیں کھانسنا، کھنکھارنا۔ یہ عورتیں مردوں کو اور اپنے گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کھانستی اور کھنکھارتی تھیں۔ اس لیے ان کا نام قحبہ پڑ گیا۔ یعنی کھانسنے والی۔ ویسے عربی محاورے میں بھی یہی معنی آتے ہیں۔ قَحَبَتِ المَرأۃُ یعنی عورت کا بدکار ہونا۔ قحبہ کے عربی میں بھی معنی بدکار کے آتے ہیں۔

ایک غریب کو مارا تھا نو من چربی نکلی

مولوی سبحان بخش صاحب نے ہی اس محاورے کے ذیل میں لکھا ہے:

یعنی غربت کا دعویٰ کرنے والے واقعی میں غریب نہیں ہوتے۔

(محاوراتِ ہند، ۱۸۹۰ء)

یہ محاورہ تو ظاہر ہے کہ کسی غریب دشمن نو دولتیے نے ہی تراشا ہوگا لیکن کسی غریب دل جلے نے بھی اچھا محاورہ نکالا۔ کہتے ہیں:

اُمیر کے پاس قبر بھی نہ ہو

''محاوراتِ ہند'' ہی میں اس کی تشریح درج ہے:

''غریب کو امیر کے قرب سے بھی آزار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ امیر کی قبر پر اُس کے ورثا یا اس کے ملنے والے اکثر فاتحہ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور آمد و رفت خلائق سے غریب کی قبر پامال اور شکستہ ہوتی ہے۔''[۳۳]

بیمہ بیچ دیا

بیمے کے لیے اب انشورنس کا لفظ نہایت عام ہوگیا ہے۔ لیکن بیمہ بھی رائج ہے اور اردو کا کارآمد لفظ ہے۔ ایک پرانا محاورہ ہے ''بیمہ بیچ دیا'' مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''یعنی مال کا پہنچانا دوسرے کے ذمے کر دیا۔ تاجروں میں یہ رسم ہے کہ جب مال کبھی دور بھیجتے ہیں تو بہ نسبت محصول کے کچھ زیادہ دے کر اس مال کا پہنچانا دوسرے کے ذمے کر دیتے ہیں۔ اگر اتفاقاً کسی سبب سے تلف ہو جائے تو مال گھر سے دینا پڑتا ہے۔ اکثر وہ دام بھی ہضم ہو جاتے ہیں اور کبھی دینا بھی پڑتا ہے۔ قسمت آزمائی ہے، جیسے جوا۔''

مُچھندر [م مضموم، چھ مفتوح، ن ساکن، د مفتوح]

معنی ظاہر ہیں۔ بڑی بڑی مونچھوں والا۔ اور اسی سے اس میں ظرافت اور مزاح کا پہلو ہوا اور اس کے معنی ظریف اور مسخرے کے بھی آنے لگے۔ مولوی نورالحسن صاحب نیرؔ صاحبِ ''نوراللغات'' نے اس کے معنی دیوث کے بھی درج کیے ہیں۔ اس معنی کی تصدیق مثالوں سے نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے معنی یقینی طور پر بندر نچانے والا اور بندر کا تماشا کرنے والے کے ہیں۔

مولوی محبوب علی رام پوری کی ''منتخب النفائس'' سے بھی ان معنوں کی توثیق ہوتی ہے۔ اس میں درج ہے:

مچھندر : ''میمون باز۔ عربی قراد۔''

سوداؔ نے میر ضاحکؔ کی جو مشہور ہجو لکھی ہے، اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دو بند درج ذیل ہیں:

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے[1] سکندر
ضاحک کے اڑا دیوے کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچۂ بندر
گلیوں میں نچاتا پھرے وہ شہر کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طرح مچھندر[2]

کر ہجو موا لوگوں کی ناحق مجھے پِٹوائے
اور اپنے موے جیتے کی گالی پہ نہ شرمائے
کوئی دوست ہو اس کا تو وہ اس بھڑوے کو سمجھائے
اس سے تو بھلا دو گھڑی بندر ہی نچا لائے
روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

مان

اس لفظ کی جڑیں شاید سنسکرت تک پھیلی ہوئی ہوں۔ اردو میں عام استعمال کا لفظ ہے۔ معنی اس کے بے شمار ہیں۔ کچھ درج کیے جاتے ہیں:

عزت، آبرو، تعظیم، توقیر، قدر و منزل، آؤ بھگت، شہرت، رتبہ، درجہ، ادب، جاہ، مقدار، مشابہت، ناپ، پیمانہ، اندازہ، شان، دبدبہ، رتبہ، ناز و ادا، قابو، تکبر، غرور وغیرہ۔

مان میں بھنگ:

یعنی بے عزتی ہونا۔

مان پان/ مان تان:

قدر افزائی، آبرو، عزت۔

مان کا ہونا:

قابو اور اختیار کا ہونا۔

مان مرنا:

تکبر و غرور جاتا رہنا، عاجز ہونا، اکڑفوں ختم ہو جانا۔

آغا شاعر دہلوی نے اپنے مضمون میں جو ''اردو نامہ'' کراچی شمارہ ۴۰ میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے:

''میرا یہ کہنا اور استاد کا مسکرانا صاحب عالم کے تو مان مر گئے۔''

مَجْہلَہ [م مفتوح، ج ساکن، ہ مفتوح، ل مفتوح]

عربی لفظ ہے۔ ج ہ ل اس کا مادّہ ہے۔ مجہلہ یا مجہل وہ صحرا جس میں راستہ اور راستے کی علامات نہ ہوں۔ ایک معنی اس کے بے عملی اور جہالت کی ترغیب کا باعث بھی ہیں۔ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں انتشار اور افراتفری ہو۔ جہاں کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے[۳]۔ میر تقی میر کے قطعہ بند اشعار ہیں:

مرنا ہے یا تماشا ہر اک کی ہے زباں پر
اس محلے کو چل کر میں خواہ نخواہ دیکھوں
دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے
ہوتا ہے قتل کیوں کر یہ بے گناہ دیکھوں

مُقابہ [م مضموم]

عورتوں کا سنگھاردان یا وینیٹی بکس (vanity box) آرائش و جمال کے لیے اب ضروریات میں شامل ہو گیا ہے۔ اردو میں قدیم سے ایک مفید اور خوبصورت لفظ اس کے لیے مقابہ موجود ہے۔ مقابہ کے معنی سنگھاردان، مِسّی سرمہ غازہ اور آرائشِ جمال کی اشیا رکھنے کا ڈبہ ہیں۔ میر حسن دہلوی ''مثنوی سحر البیان'' میں لکھتے ہیں:

مقابہ کوئی کھول مِسّی لگائے
لبوں پر دھڑی کوئی اپنی جمائے

میت/میتا [یائے معروف نیز مجہول]

تلفظ ''می ت۔ ے ت'' دونوں طرح ہے۔ قدیم اردو کا لفظ ہے اور متعدد مقامی بولیوں میں رائج ہے۔ معنی دو خاص ہیں۔ اوّل معنی تو دوست، ساتھی اور محبوب کے ہیں۔ عاشق و محبّ کے بھی۔

''مثنوی سحر البیان'' میں میر حسن دہلوی لکھتے ہیں:

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت؟
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

دوسرے معنی اس کے ہیں کاسۂ گدائی، چِپنی، بھیک مانگنے کا برتن۔

''بے نواؤں کے میتے اور ٹکڑ گداؤں کے چملے اشرفیوں اور روپیوں کی کھچڑی سے بھر دیئے۔''

(میر امن۔ باغ و بہار۔ لندن۔ ۱۸۵۱ء: سیر چوتھے درویش کی۔)

مَیسور [یائے لین، واوِ معروف]

(مے سور تلفظ) جنوبی ہند کی قدیم اسلامی سلطنت کا نام ہے۔ اس ریاست یا موجودہ شہر و علاقے کی وجہ تسمیہ سے غرض نہیں۔ لیکن لفظ کے اعتبار سے یہ عربی ہے۔ (یَسَرَ) معنی ہیں آسان۔ آسان کیا ہوا۔ عمدہ پُر آسائش۔ کامیابی سے انجام دیا ہوا۔

میسورات: جمع۔ عمدہ حالات۔ اچھے معاملات۔ خوش احوال۔ اسبابِ آسائش۔

☆......☆

حواشی

۱۔ یارب تو مری سن لے......: قادری صاحب نے اس مصرعے میں "تھا" لکھا ہے لیکن انتخابِ سودا (مرتبہ رشید حسن خاں) میں "ہے" ہے۔ (ص ۳۱۵)

۲۔ روٹی تو کما کھائے......: قادری صاحب نے یہ مصرع یوں لکھا تھا:

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر

لیکن انتخابِ سودا (مرتبہ رشید حسن خاں) میں یہ مصرع یوں درج ہے:

روٹی تو کما کھائے کسی طرح مچھندر (ص ۳۱۵)

۳۔ مجہلہ: اشٹین گاس کے مطابق مجہلہ کے معنی ہیں: کوئی شے جو لاعلمی کو ظاہر کرے؛ جہل کا سبب؛ کوئی چیز جو احمقانہ یا غلط طرزِ عمل کو اُبھارے؛ کشمکش؛ مشکل، الجھن۔ چونکہ مَجہلہ کا لفظ مَفعلہ کے وزن پر ہے اور اس وزن پر عربی میں اسم ظرف بنائے جاتے ہیں (جیسے مَدْرَسہ، مَقْبَرہ، مَکْتَبہ) اس لیے اردو میں بعض لوگ طنزاً یا حقارتاً اس مقام کو بھی مجہلہ کہتے ہیں جہاں جہل ہو۔ اردو لغت بورڈ نے اس کے ایک معنی "جہالت کی جگہ" بھی دیے ہیں۔

۴۔ چُپنُل: کاسۂ گدائی کے معنی میں فارسی میں چُپنُل (چ مضموم، ب مضموم) ہے اور اردو میں چَپنَل (چ مفتوح، ب مفتوح) (اشٹین گاس، علمی اردو لغت)۔ میر امن نے اس کا املا "چپلا" کیا ہے۔ (دیکھیے: باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۶، ۲۴۱)

☆......☆

(۴۷)

نوّاب [واو مشدد]

اتنا عام لفظ ہے کہ اس کے معنی بتانے کی ضرورت نہیں۔ آج کل اس کا تلفظ واو کی تشدید کے بغیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں واو پر تشدید ہے۔ اردو کے اکثر و بیشتر استاد مضامین شعراء کے ہاں بہت التزام کے ساتھ تشدید سے نظم ہوا ہے۔ بغیر تشدید کے نظم کرنا استادوں کے ہاں عیب شمار ہوتا تھا۔

عربی میں نواب نائب کا صیغۂ مبالغہ ہے۔ چوں کہ بادشاہ یا سلطان وقت کا نائب یا وائسرائے ہوتا تھا اس لیے اس شخص کو نوّاب کہتے تھے۔ برصغیر میں فرنگی راج میں وائسرائے اور گورنر کے خطبات والقاب میں کمپنی کے عہد تک نوّاب کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

غالبؔ نے اپنے ایک خط میں ''نئے نواب'' کی تشریح دلچسپ انداز میں کی ہے۔ لکھا ہے:

> ''یہاں دلّی میں ایک اصطلاح ''نئے نوّاب'' کی۔ اور یہ لفظ عام ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان، اس پر صادق آتا ہے۔ صورت یہ کہ جہاں کوئی شخص مرا بشرط آنکہ دولت مند ہو اس کا بیٹا مال پر متصرف ہوا، بدمعاش لوگ فراہم ہوئے اور اس کو خداوندِ نعمت اور جنابِ عالی کہنا شروع کیا۔ فلانی رنڈی آپ پر مرتی ہے۔ فلانا امیر اپنی مجلس میں آپ کی یوں تعریف کر رہا تھا۔ آپ کو لازم ہے اس رنڈی کا بلانا اور اس امیر کی دعوت کرنی۔ دنیا اسی واسطے ہے۔ روپیہ ساتھ ساتھ نہیں

جاتا۔ آپ کے باوا کیا لے گئے جو آپ لے جاویں گے۔ غرض کہ بندہ آج تک تین نئے نواب دیکھ چکا ہے۔ ایک تو کھتری ٹوڈرمل لاکھ روپے کا آدمی تھا۔ پان سات برس میں سب کچھ کھو کر شہر سے نکل گیا اور مفقود الخبر ہو گیا۔ دوسرا ایک پنجابی لڑکا سعادت نام۔ چالیس پچاس ہزار روپیہ کھو کر تباہ ہو گیا۔ تیسرا خان محمد نام سعد اللہ خاں کا بیٹا کہ وہ بھی بیس پچیس ہزار روپیہ لٹا کر اور بگھیوں پر چڑھ کر اب جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔"

ایسے شخص کو سلیس اردو میں نو دولتیا کہتے ہیں۔ جس نے نئی نئی دولت پائی ہو اور وہ بھی کسی وراثت وغیرہ میں، یا پشتینی رئیس نہ ہو۔

"نوکیسہ" بھی ایسے ہی شخص کو کہا جاتا ہے جس نے نئی نئی دولت اور مال پایا ہو اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرتا ہو۔

نیاؤ [ن مکسور، نیز یائے مخلوط]

اردو کا لفظ ہے۔ برج، کھڑی بولی اور دوسری بولیوں میں بھی قدرے تغیر سے رائج ہے۔ معنی ہیں انصاف، عدل، داد، وغیرہ۔ مرزا غالب نے حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"امیر شیر علی جیسا محتسب اور مولوی جامی جیسا مفتی کہاں سے لاؤں جو نیاؤ کرے اور کاذب کو سزا دے۔"

نیک [یائے لین، نیز یائے مجہول]

برج اور کھڑی بولی میں تھوڑا، ذرا، ذرا بھی، تھوڑی دیر بھی، تھوڑی وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اکبر آباد (آگرہ) اور اس کے نواح میں آج بھی اس معنی میں رائج ہے۔ للو لال جی نے "لطائفِ ہندی" (کلکتہ ۱۸۱۰ء) میں نقل نمبر ا میں درج کیا ہے:

سکھ دکھ پَرَ تی دن سنگ ہے میٹ سکے نہیں کوئے
جیسے چھایا دیہہ کی نیاری نیک نہوئے

یعنی دُکھ سکھ ہر وقت ساتھ لگا ہے کوئی اسے مٹا نہیں سکتا۔ جس طرح سایہ جسم کا ذرا بھی جدا نہیں ہوتا۔[۲]

نیل کا ماٹھ بگڑنا

کمپنی کے عہد میں نیل کی تجارت کی بڑی اہمیت تھی اور فرنگی تاجروں اور ان کے مقامی کارندوں اور اہل کاروں نے اس مد میں بڑی دولت کمائی۔ نیل فارسی ہے اور ''ماٹھ'' یا ''ماٹ'' اردو ہے۔ [ماٹھ یا ماٹ یعنی] برتن، مٹی کا بڑا برتن، مٹکا، یا نیل تیار کرنے کا حوض۔

نیل بگڑنا:

محاورتاً مستعمل تھا قسمت بگڑنا یا مصیبت پڑنے کے معنی میں۔ یعنی اگر نیل تیار کرنے والوں کا نیل بگڑ جائے تو گویا زبردست نقصان اور مالی خسارے کا سبب ہوتا تھا۔ قدیم شاعر مرزا علی نقی کا شعر ہے:

یہ رنگ ڈھنگ آج سے افلاک کے نہیں
ایسا ہی کچھ قدیم سے بگڑا یہ نیل ہے

رنگ ریزوں میں ایک یہ عقیدہ بھی عام تھا کہ اگر ان کے نیل کا مٹکا یا حوض جس میں رنگ تیار کریں، اس میں اگر رنگ بگڑ جائے تو کوئی جھوٹی خبر پھیلائی جائے اور اس طرح افواہ پھیلانے سے وہ بگڑا ہوا رنگ خود بخود درست ہو جائے گا۔ اسی سے محاورہ نکلا نیل کا ماٹھ بگڑنا یعنی بے پَر کی اڑانا، افواہ پھیلانا۔

نیم کی مستی

نیم مشہور درخت ہے۔ پتیاں اور ان کا عرق سخت کڑوا ہوتا ہے۔ کڑواہٹ اور تلخی

میں ضرب المثل ہے۔ بعض نیم کے درختوں سے ہلکا ہلکا سا عرق رِستا ہے۔ اسے نیم کی رطوبت کہنا چاہیے۔ اس کے طبی فوائد ہیں۔

غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''نم نیم کی مستی پیا کرو۔ یعنی بعضا بعضا نیم رِستا ہے اور اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے اسے نیم کی مستی کہتے ہیں۔ سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشہ بڑھاتے جاؤ اور جب پانچ تولے پر آ جاؤ تو تھم جاؤ۔''

(نادراتِ غالب، مرتبہ، سید آفاق حسین)

وَجد و تَو اجُد [واو مفتوح، ج ساکن، ت مفتوح، ج مضموم]

صوفیہ کی مصطلحات ہیں۔ ملفوظاتِ شاہ غلام علی صاحب قدس اللہ تعالیٰ ''درّ المعارف'' مطبوعہ استنبول، ترکیہ، ۱۹۷۳ء میں درج ہے:

''وہم می فرمودند کہ در وجد و تواجد فرقے ست۔ وجد بے اختیار رقص کردن ست۔ و تواجد با اختیار۔''

ترجمہ: اور یہ بھی فرماتے تھے کہ وجد اور تواجد میں فرق ہے۔ بے اختیار رقص کرنا وجد ہے اور اپنے اختیار و ارادے سے رقص کرنا تواجد ہے۔[۳]

☆......☆

حواشی

۱۔ پان: قدیم اردو میں پانچ کی بجائے پان بھی رائج رہا ہے اور مثلاً پانچ سو کو پانسو بھی لکھا جاتا تھا۔

۲۔ نیک: پلیٹس نے نیک (بیائے لین) دیا ہے اور ''کئی، متعدد نیز مختلف'' کے معنوں میں درج کیا ہے۔ قادری صاحب نے ''نیک'' کے تلفظ کی وضاحت نہیں کی۔ لیکن غالباً بیائے مجہول آ گرہ

(جہاں سے قادری صاحب کے والد حامد حسن قادری صاحب کا تعلق رہا ہے) اور گرد و نواح میں "تھوڑا" یا "ذرا" کے معنوں میں رائج ہو۔

۳۔ وجد و تواجد: وجد اور تواجد کے الفاظ بے خودی کی حالت اور جذب و مستی کے مفہوم میں بھی آتے ہیں۔ اگرچہ عربی میں لفظی مفہوم کچھ اور ہے۔

☆......☆

(۲۸)

آسمان کے محاورے اردو میں بہت ہیں۔ بعض غیر معروف یہاں درج کیے جاتے ہیں:

آسمان جھانکنا

مرغ بازوں کی اصطلاح ہے۔ مرغ کا کھاپی کر تیار اور مست ہو جانا اور لڑائی کے لیے تیار ہو کر تن تن کر آسمان کی طرف دیکھنا۔ طنزاً یا مزاحاً کسی طاقتور اور مغرور شخص کے لیے بھی کہہ دیتے ہیں۔

آسمان میں تھیگلی لگانا [یائے مجہول]

یہ محاورہ کسی سابقہ قسط میں تھیگلی کے ذیل میں آچکا ہے۔ مراد اس سے ہوتی ہے عیاری، مکاری، چالاکی کی باتیں اور کام کرنا۔ دشوار اور ناممکن کام سرانجام دینا۔ اس عورت کے لیے بھی کہتے ہیں جو بہت جوڑ توڑ اور بدمعاشی کے کام کرنے میں استاد ہو جس کا کردار مشتبہ ہو۔ Platts کے ہاں اس سلسلے میں خاصا لطیفہ ہوا ہے۔ اس نے بھی اس محاورے کو آسمان کے تحت درج کیا ہے۔ جو رومن رسم الخط وہ استعمال کرتا ہے اس کے اپنے اصول کے مطابق بجائے تھیگلی [ت] سے ٹھیگلی [ٹ] سے لکھی ہے۔ کیوں کہ اس نے t کے نیچے نقطہ لگایا ہے۔ خیر اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ اگرچہ ڈکشنری میں کمپوزنگ کی غلطی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بہر حال مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی تشریح میں لکھتا ہے:

(Lit. to pierce the sky) یعنی لفظی معنی آسمان میں تھیگلی لگانے

کے ہیں آسمان میں سوراخ کرنا۔ مزید لطف یہ ہے کہ خود ہی تھیگلی کے ذیل میں صفحہ ۳۵۰ پر درج کیا ہے کہ پیوند اور کپڑے کا ٹکڑا۔ تھیگلی لگانا یعنی پیوند لگانا۔ کہاں سوراخ کرنا، کہاں پیوند لگانا۔

آسمان کا کھونچا [واو مجہول، نون غنہ]

یہ کئی موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔ Platts نے لکھا ہے: کوئی چیز جو بہت ارفع (lofty) یا بلند ہو جیسے بانس یا آدمی۔ یہ بھی غلط ہے۔ بہت لمبے آدمی کو مزاحاً آسمان کا کھونچا کہہ دیتے ہیں۔ اس کا کوئی تعلق ارفع سے نہیں۔ بہت لمبے نیچے (نے چ) کے حقّے کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ پہلے دستور تھا کہ جو لوگ بلند مقام پر بیٹھتے تھے یا ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے، میلے وغیرہ میں انھیں پلانے کے لیے بہت لمبے نیچے کا حقّہ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے مزاحاً لمبے آدمی کو بھی کہہ دیتے ہیں۔

آسمان کی چیل زمین کی اصیل

اس چالاک عورت کو کہتے ہیں جو ایک جگہ نہ ٹکے بلکہ برابر ادھر اُدھر گھومتی پھرتی رہے۔

آسمان میں ڈُوب جانا

کسی چیز کا اس قدر اونچا ہو جانا کہ آسمان میں نظروں سے اوجھل ہو جائے جیسے پتنگ یا کبوتر وغیرہ۔

آسمان نے ڈالا زمین نے جھیلا [یائے مجہول]

یہ مثل وہاں بولتے ہیں جہاں زبردست کا ٹھینگا سر پر بولتے ہیں۔ یعنی زبردست کی طاقت کے سامنے کمزور کو اطاعت کے سوا چارہ نہ ہو۔

آسمانی پلانا

بھنگ یا تاڑی پلا دینا۔ اس کے پینے سے دماغ آسمان کی سیر کرنے لگتا ہے۔

اس لیے اسے آسمانی پلانا کہتے ہیں۔اسی کو فلک سیر بھی کہتے ہیں۔

آسمانی آگ

محدّب شیشے میں سے سورج کی شعاعیں گزار کر ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہیں تو گرمی سے وہ جگہ جل اُٹھتی ہے۔موجودہ دور میں سورج کی شعاعوں کو اسیر کر کے جو گرمی، طاقت اور آگ پیدا کی جاتی ہے، اسے بھی آسمانی آگ کہہ سکتے ہیں۔

''نوراللغات'' نے انشا کا ایک شعر درج کیا ہے:

لڑی جو آنکھ اس خورشید رو سے تو مجھے انشا
ہوئی اک آسمانی آگ سی محسوس شیشہ میں

آسمانی تیر [یائے معروف]

آسمانی بلا، ناگہانی مصیبت۔تیر آسمان کی طرف پھینکنا یعنی فضول اور بے ہودہ کام کرنا۔

آسمانی فرمانی

(مؤنث: لفظاً آسمانی فرمان) کثرتِ بارش یا خشک سالی کے سبب غیر متوقع اور ناگہانی طور پر فصلوں کا تباہ ہونا۔

پرانے زمانے میں معاہدے یا سرخط وغیرہ میں ایک شق رکھی جاتی تھی کہ اگر موسمی تباہ کاری یا سرکار کے نامناسب مطالبات کے سبب زمیندار کو نقصان ہو یا اخراجات میں اضافہ ہو تو رعیت کو اس کی تلافی کرنی پڑتی تھی۔اس کو آسمانی فرمانی کہتے تھے۔گڑھوال کے علاقے میں عدم ادائیگی لگان کی صورت میں تخمینی جرمانہ یا قرقی وغیرہ کو بھی آسمانی فرمانی کہتے ہیں۔

آڑی

ایک تو صفت ہے۔آڑا ترچھا اور آڑی ترچھی۔لیکن دوسرے معنوں میں ساتھی

اور خاص طور پر کھیل کا ساتھی۔ اس سے محاورہ نکلا ہے:

آڑی آنا یا آڑیاں آنا:

یعنی دوسرے پر رکھ کر بُرا بھلا کہنا۔ آوازہ کسنا، ڈھول دھپّا۔ "نوراللغات" نے حزیںؔ کا ایک شعر اس مفہوم میں درج کیا ہے:

بہت سی آڑیاں آتے ہیں حضرتِ واعظ
جلا بھنا کوئی ہم سا نہ آڑی آ جائے

آشِرت [س ساکن، رکسور]

قدیم اردو کا سنسکرت الاصل لفظ ہے۔ (آسری۔ آسری بھوت)[1] اس کے معنی آتے تھے: مفت خورا، تابعدار، خدمت گار، پیرو۔ وہ برہمن جو رسومِ شادی کی ادائیگی میں مدد دے۔

☆......☆

حاشیہ

۱۔ آسری، آسری بھوت: قادری صاحب نے مزید وضاحت نہیں کی۔ پلیٹس نے آسرت کو آسری سے رجوع کرایا ہے اور پھر آسری بھوت لکھ کر idem لکھا ہے جو idem quod کا مخفف ہے اور معنی ہیں: same as (مراد یہ کہ وہی معنی ہیں جو آسرت میں مذکور ہوئے)۔ لیکن آسرت اور آسری اردو کی عام لغات میں درج نہیں ہیں۔ بلکہ لغت بورڈ نے بھی درج نہیں کیا کیونکہ اردو میں شاید ہی کبھی آسرت یا آسری/آسری بھوت استعمال ہوئے ہوں۔ البتہ قادری صاحب نے معنی پلیٹس سے لے لیے ہیں۔ استعمال کی کوئی سند دست یاب نہیں ہوئی ہوگی۔

☆......☆

(۲۹)

ماہی مَراتِب [م مفتوح، ت مکسور]

شاہی زمانے میں بادشاہِ وقت کی خوشنودی کے اظہار کے مختلف طریقے تھے۔ خلعت، اعزازات، خطابات وغیرہ عام تھے۔ جو اعزازات سلاطین اور بادشاہوں کی جانب سے امرا اور دوسرے لوگوں کو عطا ہوتے تھے۔ ان میں مختلف شکلوں کے نشانات بھی شامل ہوتے تھے۔ مثلاً مچھلی، چاند، تارے اور دوسرے سیارے۔

بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے بھی ہاتھیوں کے اوپر اس طرح کے نشانات اور عَلَم لے جاتے تھے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی ''سحر البیان'' میں لکھا ہے:

وہ ماہی مراتب وہ سروِ رواں
وہ نوبت کے دولھا کا جیسے سماں

کسی جدید شاعر کا شعر ہے:

بارہا فوج ستم پرور نے لوٹا تھا چمن
اب وہ سب ماہی مراتب بر ہوا، کچھ بھی نہیں

ناریل توڑنا [ی مفتوح، واو مجہول]

[یہ] دہلی کے قلعۂ معلّٰی کی شاہی بیگمات کا محاورہ ہے۔ ''عبیرِ ہندی'' میں، جس کے حوالے پچھلی اقساط بھی گزر چکے ہیں، اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

عورتیں حاملہ عورت سے ناریل تڑوایا کرتی ہیں۔ اگر ناریل اندر سے خراب نکلے تو خیال کرتی ہیں کہ لڑکا ہوگا۔ اگر ناریل اندر سے عمدہ نکلے تو خیال کرتی ہیں کہ لڑکی ہوگی۔

یہ باتیں عورتوں کی ہیں خرافات
بہو میری نہ توڑے ناریل کو

نیک[1] [یائے مجہول]

اچھے، بھلے کے معنی میں عام لفظ ہے۔لیکن برج کے علاقہ میں نیک بمعنی تھوڑا، ذرا، ذرا بھی، تھوڑی دیر، نہایت قلیل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔آگرہ کی عام بول چال میں آج تک اپنے اصل معنی میں مستعمل ہے۔

[للولال جی نے لطائف ہندی][2] مرتب کی تھی جو کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی ہے۔اس میں لکھتے ہیں:

سکھ دُکھ پرتی دن سنگ ہے میٹ سکے نہیں کوئے
جیسے چھایا دیہہ کی نیاری نیک نہوئے

ترجمہ:

سکھ دکھ ہر وقت ساتھ لگا ہے کوئی اسے مٹا نہیں سکتا
جس طرح سایہ جسم کا ذرا بھی جدا نہیں ہوتا

نیم کی مَستی[3]

بعض درختوں سے رس سا رستا ہے اور پھر جم جاتا ہے۔اسی طرح نیم کی رطوبت رِس رِس کر جم جاتی ہے، اس کو نیم کی مستی کہتے ہیں۔اس کے طبی فوائد ہیں۔غالب نے اپنے ایک خط [میں] لکھا ہے جو نادراتِ غالب مرتبہ سیّد آفاق حسین میں شائع ہوا ہے۔

"--- تم نیم کی مستی پیا کرو۔یعنی بعضا بعضا نیم رستا ہے اور اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے۔اسے نیم کی مستی کہتے ہیں۔سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشہ بڑھاتے جاؤ جب پانچ تولہ پر آ جاؤ تو تھم رک جاؤ۔"

اَبدھُوت [الف مفتوح، ب ساکن، واو معروف]

قدیم اردو کا سنسکرت الاصل لفظ ہے۔ سنسکرت میں اس کی اصل یہ ہے: اَب یا اَوْ بمعنی علیحدہ، الگ، بغیر [اور] دھوت بمعنی دور کیا ہوا۔

ابدھوت کے معنی میں علائقِ دینوی سے بے تعلق، فقیر، شیو کی پوجا کرنے والا جوگی جو ظواہر سے بے نیاز ہو کر خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے اور منشیات کا استعمال کرتا ہے کیوں کہ شیو (مہادیو) کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔

گیت کا بول ہے:

بھنگ پیے موج کرے، بنار ہے ابدھوت

ہاڑ

قدیم اردو کا لفظ اور مختلف مقامی بولیوں میں رائج ہے۔ معنی اس کے [ہیں] ہڈی، ہڈیاں، استخواں، ڈھانچہ وغیرہ۔

سودا نے اپنی ایک مشہور ہجو میں لکھا ہے:

لازم ہے کیا چھوڑنا ہر ایک ہاڑ کا
زور آوری سمجھ کے مزا اپنی داڑ کا
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

گلے کا ہاڑ

گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی، جان کا آزار، دکھ اور تکلیف کا باعث۔

ہاڑنا: (بطور فعل کے) تولنے کے وزن اور باٹوں کے درست ہونے کا امتحان کرنا۔ ترازو کے پلّوں کے برابر ہونے کی آزمائش کرنی۔

''ہاڑ'' سے ہی لفظ ''ہڑواڑ'' بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں قبرستان۔ ہڑواڑ میں ہڑ کے معنی ہڈی اور واڑ کے معنی جگہ، احاطہ وغیرہ۔

ہاڑی

کراچی میں ایک قسم کے پھیری والے آواز لگاتے ہیں: ''باٹلی[۴] والا''۔ یہ لوگ پرانی بوتلیں، خالی ڈبے، پرانے برتن اور بعض اوقات کپڑے وغیرہ بھی جمع کر کے قیمتاً لے جاتے ہیں۔ اس طرح کے پھیری والے کو ''ہاڑی'' کہتے تھے اور اسی لیے ''ہاڑی'' کے معنی کباڑیے کے بھی آتے ہیں۔ دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ انگلستان میں اس طرح کے ہاڑی گھوڑا گاڑی پر چکر لگا کر چیزیں جمع کرتے ہیں اور Rag & Bone Man (یعنی ہڈیاں اور پھٹے پُرانے کپڑے جمع کرنے والا) کہلاتے ہیں۔

ہال

''ہال'' کا لفظ بڑے کمرے کے معنی میں انگریزی کا لفظ اردو میں مستعمل ہے۔ لیکن ''ہال'' برج کے علاقے کی اردو میں ذیل کے معنی میں رائج ہے:

۱۔ جھٹکا، ہچکولہ، دھکا، حرکت۔

۲۔ تُرت، فوراً، ابھی۔

۳۔ جلدی سے، تیزی سے، بسرعت۔

نواحِ آگرہ میں آج بھی فوراً آیا، جلدی آیا وغیرہ کے معنی میں۔ ابھی ہال آیا۔ کہتے ہیں اور ہال کا لفظ دوسرے مواقع پر فوراً اور جلدی کے معنی میں مستعمل ہے۔[۵]

میر کے دیوانِ اوّل میں ہے:

جائیں ہیں فرشِ رہ تری مت ہال ہال چل
اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل

بعض لوگوں نے اس لفظ کو ہائے حطی سے حال بھی لکھا ہے۔ لیکن اصل املا اس کا ہائے ہوز سے ہال ہے۔ میر حسن نے دو جگہ لکھا ہے:

خوشی سے لیے حرمتِ جان و مال
چلے شہر کو اپنے وہ حال حال
ستاروں کی مالا گلے بیچ ڈال
وہ پہنچی پرستان میں حال حال

سہوِ کاتب سے ہال کا حال ہو گیا ہو تو تعجب نہیں۔
سودا کا شعر ہے:

ہونا ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اچھلے کہ ہال ہال چلے

ہُوش [واو معروف]

بمعنی حواس نہیں بلکہ مختلف تلفظ کے ساتھ بروزنِ مُوش بمعنی چوہا۔[ہُوش] عام اردو کا لفظ ہے[معنی ہیں] جنگلی، وحشی، خودسر، خودرائے، احمق وغیرہ۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے حضرت علامہ میکش اکبرآبادی کے حوالے سے لکھا ہے کہ میکش صاحب نے فرمایا کہ کسی طوائف تخلص عصمت کا شعر ہے:

حسیں بھی ہیں کڑے بھی ہیں مگر کچھ ہُوش ہوتے ہیں
نہایت عیب ہے عصمت یہ کابل کے پٹھانوں میں

پھر جناب عرشی نے تحریر فرمایا:

''میری[مولانا عرشی] دانست میں پشتو کے لفظ''اوش'' نے یہ چولا بدلا ہے۔جس کے معنی اونٹ کے ہیں۔ یہ جانور سیدھا سادہ ہوتا ہے مگر جب ناراض ہو جاتا ہے تو بلا کا وحشی نظر آتا ہے۔''

ہرَن گھری [گھ مضموم]

مولانا محمد حسین آزاد نے''دیوانِ ذوق''میں ایک جگہ حاشیے میں لکھا ہے:

''ہرن کُھری ایک گھاس کا نام ہے۔اس کے پتے کی شکل ہرن کے
سُم سے ملتی ہے اس لیے یہ نام پایا۔

جل جائے خاکِ وحشیِ چشمِ بتاں سے گھاس
لیکن ہرن کھری نہ رہے بے ہری ہوئے[۱]
(ذوقؔ)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشقِ چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے۔
قبر پر جو سبزہ اُگے گا جل جائے گا۔ ہاں ہرن کھری ضروری ہری
رہے گی کہ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں اور یہ آنکھوں کے عاشق
ہیں۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ نیک: اس کا اندراج قادری صاحب نے سہواً دوبارہ کر دیا ہے اور یہ ایک پچھلی قسط (۲۷) میں عبارت کے معمولی تغیر کے ساتھ موجود ہے۔تاہم ہم نے اسے یہاں بھی برقرار رکھا ہے۔

۲۔ قادری صاحب یہ الفاظ لکھنا بھول گئے ہیں۔اضافہ کیا گیا۔

۳۔ نیم کی مستی: اس کا اندراج بھی قسط ۲۷ میں موجود ہے لیکن ہم نے اسے یہاں بھی برقرار رکھا ہے۔

۴۔ باٹلی: بوتل (bottle) کے لیے کراچی میں رائج عوامی لفظ جو عموماً گجرات یا بمبئی سے ہجرت کر کے آنے والے استعمال کرتے تھے۔''باٹلی والے'' پُرانی یا ناکارہ بوتلیں بھی خریدتے تھے اور بوتل یا شیشے کا تھوک کاروبار کرنے والوں کو بیچ دیتے تھے۔

۵۔ ہال اور ہالا ڈولا: ہالنا سے ہالا اور ڈولنا سے ڈولا ہے اور ہالا ڈولا لرزش اور کپکپی کے علاوہ زلزلہ یا بھونچال کے معنی میں بھی ہے۔(بحوالہ پلیٹس)

۶۔ قادری صاحب نے پہلے مصرعے میں ''گھاس'' کی بجائے ''خاک'' لکھا ہے حالانکہ آزاد کی تشریح بھی پیش کی ہے جس میں سبزے کا ذکر ہے نہ کہ خاک کا۔ دوسرے مصرعے میں ''بن'' لکھا تھا لیکن اصل متن میں ''بے'' ہے۔ دونوں مقامات پر تصحیح کی گئی۔ (دیکھیے: کلیاتِ ذوق، مرتبہ تنویر احمد علوی، ص ۳۷۴)۔

☆……☆

(۳۰)

اُپھرنا [الف مفتوح، پھ مفتوح]

پھل اگر درخت پر زیادہ دیر لگا رہے تو اس کا مزہ بدل جاتا ہے۔ مثلاً آم میں ایک خاص قسم کی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے پھل کا یا آم کا اپھرنا کہتے ہیں۔ اس لفظ کے اور بھی معنی ہیں:

۱۔ ریاح سے پیٹ کا پھول جانا۔

۲۔ اتنا کھانا یا کھلانا کہ پیٹ پھول جائے۔

۳۔ چھک جانا، سیر ہو جانا۔

۴۔ کسی کو جی بھر کے مال یا روپیہ دے دینا۔

۵۔ مال یا روپیہ پا کر مغرور ہو جانا۔

۶۔ نخوت و غرور سے بھری ہوئی چال [چلنا][1]۔

مرزا رفیع سوداؔ کا شعر ہے:

نکلا پڑے ہے جامے سے کچھ ان دنوں رقیب
تھوڑے سے دم دلاسے میں کتنا اُپھر چلا

اُبھرنا [الف مضموم، بھ مفتوح]

معمولی لفظ ہے مگر اس کی مختلف شکلیں برصغیر کی مختلف بولیوں میں ملتی ہیں۔ بولیوں کے ان الفاظ میں تغیر و تبدل بھی ہوا ہے اور اس کے ساتھ میں معنوں میں تبدیلیاں ملتی ہیں۔ ان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مثلاً:

اُگنا : پودوں کا زمین سے اوپر نکلنا۔
اُپجنا : کونپل پھوٹنا
اُپڑنا : جڑ سے اکھڑنا
اُلہڑنا : ایک سمت جھکنا
اُسنا : اُبلنا
اُکسنا : ہلنا، حرکت کرنا
اُجھلنا : پانی کا دھار سے بہنا
اُلڑنا، اُٹھلنا : الٹ جانا
اُگھڑنا : پردہ ہٹ جانا
اُبھیانا [پوربی] : پھرنا، منھ پھیرنا
اُکلانا : بے کل ہونا

خود لفظ ابھرنا کے بہت سے مفہوم ہیں:

۱۔ جنسی بیداری پیدا ہونا۔
۲۔ جنسی خواہش کی زیادتی [ہونا]۔
۳۔ سنبھل جانا، بیماری سے اُبھار الینا۔
۴۔ بھاگنا، اُڑن چھو ہونا۔ فقرہ: دیکھو ابھرے اور پڑی۔ مطلب یہ کہ بھاگنے کا ارادہ کیا اور جوتے پڑے۔
۵۔ رخصت ہونا، دفعان ہونا۔ فقرہ: چلو ابھرو۔ کب تک بیٹھے رہو گے۔

اُبھارنا/اُبھاڑنا [الف مضموم]

۱۔ چپکے سے اُٹھالے جانا، غائب کر دینا، اچک لے جانا، چُرا لینا کے معنی میں

اُبھارنا یا ابھاڑنا آتا ہے۔ چھپکے سے قبضا لینا[۲] وغیرہ۔ اس کے [یعنی ابھارنا کے] معنی اغوا کر کے لے جانے کے بھی ہیں۔ فقرہ۔ اس کو کوئی ابھار لے گیا۔

۲۔ ورغلانا، بہلانا، پھسلانا

شوقؔ کا شعر ہے:

کسی صورت ابھار کر لاؤ
میرے گھر تک سوار کر لاؤ

۳۔ شہہ دینا، داؤں پر چڑھانا۔ فقرہ: ایک کو لڑا کر پیٹ نہیں بھرا، اب دوسری کی ابھارتی ہو!

اُتارا [الف مضموم]

برج کا لفظ قدیم اردو میں ملتا ہے۔ اس کے متعدد معنی ہیں اور دلچسپ ہیں:

۱۔ صدقہ، نذر۔ بھوت پریت اُتارنے کے لیے چاول، دال، پھول اور دیگر اشیا جو آسیب زدہ کے چاروں طرف گھما کر چوراہے پر رکھ دی جاتی ہے۔

۲۔ دریا کا گھاٹ، کنارہ جہاں مسافر [کشتی سے] چڑھتے اُترتے ہیں۔

۳۔ خراج

۴۔ جاں نثاری

۵۔ زمین جو حکومت بطورِ خوشنودی کسی کو معمولی کرائے پر دے دے۔

اُتارے کا جھونپڑا [الف مضموم]

سرائے، جہاں پر آتا جاتا مسافر ٹک سکے، مجاز اُدنیا، جسمِ انسانی۔ نظیر اکبر آبادی کا شعر ہے:

یہ تن جو ہے ہر اک کے اتارے کا جھونپڑا
اس سے ہے اب بھی سب کے سہارے کا جھونپڑا

اُترنا [الف مضموم، ت مفتوح]

اردو کا عام فعل ہے۔ محاورے اور روزمرہ میں اس کے بے شمار مستعمل معنوں کے سوا یہ بھی معنی ہیں:

۱۔ بے مزہ ہو جانا، اصل مزا کھو دینا۔ فقرہ: اچار اتر گیا۔
۲۔ غائب ہونا، ختم ہونا۔ فقرہ: گھٹا اتر گئی۔
۳۔ مر جانا۔ فقرہ: گود کا بچہ اتر گیا۔
۴۔ کسی چیز کا تہیہ کرنا، ارادہ کرنا، کام کرنا۔ فقرہ: گالیوں پر اترا۔
۵۔ مہمان یا کرایہ دار اترنا بمعنی حاملہ ہونا۔ فقرہ: مہمان اترا ہے۔

اُتارو بیٹھنا [الف مضموم، واو معروف]

آمادہ و تیار۔ فقرہ: لڑنے پر اتارو بیٹھی ہے۔

اُتارنا [الف مضموم]

اترنا سے اتارنا اور اس کے بہت معنی ہیں۔ بعض محاورے میں فحش بھی استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اتارنا: بے عزت کرنا، بمعنی پگڑی اتارنا۔
''کنجری کی چھوکری کو جو دیکھ میں نے چھینکا۔ وہ جھنجھنا کے بولی:
''سر کی اتارلوں گی۔''
ان فقروں میں تقریباً تمام الفاظ ذو معنی ہیں۔ مثلاً:
چھینکا چھینکنا سے لیکن چھینکا برتن لٹکانے کے لٹکن کو بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح جھنجھنا بمعنی کھلونا اور جھلاّنا، غصہ ہونا۔ سر کی بمعنی سر کی پگڑی

اور مہین سینٹھوں کی بنی ہوئی۔

۲۔ شرمندہ کرنا۔فقرہ: دوفقروں میں منھ اتار دیا۔

۳۔ کُھٹل کرنا، کُند کرنا۔فقرہ: چاقو کی دھار اتار دی۔

اُتارے ہونا [الف مضموم]

اوپر اتار و بیٹھنا آچکا ہے۔ دوسرا روزمرہ ہے، اتارے ہونا یعنی مستعد ہونا۔ آمادہ ہونا۔ کسی کام یا شخص یا بات کے پیچھے پڑ جانا۔ جان کی بازی لگانا۔ کسی کام کے پیچھے جاں فشانی سے پڑ جانا۔ یہ محاورہ فوج سے لیا گیا ہے جس میں گھڑ سوار دستے میدانِ جنگ میں اپنے گھوڑوں سے اتر کر پیدل اس عزم کے ساتھ لڑتے ہیں کہ یا جان دے دیں گے یا فتح یاب ہوں گے۔

چیت [یائے مجہول]

چیت کے معنی ہیں ہوشیاری، تقیظ۔ اسی سے چیتنا یعنی ہوشیار ہونا، خبردار ہونا۔ میر تقی میر کا شعر ہے:

صبح گزری شام ہونے آئی میر
تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

اَچیت [الف مفتوح، یائے مجہول]

بعض الفاظ میں نفی کے لیے الف کا اضافہ کرتے ہیں "اچیت" کے معنی ہوں گے:

ا۔ بے ہوشی، غفلت۔

۲۔ بے پروائی، بے احتیاطی، تیزی۔

فقرہ: اِیسن اچیت گھوڑا ہَنکلن کہ لڑکا بچل گیل (بھوج پوری)

ایسی بے پروائی و بد احتیاطی سے گھوڑا ہنکایا کہ لڑکا کچل گیا۔

۳۔ غافل، بے پروا، بھولنے والا۔

فقرہ: بڑا اچیت ہے، جس کام کو کہتے ہیں، بھول جاتا ہے۔

۴۔ غیر محتاط، اپنی حفاظت سے غافل، گھوڑے بیچ کر سونے والا۔

فقرہ: ایسے اچیت سوئے کہ چوری ہوگئی۔ (ماخوذ از فیلن)

اَٹاری [الف مفتوح]

کاٹھ کباڑ بھرنے کے لیے جگہ جو عموماً چھت میں بنائی جاتی ہے۔ اسے دوچھتی بھی کہتے ہیں۔ یعنی دہری چھت۔

اَٹَریا [الف مفتوح، ٹ مفتوح]

اٹاری کی تصغیر ہے۔

دمڑی کے پان پٹریا میں موری توری باتیں اٹریا میں

فیلن نے اس کہاوت کا مفہوم انگریزی ترجمے میں یہ لکھا ہے کہ ڈبے میں یا پاندان میں دمڑی کے پان ہیں اور او معشوق میری تیری باتیں اٹریا میں ہوں گی۔ میرے خیال میں فیلن کو مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی حقیری چیز بھی احتیاط سے رکھی جاتی ہے اور دوسروں کی بڑی سے بڑی بات یا چیز کی پروا نہیں کرتے۔

اَتِکا [الف مفتوح، ت مکسور]

قدیم اردو میں زیادہ کے معنی میں آتا ہے۔ زیادہ، بہت زیادہ، نامناسب بے وقت، بے موقع۔

مثال:

اَتکا بھلا نہ بولنا ، اتکی بھلی نہ چپ

اتکا بھلا نہ برسنا ، اتکی بھلی نہ دُھپ (دھوپ)

یعنی بے موقع اور زائد از ضرورت جو بات بھی ہو وہ نامناسب اور تکلیف دہ ہوتی

ہے خواہ گفتار ہو یا خاموشی۔ بارش ہو یا دھوپ بقدرِ ضرورت اور بوقتِ مناسب ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

☆......☆

حواشی

۱۔ اچھرنا: یہ مصدر ہے اور اس کی تشریح میں مصدر آنا چاہیے۔لہٰذا ''چلنا'' کا اضافہ کیا گیا۔

۲۔ قبھا لینا: قبضہ کر لینا۔قادری صاحب نے قبضہ سے ''قبھانا'' اور قبھا لینا بنالیا ہے۔اگر ''قبھانا'' کوئی مصدر ہے بھی تو عام طور پر لغات میں درج نہیں ہے۔

۳۔ پٹریا: پٹاری کی تصغیر ہے، چھوٹی پٹاری۔

☆......☆

(۳۱)

دارُو [واو معروف]

دوا کے معنی میں مؤنث ہے اور عام بول چال کا لفظ ہے۔ اسی جنس [یعنی تانیث] کے ساتھ دارو کے معنی لکڑی اور دیسی شراب کے بھی آتے ہیں۔

دارو مذکر اردو میں کم مستعمل ہے۔ اس کے معنی بارود کے ہیں۔ باوردو اور سیسہ اصطلاحاً فوجی اسلحہ اور ساز و سامان۔ نظیر اکبرآبادی نے ''سیسہ دارو'' نظم کیا ہے۔

کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا سیسہ دارو اور گولا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مولانا عرشی کی رائے میں ''دارو سیسا'' سے مراد بارود ہوتی ہے اور مفہوم میں یہ لفظ قطعی پشتو ہے۔

داما ساہی

داما ساہ نامی ایک کاروباری تھا جو دیوالیہ ہو کر مر گیا اور تمام اثاث البیت اس کا قرض خواہوں کو ان کے قرض اور مطالبات کے تناسب سے بطور حصہ رسدی تقسیم کیا گیا۔ اس وقت سے داما ساہی کے معنی ہو گئے اثاث البیت اور دیگر اثاثے فروخت کر کے قرض خواہوں کے مطالبات ادا کرنا۔ پائی پائی چکانا مگر اپنا دیوالیہ نکال کر۔

دُوال/ دُوالی [دمضموم]

اس لفظ کے کئی معنی ہیں:

۱۔ تسمہ، چمڑے کا تسمہ۔

۲۔ چمڑے کا تسمہ جس سے نقارہ بجاتے ہیں۔

۳۔ چمڑے کی پٹی، چمڑے کا لمبا ٹکڑا۔

سوداؔ نے شہر آشوب میں لکھا ہے:

بھاگے یہ عمل کر کے وہ شیطان کا لشکر
دُوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں رواں ہے

اکثر نسخوں میں دُوالی کی جگہ دیوالی لکھا ہے جو درست نہیں دُوال بند یا دوالی بند پٹے والے کو، چپراسی یا سپاہی کو بھی کہتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے:

تنخواہ نے طلب ہے نہ پینا نہ کھانا ہے
پیادے دوال بند کا پھر کیا ٹھکانا ہے

دُھونی [واو معروف]

کوئی چیز جلا کر اس کے بخارات پیدا کرنا۔ بعض عملیات میں تعویذ وغیرہ جلا کر اس کے دھویں کو مریض یا آسیب زدہ شخص پر چھوڑتے ہیں۔ لوبان، عود وغیرہ جلا کر دھواں پھیلانا بھی دُھونی کہلاتا ہے۔ دھونی صرف دھویں کے معنی میں بھی ہے۔

نہ وہ نالوں کی شورش ہے نہ وہ آہوں کی دُھونی ہے
ہوا کیا دردؔ کو پیارے گلی کیوں آج سُونی ہے
(خواجہ میر دردؔ)

دُھونی لگانی:

ضد کرنا، اصرار کرنا، اَڑنا، مطلب بر آری کے لیے بضد ہونا[1]

ٹپکنے کا نہیں ہرگز دو چار اس سے نہ جب تک ہو
مژہ پر اشکِ دود آلود نے دھونی لگائی ہے
(مرزا جان طپش)

ڈَہڈَ ہا[۲] [ڈ مفتوح، ہ ساکن، ڈ مفتوح]

برج کا لفظ اردو میں مستعمل ہے اس کے متعدد معنی ہیں:

۱۔ تر و تازہ، شاداب، ہرا بھرا۔

میر حسنؔ کی مثنوی ''سحر البیان'' میں ہے:

لگیں ملنے اس گلبدن کا بدن
ہوا ڈہڈہا آب سے وہ چمن

۲۔ رنگ کی چمک دمک، تمتماہٹ۔

سحر البیان میں ہی ہے:

ہوائے بہاری سے گل لہلہے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

ڈَہڈَ ہانا[۳] [ڈ مفتوح، ہ ساکن، ڈ مفتوح]

مولوی نور الحسن صاحب نیرؔ نے ''نور اللغات'' میں لکھا ہے:
بیشتر زرد رنگ کی خوشنمائی کے لیے ڈہڈہانا اور سبزہ زار کے لیے لہلہانا اور سرخ رنگ کے لیے چہچہانا مستعمل ہے۔
یعنی بہت ہی شوخ سرخ رنگ کے لیے کہتے ہیں چہچہاتا ہوا سرخ رنگ۔

راتنا [ت ساکن]

برج کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں سرخ [رنگ میں] رنگنا، سرخی پھیرنا، سرخ ہو

جانا، مستی کے جذبات سے آنکھوں اور گالوں پر سرخی چھا جانا۔
میر تقی میر نے دیوانِ پنجم میں لکھا ہے:

شاید شبِ مستی میں تمھاری گرم ہوئی تھیں آنکھیں کہیں
پیش از صبح جو آئے ہو تو آئے راتے ماتے تم

رضائی [ر مفتوح]

جاڑے کے استعمال کی چیز ہے۔ روئی بھرا ہوا اوڑھنے کا کپڑا جو لحاف سے نسبتاً ہلکا ہوتا ہے۔ مولوی محبوب علی رام پوری نے ''منتخب النفائس'' میں لکھا ہے:

رضائی: صاحب بہارِ عجم گوید پوششے ست معروف در ہند کہ در ایامِ زمستاں بر سر گیرند۔ ظاہراً از مخترعاتِ رضا نام شخصے کہ یائے نسبت باآں لاحق کردہ چنیں گفتہ اند۔ پس لفظِ ہندی باشد باعتبارِ استعمال۔ لہٰذا در اشعارِ اہلِ زبان ایران دیدہ نہ شد۔ بیدل گوید:

ز تشریفِ حکمت نہ کردیم عریاں
چو بیدلؔ شود پوششِ ما رضائی

ترجمہ: مصنفِ بہارِ عجم کے مطابق ہندوستان کی مشہور پوشش ہے جو جاڑے کے موسم میں سر سے اوڑھی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رضا نامی شخص کی ایجاد ہے اور آخر میں یائے نسبتی کا اضافہ کر کے بولتے ہیں۔ پس استعمال کے اعتبار سے دیسی لفظ ہے۔ لہٰذا ایران کے اہلِ زبان کے اشعار میں نہیں دیکھا گیا۔ بیدل نے جو کہا اوپر درج ہے۔

ریل [یائے مجہول]

پٹری اور ریلوے لائن اور خود ریل گاڑی کے لیے مستعمل ہے اور اسی معنی میں انگریزی لفظ ہے۔ لیکن ریل قطار، لائن، لین ڈوری کے معنی میں اردو بھی ہے۔
انشاء اللہ خان انشا کہتے ہیں:

تاک پر جا کے ان کی ریل چڑھی
کیا منڈھی کھٹملوں کی بیل چڑھی

اردو میں ریل پیل بھی مستعمل ہے۔افراط، کثرت، بہتات، زیادتی، انبوہ، بھیڑ وغیرہ۔

رِیجھنا/ریجھانا [یائے معروف]

ریجھ سے ہے جس کے معنی پسند، چاہ، خواہش، ارادہ، طلب، میلان وغیرہ۔

رِیجھ بچانا [یائے معروف]

اپنے میلانِ طبع کو چھپانا، نیت، خواہش اور ارادے کو خفیہ رکھنا دل کے اصلی خیالات کو ظاہر نہ ہونے دینا۔

ریجھ بچاؤ [یائے معروف، واوِ معروف]

وہ شخص جو اپنے اصلی خیالات اور میلانات کو ظاہر نہ ہونے دے۔ اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھنے والا۔

میر تقی میرؔ نے دیوانِ سوم میں لکھا ہے:

تمام ریجھ بچاؤ ہیں اب تو پھر پسِ مرگ
کہا کھنوں نے تو کیا عزّ اسمہٗ استادؔ

زی

عربی الاصل لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں پوشاک، وردی، شکل وصورت، فیشن، رسم، وضع قطع، شان وانداز، حیثیت وغیرہ۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے ''حیاتِ جاوید'' میں لکھا ہے:

''بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ وعلما کی زی میں رہنا اور زُہّاد

عُبّاد کی سی زندگی بسر کرنا ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو مذہبی پیشوا کہلاتے ہیں۔"

انشاء اللہ خان انشاؔ نے بھی اپنے ایک شعر میں لکھا ہے:

دیتے ہو گالیاں مجھے انصاف تو کرو
لائق تو ایسی باتوں کے بندے کی زی نہیں

☆......☆

حواشی

۱۔ دھونی لگانا: ان معنوں میں دھونی رمانا بھی آتا ہے اور معنی ہیں: کسی جگہ بیٹھ رہنا نیز سادھو کا آگ کا الاو جلا کر اس کے آگے بیٹھنا۔ (بحوالہ پلیٹس، علمی)

۲۔ ڈہڈہا: قادری صاحب نے اس کے ہجے ڈہڈھا کیے ہیں لیکن نوراللغات اور فیلن میں ہائے مخلوط (ھ) سے نہیں ہے۔

۳۔ ڈہڈہانا: یہاں بھی قادری صاحب نے ڈھڈھانا لکھا ہے۔ لیکن درست املا ڈہڈہانا ہے۔

۴۔ قادری صاحب نے اس شعر کا جو متن لکھا ہے وہ درست نہیں لہٰذا کلیاتِ میر (دیوانِ سوم) کی مدد سے تصحیح کی گئی۔ (دیکھیے: کلیاتِ میر، دیوانِ سوم، مرتبہ کلبِ علی خاں فائق، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۹۰)۔ لیکن فائق نے حاشیے میں لکھا ہے کہ ایک نسخے میں "استاذ" کی بجائے "اُستاد" بھی ہے۔

☆......☆

(۳۲)

خَیش [یائے لین]

مولوی عبدالباری آسی لکھنوی مشہور عالم اور زباں داں تھے۔ نول کشور کے مطبع واقع لکھنؤ سے متعلق تھے اور فارسی اردو کی اکثر کتابیں ان کی تصحیح کردہ ہیں۔ ''اربع عناصر'' کے نام سے ایک کتاب نول کشور پریس سے شائع کی تھی۔ اسی کے سرورق پر لکھا ہے: ''بتصحیح علمائے مطبع'' مولانا عبدالباری آسی کے حاشیے اس کتاب میں جا بجا ہیں۔ ''اربع عناصر'' مولوی محمد علی صاحب غیاث پوری کی تالیف ہے۔ مولانا عبدالباری آسی کا ایک حاشیہ دلچسپ ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

> ''مصنف [مولوی محمد علی غیاث پوری] نے لکھا ہے کہ خیش بفتح [1]، انگریزی پنکھا ہے۔ انگریزی پنکھا غلط ہے۔ بلکہ اس پنکھے کو کہتے ہیں جو عام طور پر کپڑے کی جھالر ایک لکڑی میں باندھ کر کھینچتے ہیں۔ پنکھا انگریزی نہیں بلکہ ہارون الرشید کی ایجاد ہے۔ اس طرح سے ایجاد ہوا کہ ایک روز ہارون الرشید دوپہر کی گرمی میں اپنی بہن عُلیہ مہدی کی لڑکی کے ہاں آیا۔ اس کے ہاں صندل اور اگر وغیرہ میں کچھ کپڑے رنگوا کر ایک لکڑی پر پڑے ہوئے سوکھ رہے تھے۔ ہارون الرشید ان کے نیچے بیٹھا۔ ہوا کے زور سے جو کپڑے ہلے ہارون الرشید کے دماغ میں خوشبودار ہوا پہنچی اور گرمی کی تکلیف کم ہوئی۔ ہارون الرشید نے فوراً حکم دیا کہ ہمارے لیے ایک اسی قسم کا پنکھا بنایا جائے۔ مطلق

پنکھے کو عربی میں مروحہ کہتے ہیں۔"

خَفا [خ مفتوح]

پلیٹس نے خفا بمعنی غصہ، خفگی، ناراضگی کو سنسکرت الاصل بتایا ہے اور قدیم فارسی بھی کہا ہے۔ لیکن یہ عربی الاصل لفظ ہے۔ اصل معنی کم ہونے، کھٹنے، چھپنے، پوشیدہ ہونے کے ہیں [نیز] کم ہونا، گھٹنا، گھٹنا۔

کم ہونے کے معنی میں میر حسن نے "مثنوی سحر البیان" میں لکھا ہے:

اندھیرے نے اس کا کیا دم خفا
کہ جوں لے سیاہی کسی کو دبا
قلق واں جو گزرا تو یاں غم ہوا
رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا

ناخوشی و ناراضی کے معنی میں مومن خاں کا شعر ہے:

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

شعر میں لفظ کی خوبی یہ بھی ہے کہ خفا کے اصل معنوں میں دم رکنا اور گھٹنا بھی شامل ہے۔

خَر [خ مفتوح]

بمعنی گدھا معروف لفظ ہے۔ لیکن "خر" کے معنی "بڑے" کے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً خرگوش میں جو "خر" ہے اس کے معنی بڑے کے ہیں، بڑے کان والا۔ شاہی خیمے شاندار اور بڑے ہوتے تھے، انھیں خرگاہ کہتے تھے۔ کیکڑا بڑے پھیلے ہوئے پنجے یا چنگل سے مشابہ ہوتا ہے۔ اسے "خرچنگ" کہتے ہیں۔ لیکن "خر" کے معنی گدھا اور اس سے مجازی طور پر احمق بے وقوف اور ادنیٰ، ذلیل اور کمین پیشہ کو بھی کہنے لگے۔

میر حسن نے ''مثنوی سحر البیان'' میں لکھا ہے:

طویلے کے اس کے جو ادنیٰ تھے خر
انھیں نعل بندی میں ملتا تھا زر

خر دماغ:

بد تمیز، بے ہودہ۔ مغرور اور خود پسند آدمی کو بھی کہتے ہیں۔

خر خاوند:

خاوند بمعنی مالک، آقا، حاکم۔ گدھا آدمی جو افسر بن جائے اسے خر خاوند طنزاً کہتے ہیں۔ خودسر حاکم۔ [کذا] ؎

خرمستا:

گدھے کی سی زیادہ جنسی طلب رکھنے والا۔

چھیجنا [یائے معروف]

اس کے بہت سے معنی ہیں، گھٹنا، چھُٹنا، کم ہونا، رہ جانا۔ کسی چیز کا اٹھانے، رکھنے، تولنے، بٹنے، کاتنے، چھاننے، پیسنے وغیرہ میں اصل مقدار سے کم ہو جانا۔ اس طرح سے جو کمی واقع ہو اسے چھیجن کہتے ہیں اور اس کا حق پسائی، دَلائی وغیرہ میں چھوڑ دیتے ہیں۔

''توبۃ النصوح'' میں ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا ہے:

''اب سے دو ر ایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھیجنے لگے۔''

کہاوت ہے: دیکھا دیکھی کیجیے جوگ، چھیجے کایا باڑھے روگ

یعنی بغیر حکیم یا وید کے مشورے کے دوسروں کی دیکھا دیکھی یوگا شروع کرنے کا نتیجہ الٹا ہوتا ہے یعنی جسم (کایا) گھٹنے لگتا ہے اور بیماری روگ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

چہرہ

منھ کو تو کہتے ہی ہیں لیکن اس کے مفہوم میں حال، کیفیت، سامنے کا حصہ، آغاز، ابتدا اور تمہید وغیرہ بھی شامل ہے۔

قدیم متصدی گری[۴] میں چہرے پر مشتمل کچھ اصطلاحات بھی رائج تھیں۔

چہرہ لکھنا:

کسی کا حلیہ لکھنا، درجِ فہرست کرنا، نوکروں میں شامل کرنا۔

چہرہ ہونا:

ملازم ہونا، فہرست میں درج ہونا۔

چہرہ نویسی:

حلیہ لکھنا۔ شاہی زمانے میں ملازمینِ سرکار کا حلیہ بھی درج کیا جاتا تھا تاکہ شناخت ہو سکے۔ آج کل اس کی جگہ فوٹو چپکانے کا رواج ہے۔

نظیر اکبر آبادی کا شعر ہے۔

یا لے کے اک قلم داں اور رکھ قلم کو سر پر
جوڑے حساب لاکھوں چہرے لکھے سراسر

چَلَن ہار [چ مفتوح، ل مفتوح]

چلنے ہار، مراد ہے چلنے کے لیے تیار، آمادۂ سفر، پا در رکاب۔

چند گھڑی نکلنے والا، جلدی چلا جانے والا، مرنے کے لیے تیار۔ مولوی نور الحسن صاحب نیرؔ نے ''نور اللغات'' میں لکھا ہے کہ یہ محاورۂ اہلِ ہنود [کذا][۵] ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی قصہ نہیں۔ میر تقی میرؔ نے دیوانِ اوّل میں لکھا ہے۔

آج کل بے قرار ہم بھی ہیں
بیٹھ جا چلنے ہار ہم بھی ہیں

چَل [چ مفتوح]

چل کے معنی رخصت، افتراق، جدائی، چل چلاؤ وغیرہ ہیں۔
مرزا جان طپش لکھتے ہیں:

چل بسے صبر و قرار و طاقت و تاب و تواں
چلتے ہی تیرے سبھوں میں یک بیک چل پڑ گئی

ایک معنی چل کے فرق، اختلاف، حقیقت سے انحراف کے بھی ہیں۔
میر تقی میر کا شعر ہے:

آوارہ میرے ہونے کا باعث وہ زلف ہے
کافر ہوں اس میں ہووے اگر ایک بال چل

چکلہ [چ مفتوح، ک ساکن]

چکلہ بیلن یعنی روٹی بیلنے کے لیے لکڑی کا گول تختے کو بھی کہتے ہیں لیکن اور معنی بھی ہیں۔ طوائفوں کے محلے کو بھی چکلہ کہتے ہیں۔ ایک قسم کے کپڑے کو بھی چکلہ کہتے ہیں جو سوت اور ریشم کو ملا کر بنایا جاتا ہے۔ شاہی زمانے میں ملک کے ایک انتظامی علاقے کو بھی چکلہ کہتے تھے اور کئی پرگنوں پر مشتمل صوبہ بھی چکلہ کہلاتا تھا۔ اس لیے صوبے کے گورنر کو چکلہ دار کہتے تھے اور گورنری یا صوبے کی نظامت چکلہ داری کہلاتی تھی۔

چُکائی [چ مضموم]

اردو لفظ دھوکا فریب کے معنی میں مرزا جان طپش نے ''شمس البیان'' میں لکھا ہے:
بمعنی نظرِ غلط کردن است۔ وبیشتر عام استعمال کنند۔ میر فرزند علی موزوں گوید:

چُکائی دے کے چترائی سے جانا کیا قیامت ہے
نگاہیں جس طرف لڑتی ہیں تیری ہم نے اٹکلیاں

اٹکلیاں: بمعنی ہم نے اٹکل سے، اندازے سے معلوم کرلیا۔

حواشی

۱۔ خیش: اشٹین گاس کے مطابق خَیش (بیائے لین) ایک کھردرا سُوتی کپڑا ہے اوراس نے اس کا ایک مترادف ''کینوس'' (canvas) بھی دیا ہے۔ جبکہ اس کے نزدیک خیش (بیائے مجہول) ایک سوتی کپڑا ہے اور اس نے اس کے دیگر معنی بھی دیے ہیں۔ جبکہ اردو لغت بورڈ نے اشٹین گاس اور جامع اللغات کے حوالے سے اسے بیائے لین لکھا ہے اور معنی دیے ہیں ''ایک موٹا اور کھردرا کپڑا، ٹاٹ''۔ لیکن اردو میں شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ البتہ اس کے معنی ''پنکھا'' لکھنا بغیر کسی دلیل یا سند کے ہے۔

۲۔ خراور خرگاہ: ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مطابق بعض مرکبات میں ''خر'' نہ تو گدھا کے معنی میں ہے اور نہ ''بڑا'' کے معنی ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ خرگاہ میں بھی ''خر'' بڑے کے معنی میں نہیں ہے اور یہ ترکیب درست بھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ عربی کے فرّہ یا خرہ کی ایک صورت ہے جس کے معنی ہیں شوکت، جاہ و جلال، فر۔ اس طرح خرگاہ کے معنی ہوں گے فر و شوکت جگہ۔ (دیکھیے۔ وضع اصطلاحات پر تبصرہ، مشمولہ وضع اصطلاحات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۷ء، ص ۳۸، اشاعتِ ہفتم)۔ لیکن غیاث اللغات کے مطابق یہ خِر (خ مکسور) ہے اور اس کے معنی ہیں خوشی اور اس لیے خِرگاہ کا مطلب ہے خوشی کی جگہ جو خیمے کو بھی کہتے ہیں۔ صاحبِ غیاث نے اس سلسلے میں بعض لغات کے حوالے دیے ہیں اور خر کے دیگر معنی (بشمول بڑا) بھی دیے ہیں (غیاث اللغات، کراچی: ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، سن ندارد)۔

۳۔ خرخاوند: قادری صاحب نے خرخاوند کے جو معنی لکھے ہیں وہ مشکوک ہیں اور انھوں نے کوئی سند/حوالہ بھی نہیں دیا۔ اُردو لغت بورڈ کی لغت کے مطابق خرخاوند کے معنی ہیں گدھے کا مالک اور یہ حقارتاً آتا ہے۔ بورڈ نے ۱۷۸۰ء کی ایک سند بھی دی ہے جس سے بظاہر یہ معنی درست معلوم ہوتے ہیں۔

۴۔ متصدّی: یعنی کلرک یا منشی۔ متصدی گری یعنی کلرکی، منشی گیری۔

۵۔ اہلِ ہنود: ہنود کہنا کافی ہے۔ یہاں اہل اِضافی ہے۔

☆……☆

(۳۳)

چَپّن/چَپنی [چ مفتوح، پ مشدد، چ مفتوح]

پرانے زمانے میں پکانے کے لیے مٹی کی ہنڈیاں ہوتی تھیں۔ اب بھی قصبات میں بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ دال، کڑھی، ساگ، بعض دوسرے اور کھانوں کے لیے دھات کی جگہ مٹی کی ہانڈی کو ہی ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کا ڈھکنا بھی مٹی کا ہی ہوتا ہے اور اس کو چپّن کہتے ہیں۔ چھوٹی ہانڈی کو ہنڈیا اور اس کے ڈھکنے کو چپنی کہا جاتا ہے۔ اس سے بعض محاورے بھی نکلے ہیں:

چَپنی چاٹ کر گُزارا کرنا [چ مفتوح]

کم سے کم پر قناعت کرنا۔ جو بھی میسر آ جائے اسی پر صبر کرنا۔
مرزا جان طپش نے ''شمس البیان'' میں لکھا ہے:
''کنایہ از کمالِ قناعت و ایں نیز مستعملِ عوامِ بازار است۔''
سوداؔ نے لکھا ہے:

باپ کے گھر کی چاٹ کر چپنی
کرو گزران یارو تم اپنی

اکثر نسخوں میں اس شعر میں چپنی کی جگہ چٹنی کا لفظ ملتا ہے جو سہوِ کاتب معلوم ہوتا ہے۔ سوداؔ نے یہی خاص محاورہ ''چپنی چاٹ کر گزارہ کرنا'' لکھا ہے۔

چام کے دام چلانا

چام کے معنی ہیں چمڑا، کھال وغیرہ۔ محاورہ ہے چام کے دام چلانا مراد ہوتی ہے

جوتے کے زور سے کام لینا، زور زبردستی کرنا، عارضی اختیار کے بل پر شدت وقوت کا مظاہرہ کرنا۔

کہا جاتا ہے کہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر اپنی جان بچا کر بھاگا تو بیچ میں گہرا دریا پڑ گیا جس کو پار کرنے کا انتظام نہ تھا۔ ایک سقے نے اپنی مشک ہوا بھر کر پھلائی اور ہمایوں اس مشک کے سہارے دریا پار کر کے محفوظ جگہ پہنچ گیا۔ جب دوبارہ سلطنت قائم ہوئی اور اقتدار و دربار قائم ہوا تو سقے کو بلایا۔ اس کا نام نظام تھا۔ اس خدمت کے صلے میں کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ نظام سقے نے ایک دن بادشاہی کرنے کا انعام طلب کیا۔ ہمایوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ نظام سقہ ایک دن کے لیے سلطنتِ مغلیہ کا بادشاہ بنا۔ دربار لگا۔ امراء نے نذریں پیش کیں۔ نظام سقے نے اپنے اعزہ، اقربا اور احباب کو خوب نوازا اور جس مشک کے ذریعے ہمایوں نے دریا پار کیا تھا اس چمڑے کو چھوٹے چھوٹے سکے بنوائے جن کے بیچ میں سونے کی کیل تھی تو چام کے دام چلانے کے معنی ہیں چمڑے کا سکہ جاری کرنا۔

ڈھائی دن کی بادشاہی/ایک دن کی بادشاہی

کہتے ہیں کہ نظام سقے نے ڈھائی دن بادشاہت کی تھی۔ اس لیے ڈھائی دن کی بادشاہی یا ایک دن کی بادشاہی عارضی اقتدار اور بے بنیاد حکومت کو بھی کہتے ہیں۔ طاقت و قوت، شان و شوکت کا مظاہرہ جو بالکل ہی عارضی اور بے بنیاد و ناپائیدار ہو۔

جَلیب [ج مفتوح، یاے مجہول]

Platts نے اس کی تشریح میں اس لفظ کو ہندی یا ہندوستانی بتایا ہے جو غلط ہے۔[1] یہ لفظ بغیر کسی تغیر و تبدل کے عربی ہے اور اس کے معنی ہیں: باہر سے لایا ہوا غلام، اردو میں غلام، نوکر چاکر، خادم، ساز و سامان، نواحی علاقے کے معنی بھی آتے ہیں۔

نظیر اکبر آبادی نے لکھا ہے:

یا لے صراحی حُقہ، دوڑے جلیب اندر
جب آ اجل پکاری، صاحب رہا نہ نوکر

جمکنا [ج مفتوح، م مفتوح]

اردو کا قدیم فعل ہے جو اب متروک ہو گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں کامیاب ہونا، جمنا، چمکنا، چل نکلنا، رنگ پر آنا وغیرہ۔ بعض محاوروں میں اس طرح استعمال ہوا ہے:

دکان جمکی : خرید و فروخت شروع ہوئی۔

لڑائی جمکی . لڑائی شروع ہوئی۔ مقابلہ ہوا۔

مجلس جمکی : مجلس رنگ پر آئی۔ محفل بھر گئی۔

مقدمہ جمکا: مقدمے کی پیروی شروع ہوئی۔

(ماخوذ از لغت ٹیلر۔ ہنٹر ۱۸۰۸ء)

ڈلک/ڈھلک [ڈ مفتوح/ ڈھ مفتوح، ل مفتوح]

چمک دمک، آب و تاب، رنگ و رونق کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا تھا۔

نظیر اکبر آبادی کے ایک خمسہ میں ہے:

قمر خجل ہوا خوں کی تھلک نہ دیکھ سکا
سنہرے رنگ کی کندن ڈلک نہ دیکھ سکا
گہر بھی لب کے بجن کی ڈھلک نہ دیکھ سکا
ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا

ڈلک کے ایک معنی ناہمواری، سلوٹ، شکن، چُنٹ بھی ہیں۔ ''سحر البیان'' میں میر حسن کے ہاں ہے:

ڈلک سرخ نیفے کی ابھری ہوئی
گلابی سی گرد ایک تہہ دی ہوئی

دوسرے معنی ''ڈلک'' کے ہیں وہ نقص جو کسی شفاف شے میں دکھائی دے۔ مثلاً

ہیرے وغیرہ میں بال سا یا لہر سی۔

رشک لکھنوی کا شعر ہے:

دُرِّ نجف میں بال ہے الماس میں ڈلک
تیرے صفائے ساعد و بازو کے سامنے

ڈانک [نون غنہ]

برج، کھڑی بولی وغیرہ دیگر مقامی بولیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔رنگین چمکدار ورق جو نگینے وغیرہ کے نیچے اس لیے رکھتے ہیں کہ چمک دمک پیدا ہو۔کپڑے کے نیچے بھی آب وتاب اور جگمگاہٹ پیدا کرنے کے لیے لگاتے ہیں۔

''سحرالبیان'' میں میر حسن لکھتے ہیں:

وہ پشواز اک ڈانک کی جگمگی
ستاروں کی تھی آنکھ جس پر لگی

امیر مینائی کا شعر ہے:

ساقیا دُردِ مئے ناب نہیں بیٹھ گئی
شربتی ڈانک تھی یہ زیرِ نگیں بیٹھ گئی

ڈانک مؤنث ہے لیکن آتش لکھنوی نے اسے مذکر بھی باندھا ہے۔اس کو آتش کا تصرف سمجھنا چاہیے نہ کہ سند۔

اڑایا پان کی تحریر نے اور ان کے دانتوں نے
نگیں کا رنگ چمکا دے مقرر ڈانک کندن کا

چنَوتی [چ مکسور، واو لین]

چیلنج انگریزی کا لفظ ہے اور اردو میں اس کثرت سے مستعمل ہے کہ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ جیسے اردو میں اپنا کوئی لفظ اس مفہوم کا نہیں ہے۔ایک دوسرا لفظ اسی مفہوم میں چنوتی دینا یا چنوتی لینا چیلنج کرنے یا دینے کے معنی میں مستعمل ہے۔

ہُدّ ائدّی کرنا [ہ مضموم، د مشدد، ت مضموم، د مشدد]

اسی مفہوم کا ایک پرانا فعل ہے ہُدّ ائدّی کرنا۔معنی ہیں اس کے للکارنا، باہمی جھگڑا کرنا، ایک دوسرے کو دھمکانا۔Platts نے اس کو پراکرت اور پھر سنسکرت لفظ سے ماخوذ بتایا ہے۔[ہو-تی +ک] لیکن یہ قیاس سراسر غلط ہے۔یہ عربی لفظ سے ماخوذ ہے۔ہدَّ دَ، تہدَّ دَ۔اس کے معنی ہیں دھمکی دینا اور خوف دلانا۔انگریزی لفظ چیلنج کے عمل دخل سے پہلے اردو میں تہدّی کرنا عام طور پر رائج تھا اور اس کے معنی ''چیلنج کرنا'' ہیں۔

ہَتھیا [ہ مفتوح، تھ کسرۂ مجہول]

برج کا دلچسپ لفظ ہے اردو میں اس کے معنی دھواں دھار مینھ، زبردست بارش۔

''نوراللغات'' نے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

''بارش کے چندروز جن میں خوب بارش ہوتی ہے۔''

قدؔر کا شعر ہے:

آگے ان پریوں کے دیکھو تو کئی دیوِ سیاہ
سب یہ ہاتھی ہیں کہ ہَتھِیا کا اٹھا ہے بادل

''منتخب النفائس'' مطبوعہ کان پور ۱۲۸۵ھ میں درج ہے:

ہَتھِیا : فیلِ باراں۔کلیم گوید:

شدے فیل از تیر لرزاں چناں
کہ از فیلِ باراں برہنہ تناں

ہَتھنال [ہ مفتوح، تھ ساکن]

ہاتھی کا ذکر ہے تو ہتھنال کا بھی ذکر ہو جائے۔یہ لفظ ہاتھی اور نال سے بنا ہے اور

اس چھوٹی توپ کو کہتے ہیں جسے ہاتھی پر لے جائیں۔

☆......☆

حاشیہ

ا۔ جلیب: قادری صاحب کا خیال درست ہے کہ یہ عربی کا لفظ ہے۔ خود پلیٹس نے بھی اسے ''جِلَو'' کا بگاڑ بتایا ہے اور اس سے رجوع بھی کرایا ہے۔ اگر پلیٹس کی لغت میں ''جلو'' کو دیکھیے تو لکھا ہے کہ اس کا تلفظ ''جَلَو'' (ج مفتوح، واو لین) ہے اور ''جِلَو'' (ج مکسور) کو گنوارو تلفظ کہا ہے۔ پھر اسے فارسی کے جَلَوْ اور عربی کے ''جلو'' سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن اس لفظ کی اصل کے لیے اس نے ''ایچ'' (H) لکھا ہے جو اس کے اپنے پیش لفظ کے مطابق ''ہندوستانی یا ہندی'' کا مخفف ہے۔ پلیٹس کے ہاں یہ رجحان تو ہے کہ وہ ہر لفظ کا اشتقاق زبردستی سنسکرت / پراکرت / ہندی سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں اس نے جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن تعجب ہے کہ جب وہ ''جِلو'' (ج مکسور سے) کو گنوارو تلفظ سمجھتا ہے اور ''جَلَو'' (ج مفتوح) کو درست تلفظ خیال کرتا ہے تو رجوع کراتے ہوئے ج مکسور سے ''جِلو'' کیوں لکھتا ہے؟

☆......☆

(۴۴)

اَردَھنگی [الف مفتوح، رساکن، دھ مفتوح]

اس لفظ کی اصل سنسکرت ہے۔ اَرْدَھ بمعنی نصف اور اَنگ بمعنی جسم۔ دونوں سے مل کر اردھنگی تراشا گیا۔ معنی ہیں نصفِ بہتر، رفیقۂ حیات، بیوی۔

لال داس کا ایک دوہا مزے کا ہے، لکھتا ہے:

باندر اک نِساچری لایو کری اپنی اردھنگی
لال داس رگھوناتھ دیا سے اُتپن بھیئے پھرنگی

ترجمہ: ایک بندر رات میں گھومنے والی چڑیل کو لایا اور اسے اپنی بیوی بنایا۔ اے لال داس! رگھوناتھ کی مہربانی سے پھر فرنگی نسل پیدا ہوئی۔

ہندوؤں میں روایت ہے کہ جب بندروں کی فوج کی مدد سے رام چندر جی نے راون پر فتح پائی تو بندروں کو دعا دی کہ کل جگ میں تمھارا راج ہو [یہ گویا فرنگیوں کے راج کی طرف اشارہ ہے]۔

دوسرے معنی اردھنگی کے ہیں شوخ چشم عورت:

اک نار دیکھی اردھنگی رکھے ٹانگیں آدھی ننگی
جو دھوبن کرتی ہے کام سو ہی واتریا کا نام

یہ پہیلی ہے اور اس کی بُوجھ ہے دھوتی۔ اس کا اشارہ دوسرے بول میں ہے۔[1]

بالائمہ

شیروانی تو ہمارا قومی لباس ہے۔ لیکن اس کی یہ شکل بہت تراش خراش کے بعد

پیدا ہوئی ہے۔شیروانی کا سفر بالابر سے شروع ہوا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے گزشتہ لکھنؤ میں یہ معلومات فراہم کی ہیں:

''بالابر: دربارِ مغلیہ کے امرا کے لباس کا ایک حصہ۔ ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے ''بالابر'' ایجاد ہوا۔ جس میں گول گریباں بالکل کھلا رہتا۔ اس لیے کہ سینے کو ڈھانکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اس کے نیچے پہنا جاتا تھا۔ اس میں جامے کی سی چنٹیں نہیں ہوتی تھیں اور نہ گھیر ہوتا تھا۔ آگے کے دامن کو سامنے سے کھلنے سے بچانے کی غرض سے داہنے دامن میں ایک چوڑی کلی لگادی جاتی۔ ''بالابر'' بھی دہلی کی ایجاد ہے۔''

چپکن [چ مفتوح، پ ساکن، ک مفتوح]

دوسرا قیام چپکن تھا۔ اہلِ لکھنؤ نے بالابر میں ترمیم کر کے چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد کی۔ اس میں ویسا ہی گول گریباں رکھا گیا اور اس میں انگرکھے کی طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا۔ مگر اسے داہنی جانب قوس نما صورت میں بٹنوں سے اٹکا دیا جاتا۔ اس میں داہنی جانب گلے کے پاس سے بٹنوں کی ایک خوش نما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی (سینے کی ہڈی) تک آتی اور اس کے مقابل دوسری جانب کی قوس کو اصلی قبا میں سی دیا جاتا۔ اس میں بھی بالابر کی طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی جو بغل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکادی جاتی۔ یہ چپکن جو شال یا بھاری کپڑے کی ہوتی جاڑوں کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ انگریزوں نے ایک مدت تک اپنے ملازمین کو یہی لباس پہنایا۔

اچکن [الف مفتوح، چ ساکن، ک مفتوح]

لکھنؤ میں چپکن اور انگرکھے کو ترتیب دے کر اچکن ایجاد کی گئی۔ اس میں انگرکھے اور چپکن کا سا گریباں قائم رکھا گیا جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا آدھا دونوں

جانب سی دیا جاتا اور سلائی کی جگہ پر سنجافی گوٹ کے ذریعے گریبان کی گولائی اور قطع برقرار رکھی جاتی۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کر سیدھا کوڑی (سینے کی ہڈی) تک آتا بوتام لگادیے جاتے۔ کلی جو بالابر میں اوپر لگائی گئی تھی اس میں نیچی کردی گئی تا کہ دامن نہ کھلیں۔ اچکن کے نیچے کا حصہ بالکل چپکن اور انگرکھلے کی طرح کا ہوتا۔

جامہ

دربارِ مغلیہ کے امرا کے لباس کا ایک حصہ جو عجمی قبا میں ترمیم کرکے بنایا گیا تھا۔ اس میں گریباں نہ ہوتا تھا بلکہ دونوں جانب کے کنارے جو پردہ کہلاتے ترچھے ایک دوسرے پر آکر سینے کو ڈھانک لیتے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اسی طرح کھلا رہتا ہے جیسے مغربی کوٹوں میں کھلا رہتا۔ جس طرح قمیص سینے کے اوپر والے حصے کو چھپاتی ہے اسی طرح نیمہ اس کو ڈھانکے رہتا۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا ہے، نیچے رہتا اور داہنے پہلو پر بندوں سے باندھا جاتا اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا جو اوپر بائیں پہلو میں باندھا جاتا پھر اس میں کمر کے پاس دامنوں کے بدلے لہنگا سا جوڑ دیا جاتا جو ٹخنوں کے اوپر تک لٹکتا رہتا۔ اس میں بہت سی چُنٹیں دی جاتیں اور اس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جامے کی آستین آدھی کلائی تک بے سلی اور کھلی رہتیں اور دونوں جانب لٹکا کرتیں۔

شیروانی [ی مجہول]

اچکن میں ترمیم کرکے شیروانی ایجاد ہوئی۔ اس میں آستینیں انگریزی کوٹ کی طرح بنائی گئیں۔ گریباں جو گوٹ لگا کر نمایاں کیا جاتا تھا، نکال دیا گیا۔ دامن کی وضع بھی بدل گئی اور موجودہ لباس شیروانی جو برصغیر کے مسلمانوں کا لباس ہے، وجود میں آیا۔

ضِلع [ض مکسور]

علم وادب میں ایک طرح کی رعایتِ لفظی، ذو معنی بات، ضلع جگت، پہلو دار

بات بولنا یا کہنا۔ علامہ نظم طباطبائی نے شرحِ غالب میں لکھا:

''اس زمانے کی شاعری میں رعایت کو بھی صنعت سمجھتے ہیں اور رعایت اسے کہتے ہیں کہ ایک لفظ ایسا استعمال کریں جسے کسی اور لفظ کے ساتھ کچھ تعلق اور مناسبت محض لفظی ہو جیسے اس شعر میں:

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

لفظ یک قلم معنی کے اعتبار سے ''سرتاسر'' کے معنی پر ہے۔ لیکن لفظ کے اعتبار سے قلم کو صفحہ سے ایک تعلق ہے۔ یا جیسے سید امانت کا یہ شعر:

عاشق کو زہر غیر کو مصری کی ہو ڈلی
اس طرح کی نبات زباں سے نکالیے

کہ ''نہ بات نکالیے'' اس مطلب کے لیے ہے کہ بات نہ نکالیے اور نبات اور مصری کو بہ اعتبار لفظ باہم دیگر تعلق و تناسب ہے۔ غرض کہ اس میں شک نہیں کہ اسے رعایت کہیں یا ضلع کہیں، بعض بعض مقام میں یہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس میں اس قدر افراط و تفریط کو دخل دے دیا ہے کہ اس ضلعے کے خیال سے حسنِ معنی و سلاستِ الفاظ تک کا خیال نہیں رکھتے جیسے امانت نے ایک مرثیہ میں کہا ہے:

شامی کباب ہو کے پسندِ اجل ہوئے [شامی کباب اور پسندے]

اس سبب سے فصحا کو اب اپنے کام میں ضلع بولنے سے کراہیت آ گئی ہے اور بے شبہ قابلِ ترک ہے کہ یہ بازاریوں کی نکالی ہوئی صنعت ہے۔ اہلِ ادب نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ شہر کے لَوَنڈے[۲] جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ضلع بولتے ہیں۔ ایک کہتا ہے تمھاری چکنی چکنی باتوں نے چھالیا (یعنی چکنی ڈلی[۳] اور چھالیا) دوسرا جواب دیتا

ہے: ''میں یار کدتھا۔'' یعنی کتھا۔ وہ کہتا ہے: ''آنکھ پر پنجہ رکھ کر
کیوں بات کرتے ہو۔'' یہ پنجے کی رعایت سے جواب دیتا ہے کہ
''مت ٹوک رے''۔ یعنی جھاڑو، پنجہ اور ٹوکرا۔''

طیُور وں [طٗ مضموم، واو معروف]

طیور طائر کی جمع ہے بمعنی پرندہ، اڑنے والا، پروں والا۔ طیوروں اردو قاعدے کے مطابق جمع کی جمع ہوگئی اور یہ غیر فصیح اور غریب ہے۔ سوائے ایک دو کے اور کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن نہایت فصیح اور اہلِ زبان شاعر نے لکھا ہے۔ میر حسن اپنی مثنوی ''سحرالبیان'' میں لکھتے ہیں:

وحوش و طیوروں تلک بے خلل
پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

قول [واوِ مجہول]

بروزنِ بول[۱] بمعنی کہہ۔ اصل میں ترکی کا لفظ ہے۔ سوؔدا کے زمانے تک خوب مستعمل تھا۔ اس کے کئی معنی ہیں: بازو، دستہ، تیاری کرنے والا، مستعدی سے آگے بڑھنے والا، لینے والا، فوج کا دستہ، فوجی گروہ، جماعت، پارٹی۔ ایک طرح کا قُرق امین یا قرق امین کا ماتحت سپاہی۔

ویرانی شاہ جہاں آباد میں سوؔدا نے لکھا ہے:

گھروں کی ضبطی کا رسم اس قدر ہوا ہے عام
ادھر کسی کا دکھا سر اُدھر سے دوڑے قول

☆.....☆

حواشی

۱۔ دھوتی: چونکہ دھوبن کا کام دھونا ہے یعنی وہ ''دھوتی'' ہے لہٰذا لباس ''دھوتی'' کی طرف اشارہ ہو

جاتا ہے۔

۲۔ لَوَند (ل مفتوح، واو مفتوح، ن ساکن): اوباش، شُہدے، آوارہ۔ اشٹین گاس کے مطابق فارسی کا لفظ ہے اور مختلف معنوں میں آتا ہے۔ مگر یہاں بدمعاش، آوارہ وغیرہ کے معنوں میں ہے۔

۳۔ چکنی ڈلی: ایک قسم کی سُپاری یا چھالیا جس کو دودھ میں ابال کر خشک کر لیا جاتا تھا۔ غالب نے بھی چکنی ڈلی پر ایک قطعہ کہا ہے اور الطاف حسین حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ غالب نے یہ قطعہ برجستہ کہا تھا۔

۴۔ قول: بواوِ مجہول ہے۔ یاد رہے کہ قَول بواوِ لین الگ لفظ ہے جو عربی ہے اور ''بات'' یا ''وعدہ و قرار'' کے معنی میں ہے۔ لیکن اشٹین گاس قول بواوِ مجہول کو ترکی لفظ نہیں سمجھتا اور اس نے اس کے لیے ایم (M) استعمال کیا ہے جو اس کی لغت کے دیباچے کے مطابق منگولین (Mangolian) کی علامت ہے۔

☆……☆

(۳۵)

طَرَف [ط مفتوح، ر مفتوح]

اردو کا عام لفظ ہے، اس کے کئی معنی ہیں:

۱۔ سمت، جانب، کنارہ، حد۔

۲۔ ہم پیشہ، مدِ مقابل۔

۳۔ حریف، دشمن۔

طرف ہونا:

مقابل ہونا، ہم پلہ ہونا، برابری کرنا۔

میر تقی میرؔ نے ایک غزل لکھی جس کی ردیف ''طرف'' ہے۔ سوداؔ نے اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں ایک غزل لکھی۔ کہتے وقت میرؔ کی غزل پیشِ نظر تھی۔ مقطع میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا اور میرؔ کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا۔ ان کو استاد کے لقب سے یاد کیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سوداؔ بڑے دبنگ اور تنک مزاج آدمی تھے۔ کسی ایسے ویسے کو مشکل سے ہی خاطر میں لاتے اور ان کا قلم دان ہجو یات کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ تو سوداؔ کا مقطع ہے:

سوداؔ تُو اس زمیں میں غزل در غزل ہی کہہ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طَرَف

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس شعر میں میرؔ کی استادی کا اعتراف ہے اور لب و لہجہ سوداؔ کے عمومی انداز کے خلاف نرم اور شائستہ ہے۔ لیکن میرؔ صاحب ایسے نازک مزاج تھے

کہ اتنی بات بھی برداشت نہ ہوئی۔ بھلا کوئی شخص ان کی برابری کا دعویٰ کرے یا ان کا مدِ مقابل ہو۔ بس فوراً کہا:

طرف ہونا مرا مشکل ہے میرؔ اس شعر کے فن میں
یوں ہی سوداؔ کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

طَرَف کا تلفظ بالاتفاق ''ط'' اور ''ر'' کے زبر سے ہے۔ لیکن میر حسن نے ''ر'' اور ''ف'' کے سکون سے طَرْف [یعنی ''ر'' ساکن] بھی نظم کیا ہے۔ ''سحرالبیان'' میں ہے:

اسی کثرتِ فوج سے ہو سوار
پھرا شہر کی طَرْف وہ شہریار
قضا را وہ شب تھی شب چار دہ
پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طَرْف مہ

طَرَف ہونا:

منھ لگنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے:

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

قیف [یاے معروف]

عام بول چال میں اسے پھول بھی کہتے ہیں۔ ایک نلکی جس کا ایک سرا بہت پتلا اور دوسرا بہت چوڑا ہوتا ہے۔ تیل وغیرہ کو ایک بوتل سے دوسری بوتل میں منتقل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

Platts نے اس کے مآخذ کی تلاش میں دلچسپ قیاس آرائی کی ہے۔ اسے فارسی الاصل بتایا ہے، لکھتا ہے:

''اصل میں ماخوذ ہے کِپ یا کِیب سے جو نکلے ہیں ''کیبدن'' لفظ

سے جس کے معنی ہیں موڑنا، بل دینا، پیچ دینا اور شاید ژند کے لفظ گا
بمعنی جانا سے بھی تعلق ہو اور سنسکرت لفظ گاپ یتی۔"

یہ سب تحقیقِ انیق فرمانے کے بعد "قیف" کو مؤنث بتاتا ہے۔ حالانکہ مذکر ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تمام قیاس آرائی بَرہَوا ہے۔ اس کا کوئی تعلق فارسی مصدر کبیدن سے نہیں۔ ژند سے ناتا جوڑنا اور سنسکرت کی طرف منسوب کرنا اور بھی غلط ہے۔ یہ عربی لفظ "قیف" سے ماخوذ ہے۔ عربی میں اس کے معنی کھوج، تلاش اور جستجو کے ہیں۔ چونکہ اس آلے کے ذریعے رقیق و سیال شے کو ایک مقررہ راستے سے گزارا جاتا ہے اس لیے اس کو "قیف" کہنے لگے اور اپنی شکل کے اعتبار سے عام بول چال کا اردو لفظ "پھول" بھی بہت مناسب ہے۔

سارنگ [رمفتوح]

اردو کا لفظ ہے جس کی اصل سنسکرت میں ملتی ہے۔ اس کے معنی بہت ہیں۔ نو دلچسپ معنی یہ ہیں:

۱۔ موسیقی کا سُر۔ اردو میں زیادہ تر اسی معنی میں متعارف و مستعمل ہے۔

۲۔ مور

۳۔ سانپ

۴۔ بادل

۵۔ مور کی آواز

۶۔ ہرن، غزال

۷۔ عورت

۸۔ پانی

۹۔ کنول

ہنٹر۔ٹیلر نے اپنی لغت مطبوعہ ۱۸۰۸ء میں ایک دلچسپ مثال نقل کی ہے۔

سارنگ نے سارنگ گھیو سارنگ بولیو آئے
جو سارنگ سارنگ کہے سارنگ منہ تیں جائے

اس میں لفظ ''سارنگ'' اپنے تمام مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی مور نے سانپ پکڑا، بادل گرجنے لگا، اگر مور اپنی بولی بولے سانپ منہ سے چھوٹ جائے۔

روایت یہ ہے کہ اگر بادل گرجے اور اس وقت مور کی چونچ میں سانپ ہو تو سانپ مور کی چونچ سے چھوٹ جاتا ہے۔

سولہ سنگھار [واو مجہول، س مکسور][1]

عام طور پر سجنے، بننے، تزئین و زیبائش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو ''سرنگار'' بھی کہتے ہیں۔ حقیقتاً عورتوں کی آرائشِ جمال کے لیے سولہ مختلف چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ دورِ جدید میں ان اشیا کے نام بھی پہچاننے مشکل ہیں۔ افزائش حسن کی وہ سولہ[2] اشیا یا طریقے یہ ہیں:

۱۔ صفائی، ۲۔ غسل، ۳۔ صاف لباس، ۴۔ مہاور (لاکھی رنگ) لگانا،
۵۔ بال گوندھنا، ۶۔ مانگ میں سیندور لگانا، ۷۔ ماتھے پر بندیا لگانا،
۸۔ رخساروں پر سیاہ تل بنانا، ۹۔ زعفران ملنا، ۱۰۔ مہندی لگانا،
۱۱۔ پھولوں کا زیور، ۱۲۔ سونے کا زیور، ۱۳۔ لونگ کا زیور، ۱۴۔ مسّی لگانا، ۱۵۔ پان کھانا، ۱۶۔ سرمہ لگانا۔

سَریکھا/سَریکا [س مفتوح، یائے معروف]

قدیم اردو کا لفظ ہے اور شمال سے جنوب تک کی زبانوں میں رائج تھا۔ دکنی میں بھی اور برج میں بھی۔ دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ آگرہ اور نواحِ آگرہ میں عوامی بول چال میں آج تک رائج ہے۔ صرف فرق یہ ہوا کہ آگرہ میں بغیر ''ھ'' کے سریکا زیادہ تر سننے

میں آتا ہے۔

معنی اس کے ہیں: جیسا، سا، ایسا، کی مثل، مشابہ، کی مانند، مطابق وغیرہ۔ مثلاً کہتے ہیں تجھ سریکھے بہت دیکھے ہیں یعنی تجھ جیسے بہت دیکھے ہیں۔ مدراس سے ۱۸۵۰ء میں فوجی احکام وقواعد پر مشتمل ایک کتابچہ شائع ہوا تھا جس کا نام کورٹ مارشل ہے۔ اس میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ ایک فقرہ نقل کیا جاتا ہے۔

مترجم کل کے سریکھا حاضر ہیں (یعنی کل کی طرح حاضر ہیں۔)

میر غلام علی شاہ نے دکنی ٹرانسلیشن آف اسٹینڈنگ آرڈرز آف مدراس آرمی مطبوعہ اکتوبر ۱۸۴۹ء میں لکھا ہے:

''اگر کوئی سپاہی سمجھتا ہے کہ کوئی عہدے والا اس پر زبردستی کیا ہے اور وہ سپاہی اوپر بیان کیے سریکھا قانون کے موافق فریاد نہ کرکے اس کے بدلے میں گھر کی یا غصے سے بات کرے یا ایسا کچھ کام کرے تو یہ حرکت لشکری قانون کے برخلاف ہونے کے سبب سے اس سپاہی کو سزا ملے گی۔ حالانکہ دریافت میں یہ بات ثابت ہو کہ شروع میں عہدے والے کی ہی تقصیر تھی۔''

سریکھا کا لفظ صرف عوامی بول چال کی حد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس عہد کے زبان داں اور شعرا کے ہاں بھی مل جاتا ہے۔

آبرو کے ہم عصر محمد شاکر ناجی کا شعر ہے:

سخن سنجاں میں ہے گا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سریکا

☆......☆

حواشی

۱۔ اس کا ایک املا اور تلفظ ''سِنگار'' بھی ہے یعنی ہائے مخلوط (ھ) کے بغیر۔

۲۔ پلیٹس نے ''سنگار'' کے تحت مرکب کے طور پر ''سولہ سنگار'' درج کیا ہے (حالانکہ اسے لفظ ''سولہ'' کے تحت میں درج کرنا چاہیے تھا) اور اس نے یہ سولہ اشیا درج کی ہیں: (۱) داتن (۲) منجن (۳) اُبٹن (۴) سیندور (۵) کیسر [یعنی زعفران] (۶) اَنجن [یعنی کاجل] (۷) بندی (۸) تیل (۹) کنگھا (۱۰) اَرگجا (۱۱) پان (۱۲) مِسّی (۱۳) نیل (۱۴) مہندی (۱۵) پھول (۱۶) التا [التا یا آلتا یعنی لاکھ سے بنا رنگ جس سے عورتیں پانو کو سرخ رنگتی تھیں اور اس کو مہاور بھی کہتے ہیں۔]

☆......☆

(۳۶)

شام کے مُردے کو کب تک روئیے

اردو کا محاورہ ہے شام کے مردے کو کب تک روئیے [1]۔ اگر کوئی مشکل، پریشانی یا آفت ہمیشہ کی ہے یا عرصے تک رہنے والی ہے تو انسان زیادہ عرصے اس کا غم ورنج نہیں کر سکتا۔ وقتی اور فوری تکلیف اور غم پر ماتم والم ہوسکتا ہے۔ ساری زندگی کوئی کسی کو نہیں روتا۔ یہ انسانی فطرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت بھی۔ غالبؔ نے اسی کیفیت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

یہ محاورہ غالباً اس طرح وضع ہوا کہ اگر کوئی صبح یا دن کے وقت مرے تو زیادہ دیر نالہ وبکا کا وقت نہیں ہوتا اور مردے کو جلد لے جاتے ہیں۔ لیکن اگر سرِ شام یا رات کو مرے تو صبح تک مُردہ گھر میں ہی رہتا ہے۔ ساری رات نوحہ کناں کہاں تک ماتم کرسکتے ہیں۔ آنکھ جھپک ہی جاتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں کہ شام کے مُردے کو کب تک روئیے۔

ایک شاعرہ مُنّا بیگم تمنا کا شعر ہے:

پھنس چکا دل زلف میں بس سوئیے
شام کے مردے کو کب تک روئیے

میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

کہہ سانجھ کے موے کو اے میرؔ روئیں کب تک
جیسے چراغِ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

شمسہ [ش مفتوح، م ساکن، س مفتوح]

پُھندنا جو تسبیح وغیرہ میں لگاتے ہیں۔ گنبد کے کلس پر جو قرص لگاتے ہیں اسے بھی شمسہ کہتے ہیں۔[۲]

شمسی [ش مفتوح، م ساکن]

شمس [یعنی] سورج سے نسبت رکھنے والی چیز۔ سال عیسوی کو بھی بعض لوگ شمسی سال لکھتے ہیں۔ شمسی کے اور معنی بھی ہیں:

۱۔ نوکر پیشہ ملازم عورتیں ماہواری کے دوران تین چار دن کی رخصت کا حق رکھتی ہیں۔ یہ رخصتِ شمسی کہلاتی ہے۔

۲۔ شاہی زمانے میں چھے [۶] ماہ کی تنخواہ دی جاتی تھی۔ اسے بھی شمسی کہتے تھے۔ غالب کو پیسے کی بڑی تنگی رہتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں دربارِ مغلیہ سے ان کا تعلقِ ملازمت ہوا اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ قرار پائی۔ مگر ماہ بہ ماہ نہ ملتی تھی۔ شاہی دستور کے مطابق چھے ماہ بعد یکمشت رقم ہاتھ آتی تھی۔ یہ ضرورت مند، انھیں تابِ انتظار کہاں۔ اپنے عزیز دوست منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھا:

> ''یار چھے مہینے پورے ہو چکے ہیں، ۲ر جولائی سے دسمبر تک۔ اب میں دیکھوں یہ شش ماہی مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام۔''

صرف یہی نہیں بلکہ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں بھی ایک قطعہ کہہ کر پیش کیا۔ کہتے ہیں:

میری تنخواہ جو مقرّر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

۳۔ شاہی زمانے میں چھ ماہ کے بعد ملنے والی رخصت کو بھی ''شمسی'' کہا جاتا تھا۔

مشہور ریختی گو جان صاحب کہتے ہیں:

بی مہر نساء پاتی ہیں شش ماہی کی شمسی
اک سال میں ہیں دیکھتی دوبار گھر اپنا

بڑی خانم! ستارہ جان مغلانی کی باری ہے
حضور ان کو نہ دیں شمسی یہ کیا نامہربانی ہے

صَیدی [یائے لین]

صید کے معنی شکار کے تو عام ہیں لیکن کچھ خاص معنی بطور اصطلاح کے بھی رائج ہیں۔ کبوتر بازی کی اصطلاح میں ایک معاہدہ جس کے تحت کبوتر باز دوسرے کے کبوتر اڑا کر پکڑ سکتے ہیں اور اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: ''ہمارے اس کے صید ہے۔''

معاہدے کے دونوں فریقوں کو صیدی کہتے ہیں۔ اس لیے صیدی کے معنی حریف اور مخالف کے بھی ہیں۔

صید بدنا ''نوراللغات'' نے لکھا ہے کہ پتنگ بازی، کبوتر بازی یا بٹیر بازی کا

مقابلہ شرط لگا کر۔

صید میں باندھنا، کسی قول وقسم کا پابند کر دینا۔ کسی شرط میں باندھ دینا۔
میر حسن ''مثنوی سحر البیان'' میں لکھتے ہیں:

نہ باندھا ہو اس کو کسی صید میں
کیا ہو نہ اس کے تئیں قید میں

قُرآن اُٹھانا

حلف اُٹھانا۔ بات کی سچائی جتانے کے لیے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر یا اسے اُٹھا کر قسم کھاتے ہیں۔
میر شیر علی افسوسؔ کا قطعہ ہے:

تو الجھتا ہے جو مجھ سے سخنِ ناحق پر
مگر انصاف ہی اس دَور سے اے جان اُٹھا
غیر سے ملنے کی کھاتا نہیں ہے آپ قسم
مجھ کو کہتا ہے تو اس بات پہ قرآن اُٹھا

قُرآن پر ہاتھ دَھرنا

یہ بھی حلف اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔ مرزا جان طپشؔ کہتے ہیں:

جھپک سے پنجۂ مژگاں کے اس کی مصحفِ رو پر
قیاساً دل میں ہم اپنے یہی معلوم کرتے ہیں
کہ میرے قتل سے جو مردمِ چشم اس کے ہیں منکر
قسم کھانے کے تئیں قرآن پر یہ ہاتھ دھرتے ہیں

سَر چڑھانا

عام اردو محاورہ ہے:

۱۔ بچے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کرنا۔

۲۔ گستاخ کرنا۔ بے ادب بنانا۔

۳۔ غیر ضروری طور پر ناز برداری کرنا۔

۴۔ عزت کرنا۔ توقیر و قدر کرنا۔

میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

طوفِ مشہد کنتیں جو جاؤں گا
تیغِ قاتل کو سر چڑھاؤں گا

وہ سر چڑھا ہے اتنا، اپنی فروتنی سے
کھویا ہمیں نے اس کو، ہر لحظہ پاؤں پڑ کر

سَر چڑھ کے مَرنا

اپنا خون دوسرے کے سر رکھنا، دوسرے کو اپنے نقصان اور اتلافِ جان کا ذمے دار بنانا۔ مرزا جان طپشؔ کہتے ہیں:

سرخ اپنے لہو سے تری دستار کریں گے
آخر کو ہم اک دن ترے سر چڑھ کے مریں گے

سر ڈوب ہونا [واو معروف]

غرق ہونا، از سر تا پا ڈوبنا اور بھیگنا۔

میر تقی میرؔ کا شعر ہے:

تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری
یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا

☆.....☆

حواشی

۱۔ شام کے مُردے کو کب تک روئیے: یہ محاورہ نہیں کہاوت ہے۔

۲۔ شمسہ: اس کے بعض دیگر معنی بھی ہیں: چھاتا، چھتری، روشن دان (علمی اردو لغت)؛ نارنگی (اسٹین گاس)۔

۳۔ کتیں: اس کی وضاحت نہیں کی۔ اردو لغت بورڈ اور پلیٹس نے بھی نہیں درج کیا اور ''فرہنگِ کلیات میر'' (مرتبہ فرید احمد برکاتی) میں بھی درج نہیں ہے۔ ہمارا قیاس ہے کہ ''کے تئیں'' کا مخفف ہے۔

۴۔ یہ مصرع ''سر چڑھانا'' کی نہیں بلکہ ''سر چڑھنا'' کی سند ہے جیسا کہ لفظ ''چڑھا'' سے ظاہر ہے کہ یہ چڑھنا کا ماضی ہے۔ چڑھانا کا ماضی چڑھایا ہے، نہ کہ چڑھا۔

☆ ☆

(۴۷)

اِزدحام [الف مکسور]

ادبی اردو کا عام لفظ ہے۔ بھیڑ، انبوہ اور ہنگامہ کے معنی ہیں۔ اس کی اصل عربی ہے۔ مادّہ اس کا ہے زَحَم یعنی دباؤ، تنگ کرنا بھیڑ کا۔ جب ز ح م کو بابِ افتعال میں لے گئے تو یہ اِزتحام ہوگیا۔ لیکن بابِ افتعال میں اگر ''ف'' کے مقابل ''ز'' واقع ہو تو اس وقت ''ت'' ''د'' سے بدل جاتی ہے۔ اس طرح ''ازتحام'' سے ''ازدحام'' ہوگیا۔

فیلن (۱۸۷۹ء) نے اسے اژدہام، ''ژ'' سے، لکھا ہے۔ بعض لغات میں اژدھام بھی لکھا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ''ژ'' اور ''ح'' سے لکھنا تو اصولی طور پر غلط ہے کیوں کہ ''ژ'' عربی کا حرف نہیں۔ اگر ''ژ'' سے لکھنا تو اس کو ''ہ'' کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ یعنی اژدہام لیکن یہ املا شبہے سے خالی نہیں۔ اس لفظ کا صحیح املا ''ازدحام'' ہے اور مستند تحریروں میں اسی طرح ملتا ہے۔ ایک دوسرا فارسی لفظ ''اَژ دَہام''[1] بھی ہے۔ اس کے معنی ہیں مختلف رنگوں والی چیل۔

اِس [الف مکسور]

اردو کا عام اسمِ اشارہ ہے۔ مقامی بولیوں میں اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ مثلاً یا، یہہ، یے، یو، جے، جو، اِین، یہہ، ایہہ، اینم، ایسا، ایو، تس، ایسوں وغیرہ۔ محاورے میں اس کا استعمال بہت دلچسپ طریقوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

اس پر نہ پھُولو:

اس بات پر گھمنڈ نہ کرو: اس پر نہ پھُولو کہ بڑے باپ کی بیٹی ہو۔

اس پر نہ جاؤ:

اس کا لحاظ نہ رکھو، اس خیال میں نہ رہو، یہ نہ سمجھو۔

داغؔ کا شعر ہے:

ہے آشکار راز تمھارا جہان میں
اس پر نہ جاؤ تم کو کوئی جانتا نہیں

اس ہوا:

اس کے علاوہ، بجز۔

ناسخؔ کہتا ہے:

مجھ کو چھوڑا تو چھوڑو غیر کو بھی
اِس ہوا اور التماس نہیں

اِس سے:

اس سبب سے، عورتیں حقارت کے ساتھ انگوٹھا یا ٹھینگا دکھا کر کہتی ہیں۔

جانؔ صاحب کا شعر ہے جو ''نوراللغات'' نے درج کیا ہے:

اجی ڈھونڈھ کے پاجی ہی یار کریں موے تیلی تنبولی کو پیار کریں
برے اس سے زناخی ہزار کریں مری جوتی سے چوڑھے چمار کریں[۲]

اس قدر کا:

اتنا زیادہ۔ بہت زیادہ۔

شرفؔ کہتا ہے:

تو سہی تم سے بڑھاؤں اس قدر کا اتحاد
اپنے پہلو میں جگہ دینے لگو دل کی طرح

اِس کاندھے پر چڑھ اُس کاندھے پر اتر:

دلّی والوں کا خاص محاورہ ہے۔ اس مطلب میں کہ ہم کو تیری خاطر ہر طرح عزیز

ہے۔ ہمیں کچھ عذر نہیں۔

اِس کو کیا کہتے ہیں یا اسے کیا کہتے ہیں:

کوئی انتہائی حیرت کی بات ہو یا کوئی حد سے زیادہ سخت بات ہو جسے بیان کرنے کے لیے گویا الفاظ نہ ہو[ں]۔ سوداؔ کہتے ہیں:

تو نے سوداؔ کے تئیں قتل کیا ، کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

اِس دن/ اِسی دن:

بری حالت، بگڑے ہوئے دن، پھری ہوئی تقدیر، برا وقت۔

کیا اسی دن کے لیے عہدِ وفا باندھا تھا
موت ہے یا کہ جدائی کی گھڑی آئی ہے

اِس وقت میں:

بُرے وقت میں، آخر وقت، دمِ آخر، شرفؔ کا شعر ہے:

اخیر وقت تم آئے تو کیا ہوا اے یار
بشر ہی لیتے ہیں اس وقت میں بشر کی خبر
(نور اللغات)

اِس پار سے اُس پار:

اِدھر سے اُدھر، عرصۂ دراز کے لیے کام کھٹائی میں ڈالنا۔ فقرہ: تمھیں کیا ملا جو اس کا کام اِس پار سے اُس پار پھینک دیا۔

اُس (۱)

اِس کی طرح یہ بھی اسم اشارہ ہے، دُور کا۔ اِس نزدیک کا ہے۔ مختلف بولیوں میں مستعمل چند شکلیں یہ ہیں: وِس، وہ، وو، او، وا، پراکرت میں اَیہہ اور پالی میں اسؤ، تد۔

اُس (۲)

ضمیر جو انتہائی نفرت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جیسے: اُس ے نام کا کتا بھی نہیں پالتے۔

اُس سرے کا:

حد سے زیادہ، پلّے (پرلے) سرے کا۔

فقرہ: وہ اُس سرے کا بدمعاش ہے۔

اُس نے رکھا اِس نے اُٹھایا:

مماثلت کے لیے۔ اگر دو افراد کی حرکات و سکنات اور اعمال بالکل یکساں ہوں۔ جیسے شوق قدوائی کا شعر ہے:

قیس گیا تو شوق اب آیا
اُس نے رکھا اِس نے اٹھایا

اَساڑھ [الف مفتوح]

دیسی ہندوستانی مہینے کا نام۔ اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں: آساڑھ، اساڈھ، ساڑھ، ساڈھ۔

آساڑھ۔ اساڈھ۔ ساڑھ۔ ساڈھ:

فصلی سنہ کے حساب سے دسواں اور سمبت سنہ کے حساب سے تیسرا مہینہ۔ برسات کا پہلا مہینا (جون۔ جولائی)۔ سورج اس وقت برج جوزا [کذا] میں ہوتا ہے۔[۳]

اساڑھ کے درزی:

اساڑھ کے مہینوں میں درزیوں کا کام زیادہ چلتا ہے۔ اس لیے طنزاً اس شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ وقت بیکار مارا مارا پھرے اور کوئی اسے نہ پوچھے۔

اَساڑھی [الف مفتوح]

غلّے کی وہ فصل جو اساڑھ کی پہلی بارش ہوتے ہی بوئی جاتی ہے جس میں جوار باجرا شامل ہے۔ دوسرے معنی اساڑھی کے ہیں: اساڑھ کے مہینے میں پورے چاند کی رات، پُورَن ماشی۔

اَسرار/اِسرار [الف مفتوح/الف مکسور]

عربی سِر کی جمع ہے۔ معنی ہیں: بھید، راز، پوشیدہ باتیں، رموز وغیرہ۔

اردو میں زیر سے اسرار بمعنی جن بھوت، پری، سایہ۔ اردو میں واحد مستعمل ہے۔ شوقؔ کا شعر ہے:

کوئی کہتا تھا ہے کوئی آزار
کوئی بولا نظر کا ہے اِسرار

میر حسن نے ''سحرالبیان'' میں لکھا ہے:

کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے
کسی نے کہا کچھ یہ اِسرار ہے

اَوْتار [الف مفتوح، واو ساکن]

سنسکرت کا لفظ اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا تلفظ اردو میں واو کے سکون سے ہے۔ لیکن سنسکرت میں الف اور واو دونوں پر زبر ہے۔ اَو کا مطلب ہے اوپر۔ اور تَرَی سے مراد اترنا۔ یعنی اوپر سے نیچے اترنا، حلول کرنا۔ ہنود کے عقیدے کے مطابق خدا کا انسانی روپ یا اور کسی جسمِ ظاہری میں جلوہ گر ہونا۔ ہندومت میں ایسے دس اوتار مانے جاتے ہیں:

۱۔ مچھ ۲۔ کچھ ۳۔ باراہ ۴۔ نرسنگھ
۵۔ بامن ۶۔ پراشرم ۷۔ رام چندر ۸۔ کرشن

۹۔ بودھ　　۱۰۔ کلنکی

☆......☆

حواشی

۱۔ ازدہام: یہ لفظ دہخدا میں بھی موجود نہیں ہے۔ غالباً سہو قلم ہے۔ (دیکھیے: دہخدا، شمارۂ مسلسل ۶، تہران: ۱۳۲۸ خورشیدی)۔

۲۔ کرنا: یہاں ''کریں'' دراصل جنسی فعل کی طرف بھی اشارہ ہے۔

۳۔ جوزا (Gemini): قادری صاحب نے جون۔ جولائی لکھ کر کہا ہے کہ سورج اس وقت برج جوزا میں ہوتا ہے لیکن جوزا کا عرصہ ۲۱ رمئی سے ۲۱ رجون تک ہوتا ہے۔

☆......☆

(۳۸)

ہَشت [ہ مفتوح، ش ساکن]

فارسی کا لفظ بمعنی آٹھ۔ ایران کی قدیم زبانوں میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ سنسکرت کے لفظ اَشٹ کی جڑیں بھی وہیں تک پہنچتی ہیں۔

اَشٹ جام [الف مفتوح، ش ساکن]

سنسکرت سے پراکرتوں میں سے ہوتا ہوا مختلف مقامی بولیوں میں دخیل ہو گیا۔ اشٹ جام کا مطلب ہے آٹھوں پہر، تمام وقت، سارا وقت، ہر دم، ہمیشہ، ایک پوربی گیت کے بول ہیں:

اشٹ جام دھیان موہے واکو رہت ہے ری
ناجانوں کب درشن پیٹھوں گی[۱]

[یعنی میرا دھیان ہر وقت اُس کی طرف رہتا ہے، نجانے کب درشن ہوں گے]

اَشٹ سِدّھی [الف مفتوح، ش ساکن، س مکسور، دھ مشدد]

اشٹ ہی سے ہے ''اشٹ سِدّھی'' اس کے معنی ہیں:

۱۔ آٹھ اکمل ترین ہستیاں۔

۲۔ اللہ والے اور گیان دھیان والے اپنے روحانی علو و برتری کے باعث کائنات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان قوتوں کے مظہرِ مجسم کو اشٹ سِدّھی کہتے ہیں۔

اَشٹ مَنگل [الف مفتوح، ش ساکن، م مفتوح، گ مفتوح]

اسم مذکر ہے۔ دو معنی خاص ہیں:

۱۔ گھوڑا جس کے چاروں پاؤں، چہرہ، سینہ اور دُم سفید ہو۔

۲۔ آٹھ مبارک اشیا کا اجتماع مثلاً شیر، سانڈ، ہاتھی یا رانی کا گھڑا، پنکھا، جھنڈا، بگل، چراغ۔

اَشٹَمی [الف مفتوح، ش ساکن، ٹ مفتوح]

چاند کے گھٹنے یا بڑھنے کا آٹھواں دن۔

جَنَم اشٹمی [ج مفتوح، ن مفتوح]

بھادوں (اگست)[۱] کے نصف تاریک حصے کا آٹھواں دن۔ کرشن مہاراج کا یومِ پیدائش۔

اُڑھری [الف مضموم، ڑھ ساکن]

مدخولہ، داشتہ۔ نور اللغات میں مولوی نور الحسن صاحب نیرؔ نے لکھا ہے: ''غیر کفو کی جورو عام اس سے کہ منکوحہ ہو یا مدخولہ۔'' یہ صحیح نہیں۔ ''اڑھری'' کے لیے کفو غیر کفو کی کوئی شرط نہیں اور منکوحہ اس زمرے سے خارج ہے۔ صرف غیر منکوحہ داشتہ یا مدخولہ وغیرہ۔

فیلنؔ نے اپنی لغت میں ایک گیت جھومر کے بول نقل کیے ہیں:

رام! بیاہی کے مارب، بیاہی کے گریائب
اُڑھری کے گُنجری گڑھائب

ارے رام! وہ بیوی کو مارتا ہے بیوی کو دشنام دیتا ہے اور داشتہ کے لیے زیور گڑھواتا ہے۔

مَکڑی [م مفتوح، ک ساکن]

ایک تو وہی ہے جسے عربی میں عنکبوت کہتے ہیں۔ لیکن اردو میں مکڑی کے اور معنی

بھی ہیں: مجازاً کوئی چمکدار چیز، چمک، جھلملاتی ہوئی، جگمگاتی ہوئی۔
نظیر اکبرآبادی نے لکھا ہے:

زردار کی تو ان میں، ہے بچھ رہی پلنگڑی
دلبر پری سی بیٹھی، جھمکائے جوڑے مکڑی

مُنْھ پانا

اردو محاورے میں مرضی پانا، بار پانا، کسی کا التفات پانا، ملتفت اور متوجہ ہونا۔
دردؔ کا شعر ہے:

منھ تمھارا بھی اگر پائے گا
تو یہ منھ اپنا بھی دکھلائے گا

مُنْھ کی لوئی اُترنی یا اُتر جانی [لوئی بواوِ مجہول]

بے شرمی لادنا، بے حیائی اختیار کرنا[۳]۔

مُنْھ دیکھنا

مولوی محمد منیر صاحب منیر لکھنوی، محاوراتِ نسواں مطبوعہ کان پور ۱۹۳۰ء، میں لکھتے ہیں:

''مہذب اصطلاح عورتوں کی، مرد کے شب باش ہونے کے معنی ہیں۔''
پنڈت دیا شنکر نسیم کا شعر ہے:

رخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منھ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

مور چاپی کرنا [مور بواوِ مجہول بمعنی چیونٹی]

قینچی سے داڑھی مونچھوں کے بال اتنے باریک کترنا کہ چیونٹیوں کی طرح دکھائی دیں۔ میر محبوب علی رام پوری نے ''منتخب النفائس'' میں لکھا ہے:

''تراشیدنِ موے ریش بمقراض بحدیکہ مانند پائے مور چہ شود''

[یعنی داڑھی کے بال قینچی سے اس حدتک تراشنا کہ چیونٹی کے پاؤں کی طرح ہو جائیں]

مُوشک دَوانی کرنا[۱] [واومعروف، ش مفتوح، دمفتوح]

مُوشک یعنی جنگلی چوہا، گلہری وغیرہ۔ مراد ہے تباہی بربادی مچانا، ابتری پھیلانا۔ نقصان کرنا۔

''منتخب النفائس'' میں میر محبوب علی رام پوری نے لکھا ہے: عبارت از فتنہ انگیزی۔ وحشی کا شعر دیا ہے:

بتاراجِ برگِ درختاں ز ہر سو
کند موذیٔ باد موشک دوانی

مہتاب چُھوٹنا [واومعروف]

چہرے پر ہوائیاں اڑنا، رنگ فق ہوجانا، چہرے کا رنگ اُڑ جانا۔

غالب کا مشہور شعر ہے:

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

اس شعر کی تشریح میں مولانا نظم طباطبائی نے شرح غالب میں لکھا ہے:

''غرض یہ ہے کہ بروقتِ نظارہ میرے منہ پر ہوائیاں اوڑتے [اڑتے] ہوئے اور مہتاب چھٹتے ہوئے دیکھ کر وہ سرگرمِ ناز ہوگا...... ''

میسور [یاے لین، واوِمعروف]

جنوبی ہند کا مشہور [کذا] اور سلطان ٹیپو کی نسبت سے بہت مشہور ہے۔ یہاں اس وقت اس جگہ سے مراد نہیں۔ بلکہ عربی لفظ میسور سے مطلب ہے جو یُسَرَ سے نکلا ہے۔ اس کے

معنی ہیں: آسان، آسان کیا ہوا، عمدہ، پُر آسائش، کامیابی سے انجام دیا ہوا۔ اس کی جمع میسورات آتی ہے [کذا][۵]۔ جس کے معنی ہیں عمدہ حالات، اچھے معاملات، خوش احوال، اسبابِ آسائش۔

تَر بندی [ت مفتوح]

علم جراحی کی اصطلاح ہے۔ ''یونانی سرجن'' جنھیں جراح کہا جاتا ہے اور انگریزوں کی غلامی کے سبب معاشرے میں باوقار مقام نہیں رکھتے، اپنے فن میں لاجواب تھے اور اب بھی جدّی و پشتینی جراحوں کے ہاں خاندانی نسخے اور ترکیبیں بے نظیر ہیں۔ زخم کے علاج کے لیے ڈریسنگ کے طور پر تین طریقے رائج تھے جنھیں تر بندی، خشک بندی اور نمک بندی کہتے ہیں۔

''تر بندی'' کے معنی ہیں: زخم پر دواؤں میں بھیگی ہوئی پٹی باندھنا۔

میر تقی میرؔ دیوان پنجم میں لکھتے ہیں:

تر بندی خشک بندی نمک بندی ہو چکی
بے ڈول پھیلتا سا چلا ہے فگارِ دل

نمک بندی، اگر زخم کو مندمل کرنے کے لیے نمکیات لگا کر پٹیاں باندھتے ہیں تو اس کو نمک بندی کہتے ہیں۔

میرؔ کا ہی شعر ہے دیوانِ ششم میں:

سب زخمِ صدر اُن نے نمک بند خود کیے
صحبت جو بگڑی اپنے سیں سارا مزا گیا

نَول [واو لین]

عربی لفظ ہے (ن و ل)۔ بحری جہاز کی لدائی، کرایہ، ناؤ کشتی، جہاز کا کرایہ، خرچ، بار برداری کی اجرت، معاوضہ۔

میر امن کی ''باغ و بہار'' میں ہے:

''اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا نول مقرر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔''

(سرگذشت آزاد بخت بادشاہ کی)

''سوداگروں نے ایک کوٹھڑی میرے تحت کر دی میں نے اس کے نول کا روپیہ بھر دیا۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ یہ گیت فیلن نے ''اشٹ جام'' کے اندراج کے ساتھ درج کیا ہے۔

۲۔ جنم اشٹمی: قادری صاحب نے ''بھادوں'' کے بعد قوسین میں اگست لکھا ہے لیکن بھادوں کا مہینا تقریباً وسطِ اگست سے شروع ہو کر وسطِ ستمبر تک چلتا ہے۔ (بحوالہ پلیٹس)۔

۳۔ لوئی: لوئی بمعنی عزت کا لباس یا چادر۔ (بحوالہ علمی اردو لغت) اردو میں کہاوت ہے: اتر گئی لوئی تو کیا کرے گا کوئی، یعنی جب انسانی بے حیائی اختیار کر لے تو اسے کوئی ڈر نہیں رہتا، جب عزت جاتی رہے تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے۔ (بحوالہ علمی اُردو لغت)

۴۔ دَوانی: فارسی میں دو مصدر ہیں: دواندن اور دوانیدن۔ دیگر معنوں کے علاوہ ایک معنی ہیں: شرمندہ کرنا (بحوالہ اسٹین گاس)۔ گویا موشک دوانی کرنا سے مراد ہے جنگلی چوہے کو شرمندہ کرنا یعنی ایسی تباہی کرنا کہ جنگلی چوہا بھی شرمندہ ہو جائے۔

۵۔ میسور: میسور کی جمع مَیاسِیر ہے۔ (اسٹین گاس، المنجد)

☆......☆

(۳۹)

اَب [الف مفتوح]

اب کا لفظ اردو میں طرح طرح سے استعمال ہوتا ہے اور اس کے مفہوم میں نازک نازک فرق پائے جاتے ہیں۔ لغات میں عام طور پر اس کی تفصیلات مع مثالوں کے مل جاتی ہے۔

اَبتوڑی [الف مفتوح، ت ساکن، واو مجہول]

اسی معنی [یعنی ''اب'' کے معنی] میں استعمال ہونے والا قدیم لفظ ہے۔ ۱۸۵۳ء میں منشی سید حسین نے کورٹ مارشل کے نام سے تعلیم الاخبار پریس مدراس سے فوجی احکام پر مشتمل ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں ''ابتوڑی'' کے معنی ملتے ہیں: اب تک، اِس وقت تک، ایک لمحے تک، آج تک، ابَ۔'' لیکن ''ابتوڑی'' کے لفظ کی مختلف شکلیں برصغیر کے مختلف حصوں اور مختلف مقامی بولیوں میں ملتی ہیں۔ نواحِ اکبرآباد میں یہ لفظ اسی طرح بولا جاتا ہے۔

خاص طور پر بھرت پور، دھول پور، پہرسر وغیرہ کے علاقوں میں۔ اس تلفظ کی دیگر شکلیں یہ ہیں:

ابھی تک	اب تلک	اب تلنگ	اب تو
اب لگ	اب لے	اب لَوں	
اب تئیں	اب تَولی	اب توں	اب تاں ئیں [اب تائیں] [1]
اب توئیں			

اَٹھَل [الف مفتوح، ٹھ مفتوح]

شادی بیاہ کی رسمیں تمام قوموں میں رائج ہیں۔ مغرب میں تو زندگی اتنی مصروف ہوگئی ہے کہ سوائے ہنی مون (ماہِ عسل) اور کسی رسم کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ اردو والوں نے بے سبب ہنی مون کا ترجمہ ''ماہ'' کے لفظ سے کیا ہے[۲] ورنہ ایک ماہ کیا معنی ایک ہفتہ بھی نو بیاہتا جوڑے کو نصیب نہیں ہوتا۔

مشرق میں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔ اس لیے رسمیں بھی بے شمار تھیں۔ اب وہ بھی بہت کم ہوتی جاتی ہیں۔ مختلف علاقے کے مسلمانوں میں بھی شادی بیاہ کی رسمیں یکساں نہیں تھیں۔ چند بنیادی باتوں کے سوا باقی رواجوں میں علاقوں کے اعتبار سے فرق ہوتا تھا۔

ہندوؤں کی رسمیں بنیادی طور پر بھی مسلمانوں کی رسوم سے مختلف تھیں۔ قدیم ہندوؤں میں شادی کی ایک رسم یہ تھی کہ شادی کے تیسرے دن دولھا اور دلہن ایک ساتھ نہاتے تھے اور اس رسم کو ''اٹھل'' کہتے تھے۔ اس نام کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نہلانے میں آٹھ افراد شریک ہوتے تھے۔ تحریروں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آٹھ افراد عورت اور مرد دونوں کو بیک وقت نہلاتے تھے یا الگ الگ۔ مختلف لغت نویسوں نے الگ الگ باتیں لکھی ہیں اور زیادہ تر ایک دوسرے کو دیکھ کر بغیر کسی حوالے کے تشریح کی ہے۔

۱۸۰۸ء: ہنٹر اور ٹیلر نے اپنی لغت میں دونوں کا ایک ساتھ نہانا لکھا ہے۔

۱۸۷۹ء: فیلن نے دونوں کو الگ الگ نہلانا لکھا ہے۔ آٹھ مرد دولھا کو اور آٹھ عورتیں دلہن کو نہلاتی ہیں۔

۱۸۸۴ء: پلیٹس نے بھی غالباً ہنٹر۔ ٹیلر سے دیکھ کر یہی عبارت لکھی ہے اور دونوں کے الگ الگ نہلانے پر زور دیا ہے۔[۳]

سنسکرت میں ''اشٹھ'' آٹھ کے معنی رکھتا ہے اور ''انگ'' جسم کے ایک حصے کو

کہتے ہیں۔''اشٹھ انگ'' گویا جسم کے آٹھ حصے یا عضو ہوئے۔

آٹھ نوکر گویا''اشٹھ انگ'' کے لیے درکار ہوئے اور اس طرح نہلانے کے لیے آٹھ افراد، خواہ مرد خواہ عورتیں، درکار ہوئے اور اس عمل سے لفظ''اٹھل'' بنا۔ اب یہ رسم تو جدید ہندوؤں میں بھی باقی نہیں رہی۔ بلکہ بعض ہندی شبد کوشوں (لغتوں) میں یہ لفظ بھی نہیں ملتا۔

اَٹاری [الف مفتوح]

شہروں میں مکانات کی تعمیر جدید طرز پر ہونے لگی ہے۔ نہ دالان ہوتے ہیں، نہ صحنچی، نہ سہ دری، نہ مہتابی، نہ طاق۔ قدیم طرزِ تعمیر میں کمروں میں دوچھتی بناتے تھے یعنی اصل چھت کے نیچے عام طور پر نصف قدِ آدم جگہ چھوڑ کر دوہری چھت ڈالتے تھے۔ اس طرح خاصی بڑی جگہ نکل آتی تھی جو کاٹھ کباڑ یا کم مستعمل ہونے والے ساز و سامان کے بھرنے میں کام آتی تھی۔[۴]

اَٹریا [الف مفتوح، ٹ مفتوح]

اٹاری کی تصغیر ہے۔ یعنی چھوٹی دوچھتی۔

کہاوت ہے:

دمڑی کے پان پٹریا میں
موری توری باتیں اٹریا میں

فیلن نے اس کے معنی لکھے ہیں:''دمڑی کے پان پٹاری میں ہیں۔ میرے محبوب مجھ سے تو اٹاری میں آ کے مل۔''

اس کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ اٹریا کاٹھ کباڑ کے بھرنے میں کام آتی ہے۔ [یا] ردّی اور بیکار چیزیں[۵]۔ اس کا مطلب ہے کہ اپنی حقیر سی شے بھی احتیاط سے رکھی جاتی ہے اور دوسرے کی بڑی سے بڑی بات کی بھی پروا نہیں کرتے[۶]۔

جات

بھٹ بھٹیاری بیسوا، تینوں جات کجات
آئے کی آدر بے کریں، جات نہ پوچھیں بات

بھٹ یعنی بھاٹ، نقلیں اُتارنے والا، تماشا کرنے والا، مسخرہ۔

بھٹیاری[یعنی] سرائے کی مالکہ یا عورت جو مسافروں کو ٹھیراتی ہے۔

کُجات یعنی بُری ذات۔ کاف کا سابقہ بُرے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح ''سین'' کا سابقہ اچھے کے معنی میں۔ پوت بمعنی لڑکا، بیٹا، سپوت اچھا[یا] سعید بیٹا، کپوت نالائق بیٹا۔

جات کا لفظ دونوں مصرعوں میں مختلف ہے۔ پہلے میں جات دیسی تلفظ ہے ذات کا۔ دوسرے میں جات کے معنی ہیں جاتے وقت، وقتِ رخصت۔ ظاہر ہے کہ ہوٹل کا مالک یا بیسوا[یعنی طوائف] آنے والے شخصوں کی عزت اور آؤ بھگت کریں گے۔ رخصت ہوتے وقت کیوں پروا کریں گے۔ مطلب تو نکل چکا۔

اس لیے یہ کہاوت میں تین قسم کے طبقوں کو بیان کیا ہے۔ بھاٹ، بھٹیاری اور بیسوا تینوں بدذات ہیں۔ آتے وقت تو آنے والے کی بڑی عزت۔ تواضع اور خاطرداری کرتے ہیں۔ مطلب برآری کے بعد جاتے وقت پھر بات بھی نہیں پوچھتے۔

☆......☆

حواشی

۱۔ اب تائیں: پلیٹس نے ''اب'' کے تحت مرکبات میں ''اب تائیں'' اور ''اب تئیں'' کا اندراج کیا ہے اور ساتھ ہی ابتوڑی اور ابتوری بھی دیا ہے۔

۲۔ ماہ اور ہنی مون: قادری صاحب کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ اردو والوں نے بے سبب

ہنی مون کا ترجمہ ''ماہ'' کیا ہے کیونکہ مون (moon) کے ایک معنی انگریزی میں ماہ یا مہینے کے بھی ہیں، گو ادبی طور پر یا مزاحاً ہی سہی۔ لیکن مون کا ترجمہ ماہ بالکل درست ہے۔ (بحوالہ کنسائز اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری)

۳۔ اٹھل: برعظیم پاک و ہند کے معاشرے اور آداب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اٹھل میں ایک ساتھ نہلانے کا تصور مشکل ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ دولھا دلہن دونوں مکمل لباس میں ایک ساتھ نہلائے جاتے ہوں۔

۴۔ اٹاری: یہ صرف دوچھتی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے ایک معنی ''چھت پر بنا ہوا کمرا، بالائی کمرا، بالا خانہ بھی ہیں اور چھت کا وہ حصہ بھی مراد ہے جسے پاٹ دیا گیا ہو۔ (پلیٹس، علمی اردو لغت)

۵۔ اٹریا: یہ چونکہ اٹاری کی تصغیر ہے لہٰذا اس کے ایک معنی ''چھت پر بنا چھوٹا کمرا'' بھی ہیں۔

۶۔ موری توری باتیں اٹریا میں: اِس سے یہ بھی مراد ہے کہ اپنی معمولی سی بات بھی چھپا کر اور دوسروں کی باتیں سرِ عام۔

۷۔ آدر: عزت کے معنی میں ہے بلکہ پلیٹس نے ایک مصدر آدرنا بھی درج کیا ہے اور معنی ہیں عزت کرنا۔

☆.....☆

(۴۰)

گھاٹ

عام لفظ ہے لیکن اس کے بعض معنی عام نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اب متروک ہیں۔ ایک تو وہی معنی ہیں یعنی دریا، ندی کا کنارہ، جہاں اشنان کرتے ہیں، دھوبی کپڑے دھوتے ہیں، دریا پار کرنے کے لیے ناؤ کشتی وغیرہ بھی کرائے پر ملتی ہے۔ اسی گھاٹ اور دھوبی سے اردو کا مشہور محاورہ نکلا ہے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یعنی دھوبی کو گھر اور گھاٹ کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ کتا بھی مالک کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے۔ نہ تو چین سے گھاٹ پر رہ سکتا ہے۔ نہ آرام سے گھر میں بیٹھ سکتا ہے۔

شمس العلما مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے ''محاوراتِ ہند'' مطبوعہ ۱۸۹۰ء لکھا ہے: یہ مقام اور نشان کے لیے بھی بولتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ تلوار کس گھاٹ کی ہے یعنی کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ ''جَو'' جو عام غلہ ہے اسے بھگوتے ہیں پھر کوٹ کر بھون لیتے ہیں اور بطور چبینے کے چباتے ہیں۔ اس کو بھی گھاٹ کہتے ہیں۔ مولوی سبحان بخش صاحب کا ہی قول ہے کہ دہقانی لوگ وضع اور طرز کے معنی میں بھی گھاٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور گھٹنے کے مفہوم میں کمی کے معنی پر بھی بولتے ہیں۔ مولوی سبحان بخش صاحب کہتے ہیں کہ ہولی کے بعد شہروں میں جو میلہ لگتا ہے اسے بھی گھاٹ کہتے ہیں۔

دھوبی گھاٹ [واو مجہول]

دھوبی جب کپڑے دھوتے ہیں تو گھاٹ پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوتا ہے۔ اس پر

کپڑے کو سر سے اونچا کر کے زور زور سے مارتے ہیں۔ اسی سے کُشتی کا ایک داؤ بھی بنا ہے۔ جب حریف کو اُٹھا کر پیچھے سے لا کر زمین پر پٹخ دیتے ہیں تو اسے ''دھوبی گھاٹ داؤ مارنا'' کہتے ہیں۔

قصاب شکن/قسائی ہڈا/قسیا گھاؤ

کُشتی کا ایک اور داؤ ہے جسے ''قصاب شکن'' کہتے ہیں۔ اردو میں اس داؤ کو ''قسائی ہڈا'' اور ''قسیا داؤ'' بھی کہتے ہیں۔ مولوی محبوب علی رام پوری نے اپنی کتاب ''منتخب النفائس'' مطبوعہ کان پور ۱۲۵۸ھ میں لکھا ہے:

> ''قصاب شکن'' نامِ فن از کُشتی و آں زور بر گردنِ حریف، آوردہ بر زمیں می زنند چناں کہ قصاب گوسفند را۔ میر نجات گوید:
>
> مدعی گرچہ خود آزار مراقے دارد
>
> باب قصاب شکن گردنِ چاقے دارد
>
> ترجمہ: ''قصاب شکن کُشتی کے داؤ کا نام ہے جس میں حریف کی گردن پر زور ڈال کر اسے زمین پر پٹخ دیتے ہیں جس طرح قصائی بھیڑ کو پٹخ دیتا ہے۔''

اُچاپت [الف مضموم]

اردو کا عام لفظ ہے۔ اصلاً سنسکرت ہے۔ سہارن پور کے اضلاع میں ''چ'' کی تشدید سے اچّاپت بولتے ہیں۔ ادھار اور قرض پر بنیے کے ہاں سے سودا لینے کو اچاپت بولتے ہیں۔ اچاپت اٹھانا اور اچاپت لینا دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی میں ہے:

۱۔ ادھار سودا لینا۔ کہتے ہیں کہ بنیے کی اچاپت اور گھوڑے کی دوڑ برابر۔ یعنی بنیے کا قرض گھوڑے کی دوڑ کی طرح تیزی سے بڑھتا ہے۔

۲۔ تیزی دکھانا، دھوکہ بازی کرنا۔ پوربی محاورہ ہے: ہم ہی سے اچاپت

لاتے ہو۔یعنی ہم سے ہی دھوکہ بازی کرتے ہو یا ہم سے ہی تیزی دکھاتے ہو۔

۳۔ شوروغل کرنا: مولوی نورالحسن صاحب نیّر نے ''نوراللغات'' میں لکھا ہے کہ عورتوں کا محاورہ ہے۔کہتی ہیں کہ یہ کیا اُچاپت مچا رکھی ہے۔

اُچاپتی [الف مضموم]

بنیوں کی اصطلاح میں قابلِ اعتبار قرض دار کو کہتے ہیں۔جس کے ہاں پیسے مارے جانے کا خدشہ نہ ہو۔یوپی بنیوں کا محاورہ ہے:

تَیں تو مھارا اچاپتی ہے چاکیں سولے جانا۔

[تم تو میرے اچاپتی ہو، چاہو سو لے جانا]۔

اَڑنگ بَڑنگ اور اَڑنگ تَڑنگ

دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔پلٹیس نے اپنی لغت مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں ''اڑنگ بڑنگ'' کا لفظ [کذا: ''مرکب'' چاہیے] درج نہیں کیا[1]۔

۱۸۰۸ء میں ہنٹر۔ٹیلر نے ''اڑبڑ بکنا۔اڑبنگ'' درج کیے ہیں اور معنی لکھے ہیں: مہمل، بے سروپا، فضول باتیں۔

اڑنگا اور اڑبنگی کے معنی مہمل گو اور بے وقوف کے لکھے ہیں۔

اڑنگ بڑنگ بچوں کے ایک کھیل کو بھی کہتے ہیں اور اس کے معنی مہمل اور بے سروپا باتیں بھی ہیں۔''نوراللغات'' نے منظرؔ کا یہ شعر دیا ہے:

جب چڑھا اس کو خوب نشۂ بنگ[2]

اور بکنے لگا اڑنگ بڑنگ

اڑنگ کے ایک معنی ہیں: منڈی، بازار، کارخانہ، گودام، کباڑ خانہ۔

مصحفؔی کا شعر ہے:

کر آ کے چار سوئے طبیعت کو میری سیر
ہر گوشے یاں متاعِ فصاحت کے ہیں اڑنگ

اڑنگ بڑنگ کے ایک معنی ہیں: تلپٹ ہو جانا، اِدھر سے اُدھر ہو جانا، اتھل پتھل ہو جانا۔فیلن نے اپنی لغت میں عورتوں کا ایک محاورہ لکھا ہے:

ناف ٹلے اڑنگ بڑنگ ہو گئے

اَڑَنگا [الف مفتوح، ڑ مفتوح]

عام لفظ ہے۔ چلنے میں روڑا اٹکانے کو کہتے ہیں۔ کسی کے کام میں خرابی پیدا کرنا، رکاوٹ ڈالنا، حائل ہونا وغیرہ اور کشتی کے ایک داؤ کو بھی کہتے ہیں۔[۳]

اَڑْکا [الف مفتوح، ڑ ساکن]

مدراس کے علاقے اور جنوبی ہند کے ایک چھوٹے سکے کا نام ہے جو دس کاس کے برابر ہوتا تھا۔ جنوبی ہند میں جو سکہ رائج تھا اسے ''کاس'' کہتے تھے۔ ۸۰ کاس کا ایک ''فنم'' اور بارہ ''فنم'' کا ایک روپیہ ہوتا تھا۔ انگریز کے عہد میں یہ سب سکے اور ان کی تقسیم ختم ہو گئی۔

اَڑواتڑوا مارنا [الف مفتوح، ت مفتوح]

اصل میں فارسی لفظ آوازہ ہے یعنی فقرہ کسنا وغیرہ۔ اس سے اردو میں پہلے آوازا تاوازا[۴] بنا۔ تاوازا اتابعِ مہمل ہے آوازہ کا۔ پھر مزید تبدیلی ہوئی اور ''اڑواتڑوا'' ہو گیا۔ یعنی فقرے چست کرنا، آوازہ کسنا، ہتک آمیز جملے چسپاں کرنا، مذاق اُڑانا۔

☆......☆

حواشی

ا۔ ارنگ بڑنگ: یہ درست ہے کہ پلیٹس کے ہاں اس مرکب کا اندراج نہیں ہے لیکن اس نے

اڑنگ تڑنگ درج کیا ہے اور معنی لکھے ہیں احمقانہ باتیں، مہمل/ بے سروپا باتیں۔

۲۔ بنگ یعنی بھنگ۔

۳۔ اڑنگا: اکبرالٰہ آبادی نے کہا ہے:

پردے کا کیا ہے خود اڑنگا پیدا
خود ہم نے کیا ازار اور انگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے
نیچر نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

۴۔ آوازاتوازا: یہ مرکب پلیٹس کے مطابق ''آوازاتوازا'' ہے۔ قادری صاحب نے آوازاتاوازہ'' لکھا ہے۔ بورڈ کی لغت میں بھی آوازہ توازہ درج ہے۔

(۴۱)

اَسامی (۱) [الف مفتوح]

اسم کی جمع الجمع ہے۔ اس لفظ کو الف مقصورہ کی جگہ الف ممدودہ سے بھی لکھا جاتا ہے یعنی آسامی۔ اور یہی املا یعنی آسامی زیادہ مستعمل ہے [اگرچہ یہ درست نہیں]۔ بعض تحریروں میں سین کی جگہ ث سے بھی دیکھا گیا ہے۔ لیکن اثامی اس معنی میں غلط ہے۔ اثامی کے معنی ہوں گے گناہ گار۔

اَسامی (۲) [الف مفتوح]

اگرچہ جمع الجمع ہے لیکن اردو میں بطور واحد مستعمل ہے اس کی جمع اسامیاں آئی ہے۔

یہ بہت کثیر المعنی لفظ ہے۔ بعض معنی دلچسپ ہیں اور آج کل متروک ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کا تحریر کرنا مفید ہوگا۔

۱۔ پہلے معنی ہیں کاشتکار، کسان، رعیت۔

۲۔ جگہ، نوکری، ملازمت۔

فقرہ: سرشتۂ تعلیم میں دو اسامیاں خالی ہیں۔

ہم اپنی اسامی پر فلاں کو رکھنا چاہتے ہیں۔

۳۔ جواریوں کی اصطلاح میں وہ شخص جو کھیل نہ جانتا ہو اور ہمیشہ ہارتا ہو۔

۴۔ قانون کی اصطلاح میں مقدمے کا فریق، گواہ، موَکل۔

۵۔ سہل الحصول عورت، طوائف جو بطور طوائف مشہور ہو۔

فقرہ: آج تم بھی نکلے کی اسامی ہو۔

اسامی بنانا[1]:

بے وقوف بنانا، فریب سے پیسے وصول کرنا: چکمہ دینا۔

فقرہ: کسی موٹی چڑیا کو اسامی بناؤ جو کھیل چلے۔

اسامی بلاحق دخیل کاری:

دخل یابی کا حق نہ رکھنے والی اسامی۔

اسامی پاہی/ اسامی پاہی کاشت:

خود کاشت یا سیر[2] (س ی ر) کے برعکس/ وہ کاشت کار جو کاشت پر مقیم نہ ہو۔

اسامی جمع بندی:

انفرادی کاشتکار سے معاہدہ اور انتظام، رعیت داری طریقہ۔

اسامی چھپر بند:

مقیم کاشتکار جس کا اپنا چھپر یا جھونپڑا ہو، اسامی پاہی کاشت کا برعکس۔

اسامی شکمی:

شکمی رعیت، شکمی کاشتکار، شکمی اجارہ دار یعنی کاشتکار کا ماتحت کاشتکار۔

اسامی غیر مستقل:

عارضی ملازمت، قائم مقامی ملازمت میں کاشتکار جو مستقل حق نہ رکھتا ہو۔

اسامی مستقل:

(الف) کاشتکار جس کو زمین پر حق حاصل ہو اور بے دخل نہ کیا جائے۔

(ب) مستقل نوکری و ملازمت۔

اسامی موروثی:

کاشتکار جس کا حق باپ دادا سے چلا آتا ہو، وہ کاشتکار جو مقررہ لگان ادا کرنے پر بے دخل نہ کیا جائے۔

اسامی وار:

نام بنام، فرداً فرداً، ترتیب کے مطابق۔

ڈوبی اسامی:

جس سے کچھ وصول نہ ہو سکے، دیوالیہ، مفلس۔ غالب کہتا ہے:

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی[۳]

سرکاری اسامی:

سرکاری ملازمت، سرکاری نوکری۔

کھری اسامی:

نقد سودا کرنے والا، کبھی واجب الادا باقی نہ رکھنے والا، قابلِ اعتماد۔

کھلانے والی اسامی:

عورت جو اپنے عاشق کو کھلائے پلائے اور کفالت کرے۔

لیچڑ اسامی:

کھری اسامی کا نقیض، نادہند، بدمعاملہ۔

موٹی اسامی:

سونے کی چڑیا، مالدار۔

یافت کی اسامی:

زیادہ مال ملنے والی نوکری، ملازمت جس میں رشوت کی خوب آمدنی ہو۔

اُستا [الف مضموم]

فارسی الاصل ہے اور استاد کا بگڑا ہوا۔ اردو میں بہت سے الفاظ بطور تفاول[۴] کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فضلہ اور بول و براز کو صاف کرنے اور اٹھانے والے کے لیے تقریباً

جتنے الفاظ ہیں ان سب میں اچھا مفہوم شامل ہے۔ مثلاً خاکروب کے معنی صرف جھاڑنے اور خاک دھول صاف کرنے والے کے ہیں۔ بھنگی کے اصل معنی بھنگ کا نشہ کرنے والے کے ہیں۔ چوں کہ اس طبقے میں شام کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر نشہ کرنے اور گانے بجانے، خوش گپیاں اور خوش فعلیاں کرنے کا رواج تھا اس لیے بھنگی یعنی بھنگ کا نشہ کرنے والا کہنے لگے۔ جس میں اصل پیشے کی طرف کوئی اشارہ نہ تھا۔ اور ایک لفظ تو بہت معزز ہے یعنی مہتر۔ مہ معنی بڑا۔ مہ تر۔ اس سے بڑا۔ مہترین [مہ ترین] سب سے بڑا۔ جس طرح بہ یعنی اچھا، بہتر اس سے اچھا اور بہترین سب سے اچھا۔ چترال میں تو حاکمِ چترال کا لقب ہی مہترِ چترال تھا۔

اسی طرح پانی بھرنے یا پلانے والا اصل میں سقہ ہے۔ پانی پلانے کی خدمت سقائی ہے۔ پیاسوں کو پانی پلانا نہایت عمدہ نیکی شمار ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے لکھا ہے:

یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی [۵]

اسی لیے پانی بھرنے والے کو بطور تفاول کے بہشتی کہنے لگے کیونکہ پانی فراہم کرنے والا بہشت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح خط بنانے، بال کاٹنے، حجامت بنانے والے کو نائی کہتے ہیں۔ یہ کچھ شائستہ لفظ نہ تھا۔ حجام میں بھی کچھ اسی طرح کا مفہوم ہے، اصل میں سینگی لگانے والے فصد لگانے والے کو [حجام] کہتے ہیں۔ نائی یہ کام بھی انجام دیتا تھا اس لیے حجام کہنے لگے۔ استاد بھی اسی معنی میں کہتے ہیں۔ یہ اچھے الفاظ ہیں۔ عوام کی بولی میں استاد بگڑ کر ''اُستا'' رہ گیا۔

استاد کی ہوشیاری اور کاری گری بھی ضرب المثل ہے۔ چالاکی کے بہت سے لطیفے بھی ہیں۔ شادی بیاہ میں بھی خدمات انجام دیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک جگہ تقریب میں جب حصوں کی تقسیم کا وقت آیا اور نائی سے دریافت کیا کہ اُس کے کتنے حصے ہوئے تو استا نے جواب دیا۔ آٹھ۔ وہ کیسے؟۔ اس نے

گنانے شروع کیے۔

''استاد، حجام، نائی، میں، میرا بھائی، گھوڑی، گھوڑی کا بچہ، اور مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں۔کل آٹھ ہوئے۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ اسامی: قادری صاحب نے یہاں سے اسامی سے بننے والے مرکبات مع معنی درج کیے ہیں جن کو ہم نے بطورِ تحتی یا ذیلی مرکبات درج کیا ہے۔

۲۔ سیر (بیائے معروف): اس سے مراد ہے وہ کاشت جو زمین کا مالک خود کرے۔(بحوالہ پلیٹس)

۳۔ غالب کے اس شعر کے متن کی دیوانِ غالب کی مدد سے تصحیح کی گئی۔دیکھیے: دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی)، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۹۲ء) ص ۲۵۷۔

۴۔ تفاول: فال لینا، شگون لینا نیز نیک شگونی کے خیال سے اچھا لفظ استعمال کرنا۔

۵۔ یہ شعر ''بانگِ درا'' کی نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' میں شامل ہے۔ملاحظہ ہو: کلیاتِ اقبال (اردو)، (لاہور: اقبال اکیڈمی، ۱۹۹۰ء) [باشتراک نیشنل بک فاؤنڈیشن]، ص ۲۴۳۔

☆......☆

(۴۲)

پرچین کاری [پ مفتوح، ی معروف]

پچھلی کسی قسط میں پرچین سازی کا ذکر آیا ہے۔ بطور اعادہ کے لکھا جاتا ہے کہ پروفیسر عبداللہ بلگرامی نے حلِ غوامض (۱۸۸۵ء) میں لکھا ہے کہ پچی کاری میں جو باریک خطوط، گل بوٹے ہوتے ہیں اس کے بنانے کو پرچین سازی کہتے ہیں۔

لیکن پرچین سازی کے علاوہ پرچین کاری بھی استعمال ہوا ہے۔ اس صدی کے ابتدائی عشرے میں آگرے کے مشہور شاعر، عالم اور بزرگ سید نظام الدین شاہ صاحب دل گیر اکبرآبادی تھے جو آگرے کی درگاہِ قادریہ کے صاحبِ نسبت بزرگ اور سجادہ نشین تھے۔ علاوہ سجادگی و خانقاہی شب و روز کے زندہ دل، بذلہ سنج اور اعلیٰ مذاق رکھنے والے ادیب، نقاد اور شاعر بھی تھے۔ ان کے ہم عصروں میں نیاز فتح پوری، ل۔احمد، عارف ہسوی، مانی جائسی، فانی بدایونی، میکش اکبرآبادی وغیرہ تھے۔

دل گیر شاہ صاحب نے آگرے سے اسی زمانے میں ''نقاد'' کے نام سے بلند پایہ ادبی رسالہ جاری کیا تھا۔ جو ایک بار بند ہو کر پھر ۱۹۱۷ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ اردو کے ادبی جرائد کی تاریخ جس طرح نیاز کے نگار کے بغیر نامکمل ہے، اسی طرح دل گیر شاہ صاحب کے ''نقاد'' کے ذکر کے بغیر بھی ادھوری رہ جاتی ہے۔

''نقاد'' کا زیادہ مفصل تذکرہ ان شاءاللہ کسی آئندہ تحریر میں ہوگا لیکن پرچین کاری کے سلسلے میں اس کا ذکر اس سبب سے ہوا کہ نقاد کے ماہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے شمارے میں مقبرۂ جہانگیر کے عنوان سے مولوی محمد شفیع الدین خاں صاحب ایم۔آر۔اے۔ایس۔ایم۔بی۔

ای۔ایس مرادآبادی کا نہایت طویل اور تحقیقی مقالہ شائع ہوا۔اس مضمون میں مشہور مؤرخ محمد صالح کمبوہ کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی محمد شفیع الدین خاں صاحب لکھتے ہیں:

''جیسا محمد صالح بیان کرتے ہیں مصنوع بہ صنعت پرچین کاری کہ دقیق تر از خاتم بندی است۔لفظ پرچین کاری اردو فارسی میں عام طور سے نہیں بولا جاتا۔برہانِ قاطع میں بھی یہ نہیں دیا گیا۔نہ جانسن کے مطبوعاتِ رچرڈسن میں اور نہ دوسرے فارسی لغات میں۔فرہنگِ آصفیہ میں بھی اس کا کوئی پتا نہیں۔نہ کسی اور اردو لغت میں۔لیکن برہانِ قاطع میں لفظِ پرچین کے معنی کسی نوک دار لکڑی یا کانٹوں کی باڑھ کے ہیں جو کسی کھیت کے گرد لگائے جاتے ہیں۔

اگر پرچین کے معنی کسی خشک نوک دار باڑھ کے ہیں تو اس کا اطلاق فنِ معماری کی باریک اور نازک صنعتوں پر ''مثلِ احجارِ رنگیں پرچین نمودہ و منبت کاری'' وغیرہ بالکل درست اور موزوں ہے۔پرچین کاری اور خاتم بندی کو کسی ایک ہی رشتے میں منسلک کرنا دشوار ہے۔ لیکن فرق بھی دونوں کے درمیان اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک دوسرے سے زیادہ نازک اور خوبصورت ہے۔نہ یہ کہ اصلی صنعت میں کوئی فرق ہے۔میں نے پرچین کاری کا ہم صورت ایک لفظ پرچین سازی ''آثار الصنادید'' (مُصنّفہ سرسید) میں دیکھا۔اور لفظِ پرچین کاری تو ''پادشاہ نامہ'' میں بھی نظر سے گزرا۔میں نے چند محلاتِ دہلی کی ''آثار الصنادید'' کو لے کر سیر کی۔اور مشاہدے سے یہ پتا لگایا کہ سرسید احمد خاں مرحوم (مؤلف آثار الصنادید) نے اس لفظ کے کوئی خاص معنی نہیں لیے بلکہ اس کو نقش و نگار، در و دیوار کے واسطے جو اندر کی جانب منقش ہیں استعمال کیا ہے۔یہی معنی دونوں

لفظوں کے ''پادشاہ نامہ'' میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً صاحب پادشاہ نامہ نے مقبرہ آصف خاں کا ذکر کرتے ہوئے باریک اور نیز موٹے کام کے لیے یہی دونوں الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان پتھروں میں سے بعض اب تک موجود ہیں لیکن مقبرۂ جہاں گیر کی پرچین کاری درحقیقت نہایت ہی باریک کام کا نمونہ ہے۔ جو خاتم بندی سے بہتر ہے۔ آج کل اردو میں خاتم بندی کے معنی اس لکڑی کی چھت گیری کے ہیں جو اقلیدس و مساحت کے قواعد پر قائم ہوئی ہو۔ اس قسم کی چھت گیریاں دہلی کے بعض پرانے مکانوں میں موجود ہیں اور دیوانِ خاص میں بھی اسی طرح کی ایک چھت ہے۔

بہارِ عجم اور فرہنگِ آصفیہ میں اس لفظ کے معنی لکڑی یا ہڈی پر نقش کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے ہم کو دونوں لفظوں میں ایک بیّن فرق کا پتا چلتا ہے۔ سنگِ مرمر کی پرچین کاری زیادہ خوبصورت اور نازک ہوتی ہے۔ بہ نسبت کسی اور ملائم اور کھد جانے والی شے کے۔ یہ سب باتیں اب تک مقبرے میں موجود ہیں اور چبوترے کے کنارے سنگِ موسیٰ سے مزیّن کیے گئے ہیں۔''

واحِد ہونا [ح مکسور]

اردو کا ایک محاورہ ہے واحد ہونا اور واحد شاہد ہونا بھی مستعمل ہے۔ مطلب ہوتا ہے بے تکلف ہونا، ہمسر ہونا، برابری سے دوستی کرنا یا دوستی رکھنا۔

فقرا کی بھی اصطلاح ہے۔ وہ اس معنی میں بولتے ہیں کہ ''ہم کو بھی کچھ دے ڈالو۔'' میر انشاء اللہ خاں انشا کا شعر ہے:

کچھ تو یاروں سے بھی واحد ہو کہ تا روزِ قیام
کہوں میاں عرش رہے تجھ پہ خدا کا سایہ

☆......☆

(۴۴)

گلستان کا بابِ پنجم

گلستان شیخ سعدی کی مشہور کتاب ہے۔اس کی مختصر حکایتیں، سلیس اور دل نشیں زبان میں بیان ہوئی ہیں جو حکمت، موعظت اور پند ونصائح سے بھرپور ہیں۔دنیا کی تمام [بڑی] زبانوں میں گلستان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

اس کے پانچویں باب میں جو حکایتیں ہیں وہ عشق ومحبت اور ہوس و ہوس ناکی کے مختلف پہلوؤں پر دل پذیر انداز میں روشنی ڈالتی ہیں لیکن عام طور پر مدرسوں میں بچوں کو گلستان کا باب پنجم نہیں پڑھاتے تھے۔فارسی سیکھنے اور سعدی کے طرزِ نگارش سے واقف ہونے کے بعد وہ ''بچے'' خود ہی بڑے ہو کر یہ باب پنجم بھی پڑھ لیتے تھے۔

یہی باب پنجم اردو فارسی شاعری میں بطور تلمیح کے داخل ہو گیا ہے۔

انشاءاللہ خاں انشا کا شعر ہے:

بابِ پنجم کی حکایت جو خوش آئی وہ طفل
کھول آغوش گیا اپنی گلستاں سے لپٹ

میر حسن لکھتے ہیں:

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا
پڑھیں بابِ پنجم گلستان کا (سحرالبیان)

بار

فارسی میں بوجھ کے معنی دیتا ہے۔اس کا استعمال مختلف النوع ہے۔ دوسری

تراکیب میں بھی مستعمل ہے۔

اردو میں چند معنی یہ ہیں:

۱۔عرصہ، تاخیر، دیر: میر حسن کا شعر ہے:

اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

۲۔نوبت، باری: نظیرا کبرآبادی نے لکھا ہے:

شراب وشیشہ وساغر کی بار آ پہنچی

۳۔بوجھ اور درنگ اور دفعہ: مولوی سبحان بخش صاحب نے لکھا ہے کہ عوام شنبہ کو بھی کہتے ہیں۔

''جمعہ کھیل کھلا دے۔بار پکڑ بلا دے''

یعنی جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔کھیلتے کودتے ہیں اور سنیچر یا شنبہ کو پکڑ کر مدرسے بلا لے جاتے ہیں۔

باری

بار سے باری، مگر معنی مختلف ہیں اور کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ کھڑکی

۲۔ ہندوؤں کی ایک پیشہ ور ذات جو تیل بتی وغیرہ کا کام کرتی ہے اور اسی لیے مشعلیں بنانے اور بیچنے والے کو بھی کہتے ہیں۔

۳۔ کان اور ناک میں پہننے کے ایک زیور کو بھی کہتے ہیں۔

۴۔ باغ، پائیں باغ، مکان جس کے ساتھ باغ ہو۔

باری دار

چوکی پہرہ دینے والے جو باری باری پہرہ دیں۔جن ملازموں کی کسی خدمت پر

باری باری سے تعیناتی ہوتی ہے وہ باری دار کہلاتے ہیں۔

مثنوی سحرالبیان میں میر حسن نے لکھا ہے:

جہاں تک کہ چوکی کے تھے باری دار
ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

باگ موڑنا [واوِ مجہول]

عام طور پر گھوڑے یا سواری کے جانور کی لگام موڑنے یا مڑنے کا اشارہ کرنے کے لیے مستعمل ہے لیکن کم معلوم مفہوم باگ موڑنے کا ہے: چیچک کے دانوں کا مرجھا جانا۔ کہتے ہیں کہ سیتلا (چیچک) نے باگ موڑ دی۔

نوراللغات نے برق کا یہ شعر مثال میں دیا ہے:

چیچک کی طرح غم سے سراپا ہوں آبلہ
مڑ جائے باگ وہ جو ادھر باگ موڑ دے

باؤبندی

باؤ ہوا کو کہتے ہیں۔ ہوا باندھنا بھی ایک محاورہ ہے۔ مگر اس کا مفہوم مختلف ہے۔ باؤبندی سے مراد ہے دھوکا، فریب، نظر بندی۔ ہو کچھ اور نظر کچھ اور آئے۔ جیسے غالب نے کہا ہے:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یعنی اصل شکل کچھ اور ہو اور ظاہری روپ جس سے دھوکہ ہو۔ قدیم شاعر آبرو کا شعر ہے:

زندگی ہے سراب کی سی طرح
باؤ بندی حباب کی سی طرح

شعر میں معنوی خوبی یہ ہے کہ حباب [یعنی] بلبلہ خود ہوا کے سوا کچھ نہیں۔ گویا حباب میں ہوا بند ہے۔ زندگی بھی محض دھوکا اور فریب ہے۔

باؤ کا رُخ بتانا

یعنی دھوکا دینا، ٹالنا، بہکانا، فریب دینا۔

مرزا جان طپش نے شمس البیان میں لکھا ہے:

''کنایہ ایست از فریب دادن وایں از روزمرۂ عوامِ بازار است۔''

[کنایہ ہے فریب دینے سے اور یہ بازاری لوگوں کے روزمرہ میں سے ہے]

محمد تقی گوید:

ٹالا نہیں اک مجکو پتنگ آج اڑاتے
بہتوں کے تئیں باؤ کا رخ ان نے بتایا

باؤلی

باؤلا کا مؤنث، دیوانی۔ مگر تعمیرات میں اور معنی بھی ہیں: بہت بڑا اور گہرا تالاب نما کنواں جس میں اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوں۔ مغلوں کی عمارتوں میں اکثر اس طرح کی باؤلیاں پائی جاتی ہیں۔

فارسی میں شکاری پرند یا جانور کو کسی دوسرے پرند یا جانور پر چھوڑنا۔ اس کے اور معنی یہ ہیں:

۱۔ وہ نقلی چڑیا وغیرہ جس پر شکاری پرند یا جانور کو مشق کرائی جاتی ہے۔

۲۔ اشتعال دینا۔ جھانسہ دینا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی ''گلزار نسیم'' میں لکھا ہے:

وہ جائے بکاؤلی بتائی
دیوانے کو باؤلی بتائی

باؤلی دینا

باؤلی دینا کے معنی شہ دینا، ہمت بڑھانا یا بڑھاوا دینا بھی آتے ہیں۔
مولوی نورالحسن صاحب نیر نے نوراللغات میں یہ شعر نقل کیا ہے:

دی دل کی باؤلی تری آنکھوں کو اس لیے
ان آہوؤں کو شیر بنانا ضرور تھا

☆......☆

(۴۴)

بَتاشا [ب مفتوح]

دور جدید میں نئی نئی شیرینیاں اور مٹھائیاں چل پڑی ہیں۔ قدیم مٹھائیوں کے نام اب قصے کہانیوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ بتاشا پہلے عام اور بہت سستی مٹھائی کا نام تھا۔[1] شکر کو پگھلا کر شیرے کی طرح بنا لیتے اور بوندیں ٹپکا کر نصف مدوّر شکل کی مٹھائی بناتے جسے بتاشا کہتے تھے۔ بہت چھوٹے دیہاتوں [کذا: دیہات][2] میں شاید اب بھی ملتی ہو۔

اسی کی شکل سے ملتا جلتا ایک چھوٹا گول تالا بنتا تھا اسے بتاشے کا قفل کہتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں شاہ آبرو کے بیان میں تشریحاً لکھا ہے کہ چھوٹا سا قفل، مقدار میں بتاشے کے برابر یا اس سے کچھ بڑا ہوتا تھا۔

شاہ آبرو کا شعر ہے:

کنجی اِس کی زبانِ شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاسے کا

یہ لفظ سین اور شین دونوں طرح لکھا جاتا ہے [یعنی بتاسا اور بتاشا]۔

بَت [ب مفتوح]

حساب کی کتابوں میں یا مسلوں میں ناموں کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کرنے کے لیے [ان کے اوپر] لکیر کھینچ دیتے ہیں۔ یا رقوم لکھتے وقت حساب کی مدات الگ کرنے کے لیے درمیان میں لکیریں کھینچتے ہیں ان کو بَت کہتے ہیں۔

بَت کے ایک اور معنی ہیں لکڑی کو لگنے والا کیڑا جو کشتیوں اور جہازوں کے تختوں کو

تباہ کردیتا ہے۔ بَت۔ بات کے مخفف کے طور پر بھی آتا ہے۔

بَت بڑھاؤ [ب مفتوح، واو معروف]

بات کو بڑھانے والا، لفاظی کرنے والا، ڈھو کے باز، فضول گو۔

بَت بنا [ب مفتوح، ب مفتوح]

جھوٹی باتیں بنانے والا۔

''نوراللغات'' نے اسیر کا شعر درج کیا ہے:

باتیں بنائیں ہم نے جو وصفِ دہن میں خوب
وہ ہنس کے بولے آپ بھی کتنے ہیں بَت بنے

بَت سونہا کرنا[۳] [ب مفتوح، واو مجہول، نون غنہ]

منہ پر کھلی کھلی سنانا۔ بغیر کسی لحاظ کے منہ در منہ مد مقابل ہو کر دل کی بھڑاس نکالنا۔

بُتّا [ب مضموم، ت مشدد]

بُتّا کے معنی ہیں دھوکا، فریب، چھل، مکر۔ اور بُتّا دینا ہے: دھوکا دینا، فریب کرنا۔

مرزا رفیع سودا نے لکھا ہے:

پیر اُن کا گر آوے وقتِ طعام
جائے لقمے کے کھاوے وہ دشنام
یوں ہی اٹھ جاوے اس کو دے بُتّا
ماریں نہیں جھوٹے ہاتھ سے کتّا[۴]

بُتّا نہیں آئی

مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے محاورات ہند میں لکھا ہے کہ بُتّا نہیں آئی، اس کے معنی ہیں کہ بارش کی کثرت سے زمین در گل ہے، اتنی خشک نہیں ہوئی کہ ہل جوتیں۔

بتولا [ب مفتوح، واو مجہول نیز معروف]

فریب، دھوکہ دہی، مضحکہ خیز بات کے معنی میں ایک [لفظ] ہے بَتولا۔ بتولے بنانا کہتے ہیں چکنی چپڑی باتیں کرنا، باتیں بنانی۔

''نوراللغات'' میں شوقؔ قدوائی کا یہ شعر ملتا ہے:

بتولے بنانے کو آئیں بوا
یہ بیٹے کا پیغام لائیں بوا

بتولے دینا، بتولے بتانا

بَتولے میں آنا کے معنی ہیں دھوکا، جُل، فریب، جھانسے، میں آنا یا اس میں پھنسنا۔

بَتولن/ بَتولی [ب مفتوح، واو معروف]

بتولن اسی لیے کہتے ہیں باتیں بنانے والی عورت [کو]، فریبن کو، بَتولی مسخرہ پن اور بھانڈ پن بھی ہے۔

بَدَخشاں [ب مفتوح، د مفتوح]

پاکستان اور خراسان کے مابین ایک علاقے کا نام ہے جہاں کے یاقوت مشہور ہیں۔ ملک کو بدخش اور بدخشاں دونوں کہتے ہیں۔

غالب اپنے ایک مکتوب میں جو نادراتِ غالب مرتبہ سید آفاق حسین میں درج ہے:

''بدخش، فارسی میں اسم ہے یاقوت کا اور یہ جو شہر کا نام بدخشاں ہے اسی سبب ہے کہ وہاں یاقوت کی کان ہے۔''

تیغِ مرا اگرچہ بوَد خفتہ در نیام
پولاد با بدخشِ بدخشاں برابر است

''تیغِ مرا میں جو''را'' ہے یہ اضافت کے معنی دیتا ہے۔یعنی میری تلوار کا فولاد یعنی لوہا اگر چہ تلوار میان میں ہو لیکن یاقوت کے برابر ہے، یعنی سرخ۔اگر چہ تلوار نہ کھینچوں اور کسی کو نہ ماروں تو بھی میری تلوار خون آلودہ ہے اور مانند یاقوت کے سرخ ہے۔خالق نے اس کی سرشت میں یہ صفت ودیعت کی ہے۔''

مرزا غالب نے فولاد کو مؤنث لکھا ہے۔حالانکہ یہ مذکر مستعمل ہے اب بھی اور خود ان کے زمانے میں بھی۔

فولاد کے مذکر ہونے کا اردو میں سبب اور ہے۔فارسی میں تذکیر و تانیث کے کوئی معنی اس طرح کے الفاظ کے ہیں نہیں۔اردو میں غیر حقیقی اشیا کی تذکیر یا تانیث اس کی مثل معلوم و معروف اشیا پر قیاس کی جاتی ہے۔فولاد کی مثل لوہا ہے۔لوہا اردو میں مذکر ہے اس لیے فولاد بھی اردو میں مذکر ہی مستعمل ہے۔

بُرد [ب مضموم، ر ساکن]

فارسی الاصل لفظ ہے، اس کے کئی معنی ہیں:

۱۔ مفت کا مال، پھوکٹ کی رقم، مفت میں ہاتھ لگی رقم۔

۲۔ شطرنج میں اگر حریف کے تمام مہرے پٹ جائیں اور صرف اس کا بادشاہ رہ جائے تو یہ شکست بُرد کہلاتی ہے اور اس کا درجہ شہ مات یعنی بادشاہ کے پٹ جانے سے کم ہوتا ہے۔اسی لیے بُرد آدھی شکست کو بھی کہتے ہیں۔

۳۔ ہارنا، کھونا، ضائع کرنا، تباہ و برباد ہو جانا۔اس سے اور محاورے ہیں۔

بُرد دینا:

آدھی مات دینا، کھونا، تباہ کرنا۔

بُرد لینا:

مات کھانا، کھونا، ہار مان لینا۔

بُردمارنا:

مال مارلینا، روپیہ ہتیالینا، رشوت لینا، بازی جیتنا، کامیابی حاصل کرنا۔

بُرد ہاتھ لگنا:

مفت کی رقم ملنا۔

☆......☆

حواشی

۱۔ بتاشا: پلیٹس کے مطابق بتاشا کے لفظی معنی ہیں چیز جس میں ہوا بھری ہو، بُلبلہ۔

۲۔ دیہات/دیہاتوں: چونکہ دیہات خود جمع ہے دیہہ کی، للہٰذا اس کی مزید جمع یعنی دیہاتوں غیر فصیح خیال کی جاتی ہے۔

۳۔ بت سونہا کرنا: یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس محاورے میں بَت ایک الگ لفظ ہے۔ پلیٹس نے اسے بت (بات کا مخفف) سے الگ درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مرکبات میں آتا ہے اور ''ہوا'' کے معنی میں ہے۔ بت سونہا کرنا کے معنی اس نے to ventilate لکھے ہیں، گویا بات کو عام کرنا۔ لیکن سونہا (نون غنہ اور واو مجہول) کا اندراج نہ پلیٹس نے کیا ہے نہ اردو لغت بورڈ نے۔

۴۔ جھوٹے ہاتھ سے کتا نہ مارنا: بہت کنجوسی کے لیے کہتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہاتھ سے (یعنی جس ہاتھ پر کھانا کھاتے ہوئے کھانا لگا ہو) کتا بھی نہیں مارتے کہ مبادا کھانے کے ذرّات چلے جائیں۔

☆......☆

(۴۵)

بلوا [ب مفتوح]

جھگڑے، دنگے فساد کے معنی میں ایک لفظ ہے بلوا۔ جان ٹی پلیٹس نے اپنی لغت میں اس کو سنسکرت سے ماخوذ بتایا ہے۔ سنسکرت سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ عربی میں غم، مصیبت، رنج والم، آزمائش کے معنی میں آتا ہے۔ فارسی میں بھی اسی معنوں میں مستعمل ہے۔ تاریخ کی فارسی کتابوں میں لڑائی فتنہ وفساد کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ:

''پشتو میں البتہ بلوا بمعنی شورش وفساد کو ''ل'' مصدر کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ نے افغانی وساطت سے اردوئے معلیٰ میں بار پایا۔''

بوجھ پکڑنا [واوِ مجہول]

بُوجھ بمعنی سمجھ، فہم، سمجھ بوجھ۔ سمجھا بُوجھا یعنی جانا پہچانا لیکن بوجھ پکڑنے[1] کے معنی ہیں نئے طور طریق اختیار کرنا، نئی عشوہ طرازیاں کرنا، نئے انداز وادا اختیار کرنا۔

مرزا جان طپش نے مصلحات ہندوستان میں لکھا ہے:

''کنایہ از تازہ تمکین ورزیدن واکثر بسبیل طنز گویند۔''

ترجمہ: اس سے کنایہ ہوتا ہے نئے انداز واطوار اختیار کرنا اور اکثر طنزاً بولتے ہیں۔

شرف الدین مضمون کا شعر ہے:

مہ رو نے بوجھ پکڑا مشکل ہوا ہے جینا
یارو خدا کرے خیر بھاری ہے یہ مہینا

بُکّا [ب مضموم، ک مشدد]

بُکّا کے معنی ہیں مٹھی، چٹکی، چُنگل۔ یا ایک چُنگل میں جتنا آئے۔

قدیم شاعر میر شیر علی افسوس نے لکھا ہے:

یہ ابرک کے ریزوں کے بُکّے اڑے
سروں پر وہ ہر مہ جبیں کے پڑے

بُکّے اڑانا:

خوشبو پھیلانا۔ خوشبو یا رنگ کی لپیٹیں اٹھانا۔

نور اللغات نے برق کا شعر دیا ہے:

اس گل کے سامنے نہیں جمتے گلوں کے رنگ
بُکّے اڑا رہا ہے چمن میں گلاب کے

بگ چھندا لگنا [ب مفتوح]

چھاندنا کہتے ہیں جانور کے اگلے دو پیروں کو باندھنا، اس طرح باندھ دیا جائے تو جانور بے بس ہو جاتا ہے۔ بگ مخفف ہے باگ کا جس کے معنی ہیں شیر۔ ہنٹر-ٹیلر نے اپنی لغت میں لکھا ہے کہ شیر کو دیکھ کر خوف سے بے حس و حرکت ہو جانے کی کیفیت کو بگ چھندا لگنا کہتے ہیں۔ جیسے پاؤں بندھ گئے ہوں اور آدمی بھاگ نہ سکے۔

بودلی [واوِ مجہول نیز معروف]

پلیٹس نے اس کی تحقیق میں سنسکرت مادے دیے ہیں۔ بودلا کے تحت لکھا ہے: مری دُلھَ۔ یا۔ مُگدھ+ل۔ اس کا کچھ تعلق اس مادے سے نہیں۔ اس لفظ کی تشریح جو پلیٹس نے لکھی لفظاً لفظاً ہنٹر-ٹیلر (۱۸۰۸ء) سے لی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہنٹر-ٹیلر

نے اس لفظ کا تلفظ واو معروف سے دیا ہے لیکن نور اللغات نے واوِ مجہول سے لکھا ہے۔ بودلی کے معنی ہیں احمق عورت، سیدھی سادھی، بھولی بھالی، سادہ لوح۔ ہنٹر-ٹیلر (۱۸۰۸ء) نے ایک اور معنی بھی لکھے ہیں جو پلیٹس (۱۸۸۴ء) نے نقل کیے ہیں۔ یعنی وہ عورت جو بے نوا فقیر کے ساتھ مردانہ بھیس میں رہتی ہے۔

بُور [واوِ معروف]

بروزنِ حُور۔ دو معنی ہیں: ایک تو بطور صفت کے آتا ہے جس کے معنی ہیں بنجر زمین۔ دوسرے معنی ہیں بھوسی، چورا، برادہ، چوکر۔ بُور کے لڈو گیہوں کی بھوسی کے لڈو بنتے ہیں جو دیکھنے میں خوشنما اور لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ سستے ہوتے ہیں لیکن کھانے میں گلے میں پھنستے ہیں خریدنے والا پچھتاتا ہے۔ اسی وجہ سے مجازاً ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بظاہر خوش نما اور اچھی ہو مگر دراصل خراب اور تکلیف دہ ہو، خراب شے، بد باطن شخص[۲]۔

ہنٹر-ٹیلر (۱۸۰۸ء) نے لکھا ہے کہ ایسے بڑے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو اپنے متعلقین و متوسلین کو بڑی بڑی امید دلائے اور وعدوں میں رکھے مگر دے دلائے کچھ نہیں۔ ایسے آدمی کی خدمت کرو تو ہاتھ کچھ نہیں آتا اور نہ کرو تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ شاید کچھ دے مرتا۔

دوسرے معنی یہ کہ آدمی جو دیکھنے میں اچھا لگتا ہو مگر ہو احمق۔

بھانْویں [نون غنہ، یائے مجہول]

اس لفظ کو بھاویں بھی لکھتے ہیں۔ مراد ہے سامنے، آگے، نزدیک، نظر میں، خیال خبر وغیرہ۔

ہائے دئی کیسی بنی اَن چاہت کے سنگ
دیپک کے بھانویں نہیں جل جل مرے پتنگ

ترجمہ: ہائے رے [بھگوان][۳]۔ مجھ پر کیسی بیتی، بے مہر (محبوب)

کے ساتھ چراغ کے نزدیک کچھ ہوا ہی نہیں اور پتنگا جل جل کر مر گیا۔

سودا کے دو شعر ہیں:

جب مری آتشِ دل کو نہ بجھا وے کوئی
اپنے بھاویں دو جہاں جل بجھے وہ آگ لگے

لوگ آباد ہیں بسے ہیں گانو[4]
تجھ بن اجڑے پڑے ہیں اپنے بھانو[5]

بہائی [ب مکسور]

پلیٹس نے اس کے لیے بھی سنسکرت کا مادہ تجویز کیا ہے لیکن ساتھ ہی سوالیہ نشان بھی لگا دیا ہے لیکن اس لفظ کی تشریح لفظاً لفظاً ہنٹر-ٹیلر (۱۸۰۸ء) سے لی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نور اللغات نے بھی اسی عبارت کا ترجمہ درج کیا ہے۔

بہائی اس مفروضہ پری یا روح کو کہتے ہیں جو بچوں کو ستاتی ہے۔ کبھی اچھی بات سنا کر ہنساتی ہے۔ کبھی ڈرا کر رلاتی ہے۔ بچے سوتے میں جو خود بخود کبھی ہنستے ہیں کبھی بسورتے ہیں اس کا یہی سبب فرض کیا جاتا ہے۔ ننھے بچوں کا جاگتے میں بھی یہی عمل ہوتا ہے۔

نور اللغات نے یہ شعر درج کیا ہے:

طرفہ غمگیں ہوں کہ روتی گئی وہ آہ شعور
آئی طفلی میں بہائی جو ہنساتے مجھ کو

☆......☆

حواشی

۱۔ بوجھ پکڑنا: قادری صاحب کو التباس ہوا ہے۔ یہ بُوجھ (بواوِ معروف) کا نہیں بلکہ بوجھ (بواوِ مجہول) کا ذکر ہے۔ جیسا کہ مرزا جان طپش نے مصطلحات میں لکھا ہے "بواوِ مجہول وجیمِ ہندی"

(خدا بخش لائبریری، ص ۱۳۷)۔ حالانکہ یہ اندراج اور مضموؔن کا شعر بھی قادری صاحب نے غالبًا پٹش سے لیا ہے۔ نیز مضموؔن کے شعر میں بھاری کھینچنے کا ذکر ہے اور یہاں بوجھ پکڑنا ''حمل سے ہونا'' کے معنی میں ہے۔ بھاری بھار سے ہے اور بھار کے معنی ہیں بوجھ یا وزن۔

۲۔ بُور کے لڈو: اور اسی لیے اردو میں کہاوت ہے: بُور کے لڈو کھائے سو پچھتائے نہ کھائے سو پچھتائے۔ کھانے والا تو اس لیے پچھتاتا ہے کہ گلے میں پھنستے ہیں اور نہ کھانے والا اس لیے کہ حسرت ہوتی ہے کہ کھالیے ہوتے، کیونکہ دیکھنے میں عمدہ اور لذیذ معلوم ہوتے ہیں۔ جس کام کے کرنے اور نہ کرنے دونوں صورتوں میں افسوس اور پچھتاوا ہو، اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں۔

۳۔ دیمی: بھگوان یا خُدا کے معنی میں ہے (بحوالہ پلیٹس)۔ قادری صاحب نے اس کا ترجمہ نہیں کیا تھا، ہم نے اضافہ کیا ہے۔

۴۔ گانو: گانو (گاؤں)، چھانو (چھاؤں) اور پانو (پاؤں) وغیرہ کا یہ املا بہتر ہے اگرچہ رائج نہیں۔

۵۔ بھانو/بھانویں: سودا کی اس سند سے ظاہر ہے کہ بھانویں اور بھاویں کے ساتھ بھانو بھی رائج تھا۔

☆.....☆

(۴۶)

بھوئی [واوِ مجہول نیز معروف]

برج کا لفظ ہے۔ قدیم اردو میں بہت مستعمل تھا۔ تلفظ اس کا واو مجہول اور واوِ معروف دونوں سے ہے۔ عام طور پر واو مجہول سے بولا جاتا ہے۔

معنی ہیں اس کے بوجھ اٹھانے والا، سواری اٹھانے والا، پالکی بردار۔ عام ملازم کو بھی کہتے ہیں جو اوپر کے کام کاج اور بوجھ ڈھونے یا بار برداری کے لیے ہو، قُلی کے معنی میں۔

میر امن نے اپنی مشہور کتاب باغ و بہار میں متعدد جگہ استعمال کیا ہے۔ مطبوعہ لندن ۱۸۵۱ء میں سیر دوسرے درویش کی میں ہے:

''اتنے میں خواجہ سرا کئی چوگوشے تورہ پوش بڑے بھوئیوں کے سر پر دھرے آکر موجود ہوا۔''

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''بموجب حکم بادشاہ کے اس آدھی رات کے عین اندھیری تھی ملکہ جو جونر بھونر میں پلی تھی اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی، بھوئی لے جا کر کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا انسان کا تو ذکر کیا ہے چھوڑ آئے۔''

بے وحدت

بے وحدت کے معنی ہیں بے حیا، بے لحاظ، بے ہودہ، اجڈ، بے شرم۔

انشاء اللہ خاں انشاء نے لکھا ہے:

دشت میں اپنے جو آیا قیس وحشت نے کہا
چل بے، بے وحدت پرے یاں کیوں لگایا بسترا

بیونگا [یائے مخلوط][1]

ایک آلہ ہے جس سے چمڑے کو صاف کرتے ہیں، چمڑا کمانے کا آلہ۔

محاورہ ہے: ابھی بیونگا نہیں پھرا۔ جو بچہ بہت ضدی اور بے کہا ہوا، اس کے لیے کہتے ہیں کہ ابھی بیونگا نہیں پھرا۔ یعنی ابھی اس کی کھال نہیں ادھیڑی گئی۔ اچھی طرح مرمت نہیں ہوئی۔

بیلہ وَر

مفتی غلام سرور لاہوری نے زبدۃ اللغات (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۲ء) میں لکھا ہے کہ بیلہ ور اس شخص کو کہتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے اسباب کا تاجر ہو۔ اس کو خوردہ فِروش بھی کہتے ہیں۔

بیجنتی مالا [یائے لین، ج مفتوح]

(بےَ جَنتی مالا) خوشبودار پھولوں کا ہار جس میں تلسی بھی شامل ہو۔

عام طور پر اہلِ ہنود [کذا][2] میں اس ہار کو کہتے ہیں جس میں عناصرِ خمسہ سے لیے ہوئے پانچ جواہر شامل ہوں: زمین سے نیلم، سمندر سے موتی، آگ سے یاقوت، ہوا سے پکھراج، خلا اور ایتھر سے ہیرے۔ ہندو عقیدے کے مطابق اس طرح حاصل کردہ جواہرات کی مالا وشنو بھگوان کے پہننے کی ہوتی ہے[3]۔

بھگواں [بھ مفتوح، نون غنہ]

نون غنے سے۔ برج سے اردو میں آیا۔ گیروے رنگ سے رنگے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔

بھگونہا [بھ مفتوح، واو مجہول، نون غنہ]

(نون غنہ) اس لال رنگ کو کہتے ہیں جو گیرو سے نکالا جاتا ہے۔

ہم تو رنگیں ہیں پریم رنگ شیام جو کے
تا پر بھگونہا رام کیسے کئی چڑھائے ہیں

ترجمہ: ہم تو شام کے پریم رنگ میں رنگے ہیں۔ اس پر اے خدا کیسے لال رنگ چڑھائیں۔

یہ مفہوم اس طرح پیدا ہوا کہ ہندو علم الاصنام میں شیام جو سری کرشن جی کا لقب ہے ان کا رنگ گہرا سانولا یا نیلا بتایا جاتا ہے۔

بُوڑی [واوِ معروف]

اردو میں برج سے آیا ہے۔ نیزے کی اَنی کو کہتے ہیں اور لکڑی یا چھڑی کی شام کو بھی۔ دستے کے حصے کو موٹھ کہتے ہیں اور دوسرے سرے کو نیچے والے حصے کو شام کہتے ہیں۔ بُوڑی بردار کے معنی ہیں: نیزہ بردار

بُوڑھی عید [واوِ معروف، یائے معروف]

مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے محاورات ہند (۱۸۹۰ء) میں لکھا ہے کہ اہل دہلی بوڑھی عید اس عید کو کہتے ہیں جو چاند ماہِ رمضان کا تیس دن کا ہو اور اگر انتیس دن کا ہو تو جوان عید کہتے ہیں۔

بنیٹی [ب مفتوح، یائے مجہول]

(بنے ٹی) بنیٹی کرنا بنیٹی پھرانا۔ ایک لکڑی کے دونوں سروں پر دو مشعلیں یا تیل میں ڈبو کر کپڑے کی دو گیندیں باندھتے ہیں۔ پھر جلا کر اس کو تیزی سے اس طرح گھماتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو روشنی کا ایک دائرہ سا نظر آتا ہے۔ میر حسن نے مثنوی سحر البیان میں کہا ہے:

زری کا وہ حلقہ سر اوپر دھرے
کہ جوں شب میں کوئی بیٹی کرے

بَندَرگھاؤ [ب مفتوح، ن ساکن، د مفتوح]

مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی محاورات ہند (۱۸۹۰ء) میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی زخم ایسا ہو جو کسی طرح اچھا ہی نہ ہو، بڑھتا چلا جاتا ہو تو اسے کہتے ہیں بندر گھاؤ کیونکہ بندر کی خاصیت ہے کہ زخم جب خشکی پر آتا ہے تو نوچ ڈالتا ہے۔ اس طرح وہ کبھی اچھا ہونے میں ہی نہیں آتا۔ اس محاورے کو اس مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں کہ ہر ایک اپنی سمجھ کا جدا جدا علاج کرتا ہے۔

بَندری [ب مفتوح]

بندر کی تانیث بھی ہو سکتی ہے اگر چہ عام طور پر اس کو بندریا کہتے ہیں لیکن برصغیر کا ایک شہر ہے مچھلی بندر وہاں نہایت عمدہ چھینٹ بنتی تھی۔ اسے بھی بندری کہتے تھے۔ ایک خاص طرح کی گھاس ہوتی ہے اسے بھی بندری کہتے ہیں۔

راج بندر:

ایک دوسرا شہر تھا وہاں بننے والی تلواریں اپنی خصوصیت کے باعث امتیاز رکھتی تھیں اور انھیں بھی بندری تلوار کہتے تھے۔

بِکَسنا [ب مکسور، ک مفتوح]

برج کا ایک لفظ ہے بکسنا۔ اسے وِکسنا بھی لکھتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں مرجھانا، پژمردہ ہونا، کمھلا جانا، ناخوش ہونا۔[۴]

میر حسن اپنی مثنوی سحر البیان میں لکھتے ہیں:

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی[۵]

☆...☆

حواشی

۱۔ بیونگا: قادری صاحب نے اس کا تلفظ یوں دیا ہے: بیُو نگا۔ اور پھر اس کی وضاحت یوں کی ہے: بے یوں گا۔ لیکن پلیٹس کے مطابق اس میں یائے مخلوط ہے (جو کیوں، کیا اور پیار جیسے الفاظ میں ہے)۔ پلیٹس نے بیونگا پھرنا بھی درج کیا ہے اور "اس پر بیونگا نہیں پھرا" لکھ کر بتایا ہے کہ شریر بچے کے لیے کہا جاتا ہے۔ قادری صاحب نے یہ مثال بھی غالباً پلیٹس سے لی ہے۔ البتہ پلیٹس کے تلفظ سے شاید انھیں اتفاق نہیں تھا۔

۲۔ اہلِ ہنود [کذا]: اہلِ ہنود کی ترکیب بالعموم درست خیال نہیں کی جاتی کیونکہ ہنود کہنا کافی ہے۔ اگرچہ فرہنگِ آصفیہ نے بھی بعض الفاظ کی تشریح میں اہلِ ہنود کی ترکیب برتی ہے۔

۳۔ بیجنتی مالا: اس کی تشریح پلیٹس سے لی گئی ہے۔ البتہ تُلسی کا ذکر اس باب میں پلیٹس نے نہیں کیا۔

۴۔ بکسنا: فیلن نے اس کے اور معنی بھی دیے ہیں، مثلاً: کلی کا کھلنا، ہنسنا، مسکرانا، خوش ہونا۔

۵۔ یہ شعر فیلن نے بھی بکسنا کے ساتھ درج کیا ہے۔

☆……☆

(۴۷)

گُل جَھڑی [گ مضموم، جھ مفتوح]

اب تقریباً متروک ہے۔ اس کے معنی الجھن، پریشانی، اُلجھاؤ، الجھٹا، بندھن بھی ہیں اور گرہ گانٹھ اور بندش بھی[1]۔ مرزا رفیع سودا نے لکھا ہے:

گرہ لاکھوں ہی غنچوں کی صبا یک دم میں کھولے ہے
نہ سلجھیں تجھ سے اے آہِ سحر اس دل کی گل جھڑیاں

میر حسن نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں لکھا ہے:

پڑی جب گرہ بارہویں سال کی
کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی

گُل ریز [گ مضموم، یائے مجہول]

ایک معنی میں پھول برسانے والی یا پھُل جھڑی ہے۔ پتلی سی لوہے کی تیلی پر مسالا لگاتے ہیں۔ جلانے پر اس سے چنگاریاں پھول کی مانند جھڑتی ہیں۔ شب برات میں آتش بازی کے طور پر بچے استعمال کرتے ہیں۔

گُل چَلا [گ مضموم، چ مفتوح]

ایک لفظ الگ ہے۔ اس کے معنی ہیں بے خطا نشانہ لگانے والا، قادر انداز۔ نوراللغات نے آتش لکھنوی کا یہ شعر دیا ہے:

خالِ مشکیں سے شکار اہلِ قلم کو کیجیے
گل چلے شیر سے کرتے ہیں نیستاں خالی

گلیر [گ مفتوح، ل مکسور، ی مفتوح]

عام طور پر سمجھتے ہیں کہ گلیر زیادہ گالی بکنے والے کو کہتے ہیں حالانکہ اس کے معنی ہیں: سست، نکما، کاہل، آرام طلب، غیر ذمے دار، بے کار، ناقابلِ اعتبار۔[۲]

گمت [گ مفتوح، م مفتوح]

اسمِ مؤنث ہے۔ برج میں بکثرت مستعمل تھا۔ اس کے دو معنی ہیں:

۱۔ راہ، سفر، راستہ، جادہ۔

۲۔ ہم سفری، ساتھ، سنگت، میل ملاپ، خوش وقتی، لطفِ صحبت۔

میر امن نے باغ و بہار میں پہلے درویش کی سیر میں لکھا ہے:

''اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے۔ ایک گمت رہیں یا جدا جدا ہو جاویں۔''

گھر جانا [گھ مفتوح]

گھر بمعنی مکان۔ گھر جانے کا مفہوم ہے گھر تباہ ہونا۔ بربادی ہونی، مصیبت آنی۔ شاہ قدرت اللہ قدرت کہتے ہیں:

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا
یار گھر جانے لگا اے وائے گھر جانے لگا

گھُرسنا [گھ مضموم، ر مفتوح]

گھُرسنا کے معنی ہیں گھسیڑنا، اٹکانا، کسی چیز کو دوسری چیز میں لگانا۔

میر و سودا نے بہت لکھا ہے۔ میر کے دو شعر ہیں:

کیوں سر چڑھے ہے ناحق ہم بخت سیاہوں کے
مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھرس اپنے

اک جمع کے سر اوپر روز سیاہ لایا
پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھس کر

گھونگری [واو مجہول نیز معروف، نون غنہ]

اس لفظ کا تلفظ واوِ مجہول اور واوِ معروف دونوں سے ہے۔ ایک طرح کی برساتی سمجھیے۔ موجودہ برساتی کی ایجاد سے پہلے کسی موٹے کپڑے یا کمبل وغیرہ کو دُہرا کر کے ایک طرف سے سی لیتے تھے۔ پھر اسے برقعے کی طرح بارش میں بچاؤ کے لیے اوڑھتے تھے۔ اب بھی دیہاتوں میں پرانی بوریوں کو اسی طرح تہہ کر کے عارضی بچاؤ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مرزا رفیع سودا نے ایک ہجو میں لکھا ہے:

کچھ ہوا پر بھی تم رکھو ہو نگاہ
گھونگھری پٹو کچھ بھی ہے ہمراہ
بولے یہ مینھ نہ تھا مجھے معلوم
ورنہ لاتا میں ساتھ اے مخدوم

گُھونگھٹ [واو معروف، نون غنہ، گھ مفتوح]

گُھونگھٹ یا گھونگٹ۔ پردہ، نقاب، آڑ کے معنی میں عام لفظ ہے۔ لیکن کچھ معنی بھی دلچسپ ہیں۔

گھونگھٹ کرنا:

نقاب ڈالنا، گھوڑے کا گردن پیچھے کھینچنا۔

گھونگھٹ کھانا:

فوج کا شکست کھانا، تتر بتر ہونا۔

گھونگھٹ کا دروازہ:

باغوں، پارکوں اور عام عمارتوں میں چھوٹا دروازہ ایک خاص وضع سے لگاتے ہیں

جس میں سے صرف ایک آدمی ایک وقت میں نکل سکتا ہے۔ نصف حصہ کمان کی شکل کا ہوتا ہے اور ایک پَٹ اس نصف دائرے کے اندر ہی اِدھر اُدھر ہو کر راستہ دیتا ہے۔

لا/ لَے [یاے لین]

برج کے علاقے میں عام ہے اور نواحِ آگرہ میں آج بھی بولا جاتا ہے۔

مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے لکھا ہے کہ پشتو میں تاہم، اب تک، ورنہ، یقیناً وغیرہ کی جگہ لا بولتے ہیں۔ رام پور میں بھی جاہل کہا کرتے ہیں ''لا میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ سب تمھارے منتظر ہیں۔ مگر اس نے پروانہ کی۔'' اس ''لا'' میں ''بلکہ'' کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ نواحِ آگرہ میں لاَ / لَے کے مفہوم میں علاوہ مندرجہ بالا مفاہیم کے بس، واہ، ارے، خوب! وغیرہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور یہ کلمۂ فجائیہ صرف برج یا اکبر آباد سے مخصوص نہیں۔ قدیم اردو میں ٹکسالی لفظ تھا۔ سب لکھتے اور بولتے ہیں۔

میرامن کو اپنے دہلوی ہونے پر ناز تھا۔ انھوں نے باغ و بہار میں دوسرے درویش کی سیر میں لکھا ہے:

> ''بوڑھے نے کہا کیا ٹرٹر کرتی ہے۔ ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں تب لون روٹی میسر آوے یا ایک روز جنگل سے باگھ لے جاوے۔ لَے۔ اپنا کام کر۔ ہمارے حاتم کاہے کو ہاتھ آوے گا۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ گُل جَھڑی: یہ گتھلک، شکن، بل، گُتھی نیز کدورت، رنج، شکر رنجی کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ (پلیٹس، علمی)

۲۔ گلیر: پلیٹس نے اس کے دو تلفظ دیے ہیں، ایک گ مفتوح اور دوسرا گ مکسور کے ساتھ۔ پلیٹس نے معنی بھی دو دیے ہیں، دوسرے معنی ہیں: گلا ہوا، سڑا ہوا۔

☆......☆

(۴۸)

شامل [م مکسور]

بعض معمولی الفاظ کا استعمال اردو بولنے والے مختلف علاقوں میں مختلف ہوتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ سنتے ہیں جو ہم اس طرح نہیں بولتے تو تعجب ہوتا ہے اور کبھی کبھی ہنسی بھی آتی ہے۔ حالانکہ الفاظ کے استعمال میں نہ تعجب کی بات ہے، نہ ہنسی کی۔ جب ہم کسی مانوس الفاظ کا اجنبی استعمال سنیں اور دیکھیں تو ہم کو غور تو کرنا چاہیے کہ اس کی وجہ کیا ہے اور کچھ نہ کچھ وجہ ضرور دریافت ہوگی۔ زبان اور لسانیات میں بے وجہ امور کم ہی ہوتے ہیں۔ خواہ فوری طور پر قیاس میں نہ آسکیں۔

ایک لفظ ہے: شامل۔ اتنا معمولی اور عام ہے کہ اس کے معنی بتانے کی ضرورت نہیں۔ روزمرہ اور محاورے میں بھی استعمال اس قدر کثرت سے ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی مشکل نہیں۔

صوبۂ بہار کے اردو داں طبقے میں اس کا استعمال شمالی ہند کی بولی سے مختلف ہے۔ ایک صاحب نے جو شمالی ہند کی اردو بولی کے لب و لہجے میں گفتگو کرتے تھے بطور لطیفے کے سنایا کہ ایک مرتبہ میں پٹنہ (بہار) سے ریل میں سفر کر رہا تھا۔ ایک اسٹیشن پر جو گاڑی رُکی تو برابر کے ڈبے سے ایک صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور پوچھنے لگے۔ ''آپ کے شامل بدھنا ہے۔'' بدھنا تو خیر میں بقدرے تامل سمجھ گیا کہ لوٹے کو پوچھتے ہیں لیکن شامل بدھنا ہے، یہ نہیں سمجھا۔ اتنے میں کہ پوچھوں کہ صاحب یہ شامل بدھنا کیا ہوتا ہے گاڑی چل دی۔''

یہ لطیفہ سنا کر وہ صاحب خوب ہنسے۔ بعد میں پتا چلا کہ واقعی بہاری اردو میں یہ استعمال عام ہے۔ظاہر ہے شمالی ہند کی اردو میں نہیں اور انھیں عجیب لگتا ہے اور ہنسی آتی ہے بلکہ اسے اب باقاعدہ لطیفے کا درجہ مل چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''آپ کے پاس ہے'' یا ''آپ کے ساتھ ہے'' اور محض ''ساتھ'' کے معنی میں شامل کا استعمال اہلِ بہار کی ایجاد یا تخصیص نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم اردو میں عام تھا۔ عامی عالم سب بولتے تھے۔ بعد میں لسانیات کے پراسرار اور مخفی عمل کے تحت شمالی ہند سے خارج ہو گیا اور اس معنی میں وہاں صرف ''ساتھ'' بولنے لگے لیکن بہار کے علاقے میں رائج رہا اور اب بھی اس کا سکہ چلتا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ثبوت کیا؟ تو ثبوت اس کا خاصا دلچسپ ہے۔ مرزا اسد اللہ غالب جیسے شاعر نے شامل کے لفظ کو بالکل اسی معنی میں استعمال کیا ہے جس معنی میں ان بے چارے بہاری صاحب نے کہا تھا ''آپ کے شامل بدھنا ہے؟'' مرزا غالب اپنے شاگرد نوابِ رام پور کے اصرار پر رام پور گئے اور وہاں کچھ دن مقیم رہے۔ چلتے وقت ایک الوادعی قطعہ کہہ کر نواب صاحب کو پیش کیا۔ اس میں کہتے ہیں:

دیدہ خوں بار ہے[١] مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون [کے][٢] شامل آئے
اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرتِ نوّاب سے بھی مل آئے

شامل کا لفظ اس مصرعے میں بالکل اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح اہلِ بہار بولتے ہیں۔

اِستِعمال [الف مکسور، ت کسرۂ مجہول]

اسی طرح ''استعمال'' کا لفظ ہے۔ پُوربی محاورے میں یہ لفظ مشق اور ربط کے معنی

میں بھی آتا ہے مثلاً: آپ کو گھوڑے پر چڑھنے کا استعمال ہے۔

اِستِعمالی چاوَل

ایک قسم کے عمدہ چاول کو کہتے ہیں جو عرصے تک رکھنے کے بعد زیادہ اچھا ہو جاتا ہے اور عام چاول کی نسبت مہنگا ہوتا ہے۔

اَساوَری [الف مفتوح، واؤ مفتوح][۳]

گانے کے ایک انداز کو کہتے ہیں لیکن اس کے اور معنی بھی ہیں:

۱۔ ایک قسم کا کبوتر۔

۲۔ ایک قسم کا ریشمی کپڑا جس میں لال زرد اور سبز دھاریاں ہوتی ہیں اور طول میں روپہلے تاروں سے بُنا ہوتا ہے۔

نور اللغات نے یہ شعر دیا ہے:

نمگیرے تھے اساوری کے، بادلے کے جال
جھالر سے موتیوں کی جدا سائبان نہ تھا
(منیر)

نِساوری[۴] [ن مکسور، واو ساکن]

ایک قسم کے کبوتر کو کہتے ہیں۔

اَساڑھ [الف مفتوح][۵، ۶]

ایک دیسی مہینے کا نام ہے۔ اس کی مختلف شکلیں یہ ہیں:

آساڑھ، اساڈھ، ساڑھ، ساڈھ۔

فصلی کے حساب سے دسواں، سمبت سنہ کے حساب سے چوتھا مہینا ہوتا ہے، برسات کا پہلا مہینہ ہے۔ اس وقت سورج حمل/ جوزا میں ہوتا ہے۔ انگریزی حساب سے جون، جولائی۔

اَساڑھ کے درزی

پہلے اساڑھ کے مہینے میں درزیوں کا کام زیادہ چلتا تھا۔اس لیے طنزاً اس شخص کو کہتے ہیں جو بیکار مارامارا پھرے اور کوئی اسے نہ پوچھے۔

اَساڑھی [الف مفتوح]

دو معنی ہیں۔ایک تو غلے کی وہ فصل جو اساڑھ کی پہلی بارش ہوتے ہی بوئی جاتی ہے۔جس میں جوار باجرا شامل ہے۔

دوسرے اساڑھ کے مہینے میں پورے چاند کی رات کو بھی اساڑھی کہتے ہیں۔ چودھویں رات یا پورن ماشی۔

اُس [الف مضموم]

اسم اشارہ ہے۔مختلف شکلیں اس کی ہیں۔وس۔وہ۔وو۔او۔وا۔ پراکرت میں ایہہ۔پالی میں اسو۔تد۔

روزمرہ اور محاورے میں طرح طرح سے استعمال ہوتا ہے:

اُس سرے کا:

یعنی حد سے زیادہ، پلّے (پرلے) سرے کا۔

فقرہ: وہ اُس سرے کا بدمعاش ہے۔

اُس:

بطور ضمیر کے انتہائی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے بھی آتی ہے:

فقرہ: اُس کے نام کا کتا بھی نہیں پالتے۔

اُس نے رکھا، اِس نے اٹھایا:

انتہائی مماثلت کے لیے بولتے ہیں۔اگر دو افراد کے اعمال اور حرکات وسکنات بالکل یکساں ہوں اور امتیاز مشکل ہو تو اس طرح کہتے ہیں۔شوق قدوائی کا شعر ہے:

قیس گیا تو شوق اب آیا
اُس نے رکھا اِس نے اٹھایا

اُس بات:
جنسی صحبت کے لیے بطور کنایہ استعمال کرتے ہیں۔ ریختی گو شاعر نازنین کا شعر ہے:

نہ پاؤں مُرؤُدنے اُس بات پر بہت پھیلا
مرا خدا کی قسم ان دنوں ہے سر مَیلا [۸]

☆......☆

حواشی

۱۔ قادری صاحب نے پہلے مصرعے میں ''تھا'' لکھا تھا۔ صحیح ''ہے'' ہے۔ دیکھیے: دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص۴۳۴۔

۲۔ قادری صاحب نے لفظ ''کے'' کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔ اضافہ کیا گیا۔ دیکھیے: دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص۴۳۴۔

۳۔ اَساوری: پلیٹس کے مطابق اس کا ایک املا الف ممدودہ سے بھی ہے یعنی آساوری۔

۴۔ نِساوری: پلیٹس کے مطابق یہ لفظ نساورا ہے اور خط لے جانے والے کبوتر کے لیے آتا ہے۔

۵۔ اَساڑھ: اس کا ایک تلفظ آساڑھ بھی ہے۔ (پلیٹس)

۶۔ اس قسط میں شامل بعض اندراجات (مثلاً ''اساڑھ'' اور ''اُس'' وغیرہ) اس سے پہلے قسط ۳۷ میں آ چکے ہیں لیکن چونکہ متن میں ذرا فرق ہے اور کہیں کہیں اضافی معلومات بھی ہیں لہٰذا ہم نے انھیں یہاں برقرار رکھا ہے۔

۷۔ اساڑھ: یہ بکرمی سال کا تیسرا مہینا ہوتا ہے اور اس کی تطبیق جون/ جولائی سے ہوتی ہے۔ (پلیٹس) فیلن کے مطابق یہ ہندو شمسی سال کا چوتھا مہینا ہے۔

۸۔ سر مَیلا ہونا: عورتوں کی زبان میں اس سے مراد ہے حیض سے ہونا۔

☆......☆

(۴۹)

اَسرَار/اِسرار [الف مفتوح/الف مکسور][1]

[الف کے زبر سے] جمع ہے سِرّ کی۔ بمعنی بھید، راز، پوشیدہ باتیں، رموز۔ عربی لفظ ہے۔ اردو میں الف کے زیر سے اِسرار بھی بولتے ہیں اور اس کے معنی ہیں جن، بھوت، پری، آسیب کا سایہ وغیرہ۔

شوق قدوائی کا شعر ہے:

کوئی کہتا تھا ہے کوئی آزار
کوئی بولا نظر کا ہے اِسرار

میر حسن نے مثنوی سحر البیان میں لکھا ہے:

کسی نے کہا یہ تو دلدار ہے
کسی نے کہا کچھ یہ اِسرار ہے

آسکت [س ساکن، ک مفتوح]

سکت اردو میں قوت، طاقت، توانائی کو کہتے ہیں۔

الف نفی کا [ہے] - اَسکت یا آسکت [کے] معنی ہیں:

۱۔ سُستی، کاہلی، پڑیل پن، نکما پن، ناکارہ [پن]، بے عملی۔

فقرہ: ہاتھ کی آسکت منہ میں مونچھ۔

۲۔ اونگھ، غنودگی، خواب آلودگی۔

۳۔ ٹال مٹول، لیت لعل، حیلہ حوالہ۔

اسی سے فعل ہے آسکتانا [س ساکن، ک مفتوح]۔ اس فعل کی دیگر شکلیں ہیں
اسکتانا، اسکتیانا، الکسانا، آلکس آنا۔ معنی ہیں اس کے:

کام کو ٹالنا، جی چُرانا، کام چوری کرنا، حرام خوری کرنا، وقت ضائع کرنا، کام نہ
کرنا[1]۔

پوربی محاورہ ہے: نِس[2] دن کھانا کام کو اسکتانا۔

آسکتی اسمِ مذکر ہے۔ دوسری شکلیں اس لفظ کی ہیں اسکتی، آلکسی، آلکسیا۔
کاہل اور سُست کے معنی میں آتا ہے۔

کہاوت: آسکتی گرا کنویں میں، کہا ابھی کون اٹھے۔

یعنی کنویں میں گر پڑا اس کے باوجود کاہلی اور سُستی اتنی سوار ہے کہ باہر نکلنے کو
بھی تیار نہیں۔ کہتا ہے کہ گر پڑے تو بس پڑے ہیں۔ جلدی کیا ہے۔ نکل آئیں گے۔

کہاوت: رام نام کو آسکتی بھوجن کو تیار۔

یعنی عبادت میں سستی اور کھانے پینے کو تیار۔

غالب نے اس مفہوم کا ایک شعر فارسی میں بڑا موثر کہا ہے:

در پرستش[3] سُستم و در کامجوئی استوار
پادشہ را بندۂ کم خدمت[4] و پُر خوار ہست

ترجمہ: میں اطاعت میں سست ہوں مگر اپنے مطلب اور کام جوئی
میں مستعد۔ گویا آقا کے کام چور اور نوالہ حاضر ملازم کی طرح ہوں۔

اُسیر کرنا [الف مضموم، یائے مجہول]

(اُسے رکرنا) کئی معنوں میں آتا ہے:

۱۔ یاد کرنا، ذہن میں رکھنا، خیال میں رکھنا۔

۲۔ جدائی محسوس کرنا۔ جیسے بچے کو ماں کی ہُڑک ہوتی ہے۔

فقرہ: بچہ ماں کی اُسیر کرتا ہے۔

۳۔ ناخوش ہونا، غصہ کرنا۔

گیت کا بول ہے:

مجھے پنیا بھرن کو جانا بلما کریں گے اُسیر

یعنی مجھے ضروری پانی بھرنے پنگھٹ پر جانا ہے۔ میرا محبوب جو اس طرح باہر جاتے دیکھے گا تو ناخوش ہوگا۔

اِشتِہار [الف مکسور، ت کسرۂ مجہول]

اس دور کا بدنامی کی حد تک مشہور لفظ ہے قدیم محاورے میں بھی معنی یہی تھے لیکن استعمال بعض دفعہ مختلف طرح ہوتا تھا۔ مشہور ہونا، معلومِ عوام ہونا۔ اس کے علاوہ دھاک بیٹھنا اور اثر و رعب قائم ہونا بھی تھا۔

میر تقی میر نے اس کو بہت لکھا ہے:

ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
ازبسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

انشاء اللہ خاں اِنشا کہتے ہیں:

غزل اور بحر میں انشاء اب تو بدل کے قافیہ کوئی پڑھ
کہ جہاں کے اہلِ سخن کو ہے ترے اشتہار نے غش کیا

اِغماز [الف مکسور]

عربی لفظ ہے۔ مادہ غَمَزَ کے بہت معنی ہیں۔ ان میں آنکھ سے اشارہ کرنا، قیمت کم کرنا، قدر گھٹانا، عیب لگانا یا عیب ظاہر کرنا بھی ہے۔

اردو میں اس کے معنی قدرے مختلف ہیں اور زیادہ تر ناز و انداز اور نخرے کے معنی میں آتا ہے لیکن روگردانی کرنا، پہلو تہی کرنا، بے التفاتی دکھانا، آنکھ چُرانا وغیرہ کے معنوں

میں بھی استعمال ہوتا ہے [کذا: وہ لفظ اغماض ہے]۵۔

میر حسن مثنوی سحر البیان میں لکھتے ہیں:

چلیں ایک اغماز اور ناز سے
کھڑی واں ہوئیں ایک انداز سے

اکالہ [الف مفتوح، ک مشدد]

(عربی میں ہے آکِلَة، مراد ہے عضو کو کھانے والی بیماری یا زخم)

اسے ایک طرح سے کینسر سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ جسم یا عضو کو گلا دینے والی بیماری ہوتی ہے۔

حالی نے سر سید کی سوانح عمری حیات جاوید میں اس لفظ کا استعمال اسی طرح کیا ہے جیسے جدید صحافتی اردو میں کینسر کا لفظ مجازاً استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ مذہبی تعصبات مادۂ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں۔''

اُکسنا/اُکسانا [الف مضموم، ک مفتوح/الف مضموم، ک ساکن]

لازم یا متعدی۔ معنی ہیں جوش میں آنا، ابھرنا، بنانا، آگے بڑھانا، چلانا، اوپر آنا، اونچا کرنا، چڑھنا۔ چراغ کی یا لالٹین کی بتی اونچی کرنے کے لیے بھی بتی اکسانا کہتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی لکھتے ہیں:

سو سو طرح کے حیلے دل میں اکستیاں ہیں
کیا جوش بھر رہی ہیں کیا جوش مستیاں ہیں

☆......☆

حواشی

۱۔ اسرار: یہ اندراج قسط ۳۷ میں بھی موجود ہے لیکن ہم نے اسے یہاں برقرار رکھا ہے کیونکہ متن میں کچھ تفاوت ہے۔

۲۔ نِس: نِس یا نِسا کے معنی ہیں رات۔ نِس دن یعنی رات دن، ہر وقت۔ اور یہ محاورہ نہیں کہاوت ہے۔

۳۔ قادری صاحب نے ''اطاعت'' لکھا تھا۔ دیوانِ غالب فارسی میں ''پرستش'' ہے۔ دیکھیے: کلیاتِ غالب فارسی، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلسِ ترقی ءادب، ۱۹۶۷ء) ص ۱۱۔

۴۔ قادری صاحب نے ''طاعت'' لکھا تھا۔ دیوانِ غالب (فارسی) میں ''طاعت'' کی بجائے ''خدمت'' ہے۔ دیکھیے: کلیاتِ غالب فارسی، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (لاہور: مجلس ترقی ءادب، ۱۹۶۷ء) ص ۱۱۔

۵۔ اِغماز/ اِغماض: قادری صاحب یہ روانی میں لکھ گئے لیکن چشم پوشی یا بے پروائی کے معنوں میں اِغماز نہیں اِغماض ہے۔ (اسٹین گاس، علمی) اقبال کا شعر ہے:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

(ضربِ کلیم، دین و تعلیم، دیکھیے: کلیاتِ اقبال، مطبوعہ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۹ء، طبع نہم، ص ۵۹۹)

☆……☆

(۵۰)

مولوی سیّد احمد دہلوی

اس سلسلۂ مضامین میں مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی کا اکثر حوالہ آیا ہے۔ سیّد احمد صاحب عرب سرائے کے رہنے والے تھے جو قدیم دہلی سے باہر کا علاقہ شمار ہوتا ہے۔ سرکاری ملازم بھی تھے۔ علاقہ دہلی کے اتھنوگرافی سروے کے سپرنٹنڈنٹ تھے (یہ انگریزی الفاظ مولوی سیّد احمد صاحب نے خود اسی طرح تحریر فرمائے ہیں۔ ہم نے تبرکاً نقل کیے)۔ پنجاب کی ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ بڑے عالم اور زبان داں تھے۔ فرہنگِ آصفیہ کے نام سے ضخیم لغت مرتب کی ہے۔ جس کے حوالے بار بار گزر چکے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ صرف اس ایک لغتِ فرہنگ آصفیہ کے سبب مولوی سید احمد صاحب دہلوی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

انھیں اردو زبان، الفاظ، محاورہ، روز مرہ پر نہ صرف عبور تھا بلکہ خاص بیگماتی محاورے، زبانِ اردو معلّٰی اور لال قلعے کی شہزادیوں اور بیگموں کے محاوروں اور الفاظ و ضرب الامثال پر مکمل عبور حاصل تھا۔

انھیں تعلیمِ نسواں سے بھی شغف تھا اور خاص طور پر عورتوں کے واسطے زنانہ رسالے یا اخبار کی ایجاد کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔[1]

انھوں نے خود لغات النسا کے دیباچے میں لکھا ہے:

"ہم نے ۱۸۸۴ء میں پہلے پہل بیگماتِ دہلی وقلعہ کی زبان میں ایک اخبار نکالا۔ جس کا نام اخبار النساء رکھا۔ اس اخبار نے دو برس میں

ازحد ترقی کی۔ عورتوں کو پڑھنے لکھنے کا چسکا ڈالا۔ قصے، کہانیوں، داستانوں کی بجائے یہ اخبار گھر گھر پڑھا اور سنا جانے لگا۔ بعض قدر دانوں نے بلا معاوضہ سو سو روپے سے اس کی امداد کی۔ اردو [کے] نامی اخبارات نے زنانہ زبانِ دہلی واہلِ زبان نے اس پر زوردار تبصرے لکھے۔ کوئی زبان پر معترض نہ ہوا۔ اس کی دلچسپی نے مشکل سے مشکل اخلاقی مضامین کو بھی پانی کر دیا ....اس اخبار کی اس قدر قدر افزائی ہوئی کہ بند ہو جانے پر بھی اس کا فائل دگنی چوگنی قیمت پر لوگوں نے خریدا۔ ..اسی اخبار نے سب سے پہلے عورتوں میں علمی روح پھونکی۔''

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے ہی اسی ذوق وشوق کے تحت ایک خاص لغت محاورۂ نسواں کی مرتب کی، لغات النساء کے نام سے۔

وہ ابھی اس طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ ۸رفروری ۱۹۱۲ء کو ان کے مکان میں آگ لگ گئی اور ایسی لگی کہ بقول غالب:

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اس کی اندوہ ناک تفصیل خود مولوی سید احمد صاحب دہلوی سے سنیے:

''۱۹۱۲ء میں ہمارا مسکن ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ جس میں شمال رویہ دالان در دالان غرب رویہ ایک دیوار بیچ کمرہ اور شرق رویہ اس کمرہ کا جواب۔ باقی تمام ضروریات کے واسطے چھوٹی چھوٹی سی مکانیت کافی تھی۔ صحن کچھ بڑا نہ تھا۔ چار پانچ چار پائیاں بچھ سکتی تھیں۔ جانبِ غرب دروازہ اور اس کے شمالی پہلو میں ایک چھوٹا سا کمرہ اور ننھا سا دربستہ دالان۔ چوں کہ مکان بہت بڑا نہ تھا اس سبب سے فرہنگِ آصفیہ کی پہلی دوسری نیز تیسری طبع شدہ جلدیں جو انھی دنوں

میں لاہور سے آئی تھیں، انھیں بوریوں میں بھر بھر کر نصف دالان میں چھت تک انبار لگا دیا تھا۔ اسی دالان کے اندر زچہ خانہ تھا۔ جس میں زچہ اور اس کا چار مہینے کا پھلر واسا بچہ سوتا تھا۔ برابر کے دالان میں ایک شریف زادی ہمسائی اور اس کی ہفت سالہ معصوم لڑکی پڑی سوئی تھی۔ ۸ر فروری کی شب بھی ہمارے حق میں غضب آتش بار شب تھی۔ کڑکڑاتا جاڑا پڑ رہا تھا۔ برف سے بجھی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ غریب گدڑیوں میں، امیر لحافوں میں منہ ڈھانکے پڑے سو رہے تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایک کا عمل تھا۔ زچہ خانہ کے قریبی ولان میں گھی کے ہنڈے اور مٹی کے تیل کا کنستر رکھا ہوا تھا۔ روئی کے پردے اندر اور باہر چھوٹے ہوئے تھے۔ دُھر بیچ میں کوئلوں کی انگیٹھی دہک رہی تھی۔ اس پر ایک اونچا لوہے کا تسلا اور تسلے کے اوپر نوزائیدہ بچے کا نہالچہ سوکھ رہا تھا۔ کوئلوں کی چنگاری من پروں اڑ کر نہالچے پر جا بیٹھی۔ نہالچے کو اپنا بستر بنا چاروں طرف ہاتھ پاؤں پھیلائے جس سے شعلہ اڑ کر کتابوں کی بوریوں گھی کے برتنوں اور روئی دار پردوں میں پہنچا۔ سونے والوں کو اول دھیمی دھیمی گرمی اچھی معلوم ہوئی اور سب ہی کروٹیں بدل بدل کر خراٹے لینے لگے۔ جب آدھے گھر کے قریب جل چکا تو اس کے دھویں اور آگ کی لپٹوں نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ برابر کے کمرے میں ہمارا دفتر تھا۔ مگر ہم بھی حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کی زیارت سے فارغ ہو کر دن بھر کے تھکے ماندے گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔ اول ہمسائی کی آنکھ کھلی۔ انھوں نے اپنا لحاف سنبھالا اور ہفت سالہ بیٹی کو جگا کر کہا کہ باہر نکل، وہ بھڑکتے

ہوئے شعلے دیکھ کرالٹی اندر چلی گئی اور وہیں بھسم ہو کر رہ گئی۔ اتنے میں گھر والی زچہ کو خبر ہوئی۔ وہ پہلے تو تنہا صحن تک آئی۔ پھر اپنے بچے کو لینے اندر چلی گئی۔ اسے گود میں اٹھا کر غسل خانے میں آ کھڑی ہوئی۔ اس وقت آگ لگ جانے کا شور مچ گیا۔ دو چار پاس پڑوس کے آدمی آ گئے۔ ہم نے اپنی گھر والی سے ہر چند کہا کہ دروازے میں آ جاؤ مگر یہی جواب ملا کہ غیر مردوں کی آواز آ رہی ہے ہم کیوں کر آئیں۔ اس کی ہٹ سے ہمیں اس وقت بہت بڑا رنج ہوا اور کوئی تدبیر زچہ اور اس کے بچے کے باہر آنے کی نہ سوجھی۔ کیوں کہ بیچ میں آگ کے شعلوں کا دریا لہریں مار رہا تھا چونکہ خدائے تعالیٰ کو یہ دونوں جانیں بچانی منظور تھیں۔ ہمارے دل میں یہ بات ڈال دی کہ غسل خانے کی دیوار کا آثار بہت کم ہے۔ اسے توڑ کر ان دونوں دموں کو نکال لاؤ۔ مگر اس وقت پھاؤڑا اور کدال کہاں۔ سنگ خارا کے ڈبوروں اور کتلوں سے اس دیوار کو پھوڑ کر ایک چھوٹا سا بھباقا کر لیا اور اسے اتنا بڑھا لیا کہ ان دونوں جانوں کو گھسیٹ کر نکال لائے۔ بیوی کے پاس سر کے دوپٹے کے سوا کچھ نہ تھا اور ہم بھی صرف شبینہ پوشک پہنے ہوئے تھے۔ جوں توں کر کے ایک شریف ہمسائے کے مکان میں پہنچا دیا۔ رات بھر بچہ اور اس کی ماں جاڑے میں اکڑتے اور سوں سوں کرتے رہے۔ بچے کے ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ماں کا جسم رات بھر کانپتا اور تھرتھراتا رہا۔ اس پر دل نے بھی پنکھا بن کر سردی پر سردی پہنچانی شروع کی۔ آگ کا یہ حال تھا کہ چھت کی کڑیاں آتشیں اژدھے بن کر چاروں طرف پھنکاریں مار رہی تھیں اور پٹاؤ کے تختے گرگٹ بن کر انھیں دھونک رہے تھے۔

آتشِ خلیل کا سماں بندھ رہا تھا۔ دالانوں کے سنگین ستون جو بت بنے کھڑے تھے۔ ان کا جگر بھی اس نظارے سے پھٹ گیا تھا اور تڑاق تڑاق زمین پر گرنے لگے۔ مکان کی دیواریں تنور کے پاکھے بن کر دہکنے لگیں۔ چھتیں زمین پر آ پڑیں۔ جو کچھ مال اسباب تھا اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ اگرچہ آدھا مکان جل جانے کے بعد پولیس میں اطلاع پہنچی اور اس نے واٹر ورکس کے چوکیدار کو ٹیلی فون پر کئی بار اطلاع دی لیکن وہ مُردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ کیوں کر اٹھتا۔ ناچار سرکاری سوار بھیجا گیا۔ جس نے اس نیند کے ماتے کو جگایا اور پانی کو نل میں دوڑایا۔ اس پانی نے اس سوختہ ڈھیر کو بجھایا اور تختے کڑیوں کو کوئلے بنا کر چھوڑ دیا۔ اس آتش زدگی سے ہماری مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف، تمام عمر کا سرمایہ قدیم وجدید ذخیرۂ کتب، پہننے اوڑھنے کے کپڑے، برتن بھانڈے اور تمام اثاث البیت گرد اباد ہو گیا۔ اس نقصان کا اتنا صدمہ نہیں تھا جس قدر اس معصومہ کی جان کا افسوس اور رنج تھا۔ اس کی ماں اور اس کے بھائی بلک بلک کر رو رہے تھے۔ خدا کی شان ہے کہ ہمیں اس وقت کچھ ایسا استقلال اور اطمینان اس کی عنایت سے بہم پہنچا کہ ذرا بھی اس صدمے کو طبیعت پر غالب نہ آنے دیا۔ جس طرح اہلِ میت کو خدا کی طرف سے قدرتی استقلال اور صبر عطا ہو جاتا ہے یہی ہماری کیفیت ہوئی۔

ہم نے اس آتش زدگی کی اطلاع اپنے ایک دلی دوست مولوی سید عبدالعلی صاحب کو جن کا معمولی خیریت طلب کا کارڈ آیا ہوا تھا جواب لکھتے ہوئے اشارۃً کر دی۔ انھوں نے از راہ دل سوزی فوراً خواجہ حالی صاحب کو وہی کارڈ دکھا دیا۔ خواجہ صاحب چوں کہ ہمہ تن

درد کے پتلے تھے اس خبر کو سن کر نہایت مغموم ہوئے اور فوراً یہ کارڈ
جس کی نقل بجنسہٖ اس جگہ درج کی جاتی ہے کمال ہمدردی سے بھرا ہوا
ارسال کیا۔

پانی پت۔ ۲۷رفروری ۱۹۱۲ء

جناب مولوی صاحب مخدوم ومکرم تسلیم۔ اس وقت آپ کا کارڈ موسومہ مولوی سید عبدالعلی صاحب کے کارڈ کے جواب میں میری نظر سے گزرا۔ اسے پڑھ کر جو کیفیت دل پر گزری اسے ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مجھے کارڈ اول سے آخر تک پڑھنا مشکل ہو گیا لیکن الحمدللہ کہ آپ کے صبر واستقلال میں کچھ تنزل واقع نہیں ہوا۔ آپ کے اس حادثے کے قریب قریب انگلستان کے ایک مشہور مصنف ڈاکٹر لین پر جو آپ ہی کی طرح ڈکشنری نویس یعنی عربی کی مبسوط ڈکشنری ''مدالقاموس'' کا جامع تھا، یہی آتش زدگی کا واقعہ گزرا تھا۔ اس کی تقریباً بیس برس کی محنت دم کے دم میں ضائع ہو گئی تھی اور کتاب کے شائع ہونے سے پہلے تمام مطبوعہ اور زیر طبع کتابیں جل کر خاکستر ہوئی تھیں۔ مگر واہ رے استقلال کہ اس کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ نئے سرے سے پھر مسودہ تیار کیا، جو آخر کو دس یا پندرہ ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے[۲]۔ اگرچہ وہ حادثہ آپ کے حادثے سے بہت بڑا تھا۔ مگر اس لحاظ سے کہ آپ کے دوست کی نو دس برس کی لڑکی اس حادثے میں ضائع ہو گئی۔ یہ حادثہ بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ یقین ہے کہ آپ اپنے استقلال پر بدستور جمے رہیں گے اور مصنف ''مدالقاموس'' کی ایک دوسری نظیر ہندوستان میں قائم کریں گے۔ امید ہے کہ آپ مزید تفصیل سے خاکسار کو بھی مطلع فرمائیں گے۔''

زیادہ نیاز
خاکسار الطاف حسین حالی

☆......☆

حواشی

۱۔ زنانہ یا خواتین کے رسالے یا اخبار: یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ خواتین کے رسالے یا اخبار کی ''ایجاد'' کا سہرا مولوی سیّد احمد دہلوی کے سر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اردو میں خواتین کے لیے جو رسالے یا اخبار جاری ہوئے ان میں مولوی صاحب کا جاری کردہ پرچہ تاریخی اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔

رفیقِ نسواں اردو کا پہلا رسالہ تھا جو خاص طور پر خواتین کے لیے جاری کیا گیا۔ یہ ۵ر مارچ ۱۸۸۴ء کو لکھنؤ سے ایک عیسائی مشنری کے تحت جاری کیا گیا اور پندرہ روزہ تھا۔ مولوی سیّد احمد دہلوی نے پندرہ روزہ اخبار النساء یکم اگست ۱۸۸۴ء کو دہلی سے جاری کیا جو تاریخ میں خواتین کے لیے جاری کیے گئے اردو اخبارات و رسائل میں زمانی اعتبار سے دوسرا ایسا رسالہ تھا۔ طبقۂ اناث کے لیے جاری کیے گئے اردو جرائد میں اس کے بعد معلم نسواں کا نام ہے جو ۱۸۸۴ء میں حیدر آباد (دکن) سے نکلا تھا۔ اس کا اجرا ۱۸۸۱ء میں معلّم کے نام سے ہوا تھا اور ۱۸۸۴ء یں اس کا نام بدل کر اسے خواتین کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ خواتین کے لیے جاری کیے گئے دیگر اردو جرائد یہ ہیں: شریف بی بیاں (لاہور ۱۸۹۳ء)، تہذیبِ نسواں (لاہور، ۱۸۹۸ء)، پردۂ عصمت (لکھنؤ، ۱۹۰۰ء)، سفیرِ قیصر (میرٹھ، ۱۹۰۰ء)، جلبابِ ناموس (لکھنؤ، ۱۹۰۱ء)، شمس النہار (دہلی، ۱۹۰۲ء) اور خاتون (علی گڑھ، ۱۹۰۴ء)۔ البتہ ان سب کے مدیر مرد ہی تھے اور یہ اعزاز محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) کو حاصل ہے کہ وہ کسی اردو رسالے کی پہلی خاتون مدیر تھیں۔ (دیکھیے: جمیل اختر، اردو میں جرائدِ نسواں کی تاریخ، دو جلدیں (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۶ء)

۲۔ لین کی عربی لغت: مدالقاموس کے نام سے معروف ایڈورڈ ولیم لین (Edward William Lane) (متوفی ۱۸۷۶ء) کی یہ عربی بہ انگریزی لغت دراصل آٹھ (۸) جلدوں میں لندن سے ۱۸۶۳ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان شائع ہوئی تھی۔ یہ قدیم عربی لغات کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔

(۵۱)

اَٹکن بٹکن [الف مفتوح، ٹ ساکن، ک مفتوح، ب مفتوح، ٹ ساکن، ک مفتوح]

جس طرح زمانہ بدلتا جاتا ہے اسی طرح کھیل کود اور مشغلے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ بچوں کے کھیل تمام دنیا میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ برصغیر کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے کھیل بچپن میں رائج تھے۔ وادی گنگ وجمن میں بچوں کا ایک مقبول کھیل تھا اَٹکن بٹکن۔ مولوی سید احمد صاحب نے لغات النساء میں اس کی یہ تفصیل درج کی ہے:

''ایک کھیل ہے جسے چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح کھیلتے ہیں کہ کئی بچے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھڑی کر کے زمین پر ٹکا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ الفاظِ ذیل کہتا جاتا اور ہر ایک کے ہاتھوں پر کلمے کی انگلی باری باری سے رکھتا جاتا ہے۔ جس بچے کے جس ہاتھ پر وہ عبارت تمام ہوتی ہے اس سے پوچھتا ہے کہ'' کھنڈا (کھانڈا) ماروں یا چھری۔'' اگر اس نے کھنڈا کہا تو کہے گا: ''تری ماں کا پیٹ ٹھنڈا۔'' اوّل تو چھری کوئی کہتا ہی نہیں۔ اور جو کسی نے کہہ دیا تو جواب دے گا کہ ''تیری ماں بری۔'' وہ عبارت یہ ہے:

''اٹکن بٹکن، دہی چٹکن (چٹاکن) اگلا جھولے۔ بگلا جھولے۔ ساون ماس کریلا پھولے۔ پھول پھول کی بالیاں۔ باوا گئے گنگا۔ لائے سات پیالیاں۔ ایک پیالی پھوٹ گئی۔ نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کھنڈا ماروں یا چھری۔''

جس جس کے ہاتھ پر یہ عبارت ختم ہوتی جاتی ہے اس اس کا ہاتھ اٹھا کراس کے سینے پر رکھتا جاتا ہے۔ جب سب کے ہاتھ رکھوا چکتا ہے تو سب مل کر جھوٹ موٹ چکی پیستے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''گُھمر گُھمر۔'' اس کے بعد دونوں ہاتوں کی چھنی [سے] آٹا چھانتے ہیں۔ اور یوں زبان پر لاتے ہیں کہ آٹا یاں رکھو بھوسی یاں رکھو۔ جب آٹا چھان لیتے ہیں تو بھوسی کا فرضی دودھ بلو کر جھوٹ موٹ کی کھیر پکاتے ہیں اور آپس میں بانٹ کر کھا لیتے ہیں۔ تقسیم کی حالت میں بعض لڑکے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ شکایت کرتا ہے تو جواب میں کہتے ہیں۔ ''تمھارا حصہ رکھا تھا کتا پادگیا یا بلی سونگھ گئی۔ یعنی اپنے ہاتھ چاٹو اور اسی کو کھیر سمجھو۔''

آندھی [نون غنہ]

طوفانِ گردوباد۔ لیکن مجازاً دلچسپ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ تُند ہوا، اندھیاؤ، چوبائی جیسے:

باندی کے آگے باندی۔ مینھ جائے نہ آندھی۔

۲۔ دھوتال، طرار، چالاک۔

اکبرالٰہ آبادی طنز اور ظرافت میں شاعرِ بے بدل تھے۔ برصغیر کی تحریک خلافت کے زمانے میں جب مولانا محمد علی، شوکت علی صاحبان، گرامی قدر و والا شان علی برادران، گاندھی جی کے ساتھ تمام ملک کا دورہ کر رہے تھے یا بہ الفاظ دیگر گاندھی جی علی برادران کا سہارا لے کر عوامی مقبولیت حاصل کر رہے تھے تو اکبرالٰہ آبادی نے اپنے بے مثل انداز میں ظریفانہ شعر کہا تھا۔ سنا گیا ہے کہ علی برادران اس شعر پر ناخوش ہوئے تھے:

بدھو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاکِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

۳۔ فضول خرچ، مُسرف، جیسے وہ روپیہ اٹھانے میں آندھی ہیں تو ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

آندھی آنا

۱۔ اندھیاؤ آنا۔ کالی آندھی آنا۔ جیسے: آندھی آتی ہے جھاڑو دباؤ۔ (عورتوں کا شگون ہے کہ جھاڑو پتھر کے نیچے دبانے سے آندھی رک جاتی ہے۔)

۲۔ آفت آنا۔ غضب آنا۔ قہر نازل ہونا۔ جیسے:

باندی کے آگے باندی آئی لوگوں نے جانا آندھی آئی۔

آندھی کے آم

۱۔ ہوا سے گرے ہوئے آم، آندھی سے گرے ہوئے آم۔

۲۔ بہت سستی اور ارزاں شے، مفت برابر، غیر مترقبہ چیز۔

۳۔ چندروزہ، تھوڑے دن کے۔

۴۔ مفت کا فائدہ۔

۵۔ بے مشقت کام۔

اَنْدھیرے اُجالے [الف مفتوح، نون غنہ، یاے مجہول، الف مضموم]

تاریکی و روشنی اور رات دن کے علاوہ یہ معنی ہیں:

۱۔ اویر سویر۔ ۲۔ وقت بے وقت۔

۳۔ موقع بے موقع۔

۴۔ موقع اور محل مناسبِ حال پا کر کچھ کرنا۔

اکبرالٰہ آبادی کا مشہور شعر ہے:

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

آنکھ پھڑکنا [نون غنہ، پھ مفتوح، ڑ مفتوح]

مولوی سید احمد صاحب لغات النساء میں لکھتے ہیں:

آنکھ کو گردش دینا، پلک یا چشم میں حرکت ہونا، خود بخود آنکھ کا حرکت کرنا، چشم کا متحرک ہونا، اختلاج ہونا، جنبشِ چشم، جیسے: آنکھ پھڑکے بائیں بیر ملے یا سائیں۔ آنکھ کے پھڑکنے کا سبب ریح ہے۔[۱] اور اس کی زیادتی امراضِ باردہ میں سے کسی مرض کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔[۲]

اطبائے انگریزی نے سوزاک ہونے کی علامت بھی لکھی ہے۔ اکثر آدمی آنکھ پھڑکنے سے کسی دولت کے آنے اور ملنے کا شگون لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ شعرائے عرب اور فارس کے کلام میں بھی اس کا استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ہندوستان میں کہتے ہیں کہ مرد کی دائیں اور عورت کی بائیں آنکھ پھڑکے تو اس کا کوئی عزیز یا پیارا ملے۔ اور جو مرد کی بائیں اور عورت کی دائیں پھڑکے تو کچھ رنج یا صدمہ پہنچے۔ شاعروں نے اس کی کچھ تخصیص کی بھی ہے اور نہیں بھی کی۔ اکثر نے دونوں طرح باندھا ہے۔''

آنکھ ٹھنڈی کرنا [نون غنہ، ٹھ مفتوح، ن ساکن / ک مفتوح]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''ہندوؤں کی عورتوں میں رسم ہے کہ جب کسی کا کوئی رشتے دار مر جاتا ہے اور وہ بہت روتا ہے تو اس کی آنکھیں پانی سے پونچھتی اور اسے آنکھ یا آنکھیں ٹھنڈی کرنا کہتی ہیں۔ مسلمان عورتیں میں ایسے موقع پر صرف رومال سے آنکھیں پونچھتی سر کو پکڑتی اور ماتھے کو دباتی ہیں۔''[۳]

[دیگر معنی یہ ہیں]

۱۔ تسلی وتشفی دینا۔

۲۔ دوستوں سے ملنے سے خوش ہونا۔

۳۔ منتروں سے پرسن (خوش) ہونا بھی ہے۔

☆......☆

حواشی

۱/۲۔ یہ پرانے اطبا کے خیالات ہیں اوران کو قبول کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کی کوئی سائنسی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ یہاں دی گئی عبارت اور فرہنگِ آصفیہ کے متن میں کچھ فرق ہے۔اگرچہ مفہوم وہی ہے۔

☆......☆

(۵۲)

آنکھوں کے محاورے اردو میں بہت ہیں۔ بعض متروک ہوتے جاتے ہیں بعض کا استعمال اور مفہوم دلچسپ ہے:

آنکھوں کوتلووں سے ملنا [نون غنہ، واو مجہول، ت مفتوح، واو مجہول، م مفتوح]

تلووں سے آنکھیں ملنا زیادہ بولتے ہیں۔ حسرت نکالنا۔ کسی زمانے میں ایک قسم کی سزا تھی کہ جب کوئی بیگم یا رانی مہارانی کسی مرد سے ناراض ہوتی تھی تو جب تک وہ اس کی آنکھیں اپنے تلووں سے نہیں مل لیتی تھی غضبناک رہتی تھی۔ چنانچہ یہ محاورہ اب بھی عورتوں میں ہی بولا جاتا ہے۔ جیسے اس کی آنکھوں کو اپنے تلووں سے ملوں تو ٹھنڈک پڑے۔

آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا [نون غنہ، واو مجہول، پ مفتوح، واو مجہول، واو مجہول]

مطلب یہ کہ اپنا بار دوبھر نہیں ہوتا۔ اپنی چیز ناگوار نہیں گزرتی۔ کام کی چیز کبھی گراں نہیں معلوم ہوتی۔ اپنا پیارا کبھی ناگوار نہیں گزرتا۔ اپنے عزیز کا پاس رہنا ناگوار خاطر نہیں ہوتا۔ اپنا عزیز گراں نہیں گزرتا۔ گائے کو اپنے سینگ بھاری نہیں ہوتے۔

آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا [نون غنہ، واو مجہول، یائے معروف]

جان بوجھ کر انجان بن جانا، بے مروتی اختیار کرنا، بے مروت بن جانا، طوطا [کذا] چشم ہونا، آنکھیں بدل لینا، احسان بھلا دینا، بے شرم ہو جانا، لاج اٹھا دینا، بے انصاف ہونا، نا منصفی کرنا، احسان کا بدلہ احسان سے نہ کرنا، جیسے: ایسی تو ٹھیکری آنکھوں پر نہ رکھو۔

آنکھوں سے نِیل ڈِھلنا [نون غنہ، واو مجہول، یائے معروف، ڈھ مفتوح]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لغات النساء میں لکھتے ہیں کہ صحیح آنکھوں سے نیر (پانی) ڈھلنا ہے۔ جب آدمی مرنے لگتا ہے تو اس وقت اس کی آنکھوں سے دو ایک قطرے ٹپکتے ہیں۔ جس کو آنکھوں سے نیل ڈھلنا کہتے ہیں۔ مراد ہے جاں بہ لب ہونا، قریب بمرگ ہونا، مرنے لگنا، مرنے کی علامت کا ظاہر ہونا، آنکھوں کا بے رونق ہونا۔

آنکھوں کی سوئیاں رہ جانا

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اس کی دلچسپ تشریح کی ہے:

''محاورہ ہے۔ بہت سا کام تو ہو چکا تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ بہت سی مصیبت کاٹ لی ہے تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے۔ ہاتھی نکل گیا دم رہ گئی۔ جیسے ساری سوئیاں نکال لیں آنکھوں کی رہ گئیں۔

عورتیں اس کا قصہ یوں مشہور کرتی ہیں کہ کسی سوداگر بچے کی کسی جادو گرنی سے دوستی تھی۔ سو وہ اس کی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی۔ ایک روز کیا ہوا کہ اس نے سوداگر بچے کی بیوی کے مار ڈالنے کو سوداگر بچے کے گھر جادو کی پُڑیا پھنکوا دی۔ قضا عنداللہ وہ پڑیا اس نیک بخت بیوی کے اوپر تو نہ پڑی سوداگر بچے ہی کے بدن پر جا پڑی۔ اس کا پڑنا تھا کہ تمام بدن میں سوئیاں ہی سوئیاں ٹھک گئیں۔ سوداگر بچہ اس تکلیف کے مارے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی بیوی جو صبح کی نماز پڑھ کر اٹھی تو یہ حال دیکھ کر بہت سٹ پٹائی اور اسی دم سوئیاں نکالنے بیٹھ گئی۔ ہاتھوں سے سوئیاں نکالنے میں اس کے خاوند کو تکلیف ہونے لگی تو اس نے اپنے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں۔ تیسرے پہر تک ساری سوئیاں نکال ڈالیں۔ صرف

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ یہ اپنی باندی کو خاوند کے پاس بٹھا کر آپ نماز پڑھنے چلی گئی۔ باندی نے اس موقع کو غنیمت جان کر رہی سہی سوئیاں جھٹ پٹ نکال ڈالیں۔ ان کا نکلنا تھا کہ ایک کانٹا سا نکل گیا۔ سوداگر بچے کی جان میں جان آ گئی۔ الا اللہ کر کے اٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھولتے ہی باندی کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھا اور اس کا احسان سمجھ کر بن داموں غلام بن گیا۔ بیوی کی صورت سے بیزار رہنے لگا۔ اس بیچاری کو آنکھوں سے گرا دیا اور اس لونڈی کو بیوی بنا لیا۔ وہی مثل ہوئی کہ باندی تھی سو بیوی ہوئی بیوی تھی سو باندی ہوئی۔ اس بات سے یہ ایک خاص محاورہ بن گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

بَیٹھک [یائے لین، ٹھ مفتوح]

باہر کے مردانہ کمرے کو بھی کہتے ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ۔ اور ایک قسم کی نذر اور حاضرات جو اکثر مسلمان عورتیں کیا کرتی ہیں۔

بیٹھک دینا

پریوں وغیرہ کی حاضرات کرنا۔ اکثر جاہل اور ضعیف الاعتقاد مسلمان عورتوں خاص کر بیگماتِ قلعہ میں دستور تھا کہ ان میں ایک نہ ایک عورت اپنے تئیں اپنے مانے ہوئے ولیوں یا پریوں کی سواری فرض کر کے جمعرات کو ان میں سے کسی کو اپنے سر پر بلایا کرتی تھی اور اس میں سب عورتیں جا کر اپنی اپنی حاجتیں پیش کرتی تھیں۔ ان میں جس عورت کے سر پر ان میں سے کوئی فرضی ولی آتا تو وہ عورت ننگا سر ہلاتی اور جو کچھ سائلہ کا سوال ہوتا اس کے خیال کے موافق جواب دیتی جاتی تھی۔ سائلہ اپنے حسنِ ظن سے سچ جان کر نذر کا خرچ اٹھاتی اور جو کچھ بن پڑتا خدمت بجا لاتی۔ اس [کے لیے] بڑے بڑے سامان کیے جاتے تھے۔ مکلف فرش بچھایا جاتا اور خوشبو لوبان وعطریات وغیرہ سے مکان بسایا جاتا تھا۔

ڈومنیاں گانے کے واسطے بلائی جاتی تھیں۔ جس عورت کے سر پر ساتوں پریوں میں سے کوئی پری، یا شیخ سدّو یا میاں شاہ دریا، زین خاں، ماموں اللہ بخش، شاہ سکندر، سید برہنہ، پیر ہٹیلے، شاہ مدار، چہل تن وغیرہ آتے وہ نہایت بن سنور کر دلہن کی طرح پھول کے گہنے وغیرہ سے آراستہ پیراستہ ہو کر گانا سننے چوکی پر بیٹھتی تھی۔ جب گانے کی آواز سے مست ہو جاتی تو اس کے سر پر ان میں کوئی آ کر خوب کھیلتا اور سائلہ کے سوال کا من مانا جواب دیتا تھا۔ دراصل یہ بالکل مکر اور فریب تھا بلکہ ارذل قوم کی ہندنیوں میں بھی ان ولیوں یا اپنے ہاں کے دیوی دیوتاؤں کی بیٹھک اسی طرح دیتی تھیں۔ جس کے سر پر کوئی پیر یا جن یا دیوی دیوتا آتا وہ بھگتانی کہلاتی تھی۔ بعض ہندو عورتیں دیوی بھیروں اور ہنومان وغیرہ کا نام لے کر بیٹھک دیتیں اور چھلپ داروں ڈوروو والوں سے گانا سنا کرتی تھیں۔ بعض بھگتنیاں اس موقع پر حقّہ بھی نوش کرتی جاتی تھیں۔

(مولوی سید احمد صاحب دہلوی)

☆.....☆

(۵۳)

یہ قسط دست یاب نہ ہو سکی۔

☆.....☆

(۵۴)

اُرْدَابیگنی [الف مضموم، رِساکن، یائے لین]

اصل میں اردو بیگنی تھا۔ یعنی لشکر والی۔ لغات النساء میں درج ہے:

وہ مردانہ لباس کی ہتیار بند عورت جو شاہی محلوں میں پہرا چوکی دیتی اور حکم احکام پہنچاتی ہے۔ سپاہی عورت۔ شاہی محلوں میں اہتمام کرنے والی تُرکنی (ترک عورت) جس طرح ترکنیں، قلماقنیاں، جبشنیں، تیموریہ خاندان میں اہلِ خدمت ہوتی تھیں۔ اسی طرح اردابیگنیاں بھی تھیں۔ ان عورتوں کے نام بھی مردوں کے سے ہوتے تھے۔

آرسی

۱۔ آئینہ۔ ۲۔ منہ دیکھنے کا شیشہ۔ ۳۔ درپن۔

ایک طرح کی آئینہ دار انگوٹھی جسے عورتیں انگوٹھے میں پہنتی تھیں اور سرخی لب و غازہ رخسار اور آرائشِ جمال کے لیے اس میں منہ دیکھتی تھیں۔

آرسی مُصحَف [م مضموم، ص ساکن، ح مفتوح]

آرسی بمعنی آئینہ، منہ دیکھنے کا شیشہ اور مصحف [یعنی] قرآن پاک۔ شادی بیاہ کی رسموں میں ایک قدیم رسم آرسی مصحف دکھانا ہے۔ اب بھی بعض بعض جگہ رائج ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:[۱]

''جلوے کے وقت دولہا دولھن کو آئینہ اور قرآن دکھانا۔ ہندوستان کی مسلمان عورتوں میں دستور ہے کہ نکاح کے بعد نوشہ کو گھر کے اندر جہاں تمام کنبے رشتے کی عورتیں جمع ہوتی ہیں، بلواتی ہیں۔ اوّل مُرَوج ۲ یعنی کچھ خوشبوئیں مثل صندل، بالچھڑ، چھیل چھبیلا، ناگر موتھا وغیرہ دولہا سے پسواتی اور اسے دولھن کی مانگ میں لگواتی ہیں۔ پھر دولہا دولھن کو آمنے سامنے سر سے سر ملا کر اور ایک سرخ دوپٹہ اُڑھا کر بٹھا دیتی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک آئینہ اور قرآن شریف میں سے سورۂ اخلاص خاص دولہا سے نکلوا کر رکھ دیتی ہیں تاکہ اوّل ایک ساتھ سورۂ اخلاص پر نظر پڑے اور پھر ایک ساتھ آئینہ میں دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ لیں۔ اس وقت دولہا کو ہر طرح مجبور کرتی اور عجز کے کلمے کہلواتی ہیں۔ وہ ناچار ہو کر اپنی خلاصی کے لیے کہتا ہے بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا غلام، تمھارے باپ دادا کا غلام بلکہ کنبے کا غلام اور جتنے تمھارے کمین ہیں ان سب کا غلام (جو ذرا چالاک ہوتے ہیں وہ ان کلموں کو ایک خوبصورتی کے ساتھ الٹ بھی دیتے ہیں)۔ ہر چند یہ عجز آمیز کلمے کہتا ہے۔ مگر وہاں ذرا بھی شنوائی نہیں ہوتی۔ آخر کار دولھن کی ماں اور کنبے والے کوشش کرتے ہیں جب وہ ذرا سی آنکھیں ٹمٹما دیتی ہے۔ اس وقت دولہا میاں خوش ہو کر بول اٹھتے ہیں کہ کھول دیں کھول دیں۔ اس کے بعد اور رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس رسم کو آرسی مصحف دِکھانا کہتے ہیں۔ آرسی اس لحاظ سے بیچ میں رکھی جاتی ہے کہ دولھن کو دولہا سے حجاب نہ آئے اور وہ اس پردے میں اپنے خاوند کا مکھڑا دیکھ کر جی

خوش کر لے اور سورۂ اخلاص سے یہ غرض ہے کہ میاں بیوی میں ہمیشہ اخلاص بنا رہے۔''

تارے دِکھانا [دمضموم]

ایک رسم ہے۔ یا یہ کہنا چاہیے کہ تھی۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:[۳]

''زچہ کو آسمان دکھانا۔ مسلمان عورتوں میں دستور ہے کہ چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھاتیں۔ زچہ اور بچے کو سنگار کراتیں۔ سموسہ دار کارچوبی پٹی دونوں کے سر سے باندھتیں اور باہر چوکی پر کھڑا کرنے لاتی ہیں۔ زچہ بچے کو گود میں لے کر باہر آتی ہے۔ دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے ساتھ ہوتی ہیں۔ دائی آٹے کی چومکھ اٹھائے آگے چلتی ہے۔ زچہ بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی ہے اور چوکی پر کھڑے ہو کر سات ستارے گنتی ہے۔ اس وقت دونوں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بنا دیتی ہیں تا کہ اوپر سے جن اور پری کا گزر نہ ہو سکے۔ گویا آج سے جن اور پری کے سائے کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ اِدھر زچہ تارے دیکھنے جاتی ہے۔ ادھر لڑکے کا باوا تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پوری بسم اللہ پڑھ کر چھت میں تیر لگا کر گویا فرضی مِرگ (ہرن) مارتا ہے چنانچہ اس رسم کا نام ہی مِرگ مارنا پڑ گیا۔ مِرگ مارنے کا نیگ ساس داماد کو دیتی ہے۔ زچہ تارے دیکھ کر پلنگ پر آ بیٹھتی ہے۔ پلنگ کے آگے دسترخوان بچھایا جاتا اور چوکی میز کی طرح لگا دی جاتی ہے۔ اس پر تورہ چنا جاتا ہے۔ جس میں پکی ہوئی

سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہے جسے چوبہ چکھانا کہتے ہیں۔ مبارک سلامت سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ گانا شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد زچہ کے آگے تورے اور چَومُکھ میں روپے ڈال کر دائی کو دیے جاتے ہیں۔''

چَومُکھ [واو لین، م مفتوح][4]

وہ چراغ جس کے چاروں طرف بتّی کا گھر ہو۔ چومکھا چراغ۔

تَبارَک [ت مفتوح، ر مفتوح]

''لفظی معنی ہیں بڑا بزرگ، عالی۔ اصل میں باب تفاعل سے ماضی کا صیغہ ہے لیکن چوں کہ اسم الٰہی کا حال واقع ہوتا ہے اس لیے بزرگ مراد لیتے ہیں۔ قرآن شریف کی ایک سورۃ کا نام ہے جس سے انتیسویں پارے کا آغاز ہوتا ہے[5] اور اس کی بہت سی بزرگی لکھی ہے۔ یہ سورہ مانعِ عذابِ قبر اور شافعِ روزِ محشر ہے۔'' مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے لکھا ہے:

''رجب کے مہینے میں جمعے یا جمعرات کو مردہ کی بخشش کے لیے اکتالیس بار سورۂ تبارک پڑھتے ہیں۔ اس کے لیے اکثر میدے کی میٹھی روغنی تنوری روٹیاں جن پر سونف خشخاش کلونجی جمی ہوئی ہوتی ہے، تقسیم کی جاتی ہیں۔ اگر چہ یہ رسم شارع اسلام نے مقرر نہیں کی مگر ایک ذریعۂ خیرات (اور بے حد خیر و برکت کا باعث) ہے۔ دوسرے اس سورۃ کے پڑھے جانے کی وجہ سے مسلمانوں میں مثل ادعیہ ماثورہ مانی جاتی ہے۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ اگرچہ قادری صاحب نے عبارت واوین (''—'') میں لکھی ہے لیکن فرہنگِ آصفیہ کے متن اوران کی عبارت میں کہیں کہیں چند الفاظ کا فرق ہے۔ تاہم اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔

۲۔ مَروج (م مفتوح، واو معروف): خوش بودار اشیاء جو دلھن کی مانگ میں بھری جاتی تھیں۔ یہ خوش بودار اشیاء بری یا ساچق کے ساتھ ایک بڑی پُڑیا میں بھیجی جاتی تھیں۔ اس بڑی سی پڑیا کو سُہاگ پُڑا کہتے تھے۔ بعد کے زمانے میں بازار میں تیار سہاگ پُڑا ملنے لگا تھا۔ اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔

۳۔ یہاں بھی فرہنگِ آصفیہ اور قادری صاحب کی عبارت میں کہیں کہیں چند الفاظ کا فرق ہے۔ یہی صورت بعض دیگر مقامات پر بھی ہے جہاں فرہنگِ آصفیہ سے اقتباسات دیے گئے ہیں۔

۴۔ چومُکھ/ چومُکھ: قادری صاحب نے مَکھ (بفتحہ) لکھا ہے۔ علمی نے بھی ''م'' پر زبر لکھا ہے اور اسے چومُکھ/ مُکھا کا بگاڑ کہا ہے۔ لیکن پلیٹس نے ''م'' کو مضموم لکھا ہے یعنی چومُکھ اور چومُکھا۔

۵۔ قرآن شریف کے انتیسویں پارے کا جس سورۃ سے آغاز ہوتا ہے اس کا نام سورۃ مُلک ہے لیکن بعض لوگ اسے سورۃ تبارک بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کی پہلی آیت کے ابتدائی الفاظ ''تبارک الذی ۔۔۔ الخ'' ہیں۔

☆......☆

(۵۵)

بی بی کی صحنک [نون مفتوح]

یہ ایک طرح کی نیاز ہوتی ہے۔ مؤلفِ لغات النساء مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اس کو بیوی کی صحنک یا نیاز اور بیوی کا دانہ یا کونڈا لکھا ہے اور اس کے ذیل میں جو تفصیل لکھی ہے وہ یہ ہے۔ یہ کتاب ''لغات النساء'' ۱۹۱۷ میں چھپی تھی اور اب ۱۹۸۹ء میں ۷۲ برس ہو چکے ہیں[1] ہمارے علم میں نہیں کہ اس طویل مدت میں کسی نے اس تشریح و توجیہ پر اعتراض کیا ہو۔ ہمیں تاریخی طور پر اس کی صحت یا عدم صحت کی کوئی تحقیق نہیں۔ صرف عام دلچسپی کے لحاظ سے نقل کیا جاتا ہے۔ وھو ہذا:

''حضرت فاطمہ علیہا السلام کی فاتحہ۔ یہ نیاز اکثر شادی یا کسی مراد کے برآنے پر عورتیں نہایت احتیاط سے دلواتی ہیں اور اسے سہاگن، پارسا، خاندانی عورتوں کے سوائے ''دوہاجو''[2] تک کو نہیں کھانے دیتیں بلکہ سیدانیوں کو کھلانا اولیٰ سمجھتی ہیں۔ جہانگیر بادشاہ کے وقت سے اس کا رواج ہوا ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جہاں گیر بادشاہ کی بیاہتا بیوی قوم کی راجپوتنی تھی اور نور جہاں جو پہلے شیر افگن کی بیوی تھی وہ جہانگیر سے آنکھ لگا کر گھر میں پڑی تھی۔ چوں کہ اس پر بادشاہ کی نظرِ عنایت زیادہ تھی اور سوکنوں میں آپس میں کٹا چھنی رہا کرتی ہے اس وجہ سے نور جہاں جو کہ ایک چلبلی اور طرار عورت تھی ہمیشہ اس کے پر منہ آتی اور اسے مارواڑن کہہ کر چھیڑتی۔ ناچار اس نے تنگ ہو

کر اسے ذلیل کرنے کے واسطے یہ تجویز نکالی کہ ایک روز کسی تقریب
سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فاتحہ دلا کر تمام بیگماتِ محل سے بہ آوازِ
بلند کہا کہ اے صاحبو! اس نیاز متبرک کو وہ عورت کھائے جس نے
دوسرا خاوند نہ کیا ہو۔ جب نور جہاں بیگم نے اپنے حسب حال یہ بات
سنی تو ایسی شرمندہ ہوئی کہ اس دن سے پھر کبھی آنکھ نہ ملا سکی۔ غرض کہ
اس زمانے سے جسے تقریباً ڈھائی سو برس کا عرصہ ہوا اس رسم نے
رواج پایا۔ اب یہ نیاز منہاریوں کو بھی کھلانے لگے ہیں۔"

صحنک سے اُٹھ جانا [الف مضموم]

حضرت فاطمہ علیہا السلام کی مجلسِ نیاز یا مجلسِ طعامِ فاتحہ میں بے عصمتی کے باعث شریک ہونے کے قابل نہ رہنا۔ مولوی سید احمد صاحب مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھتے ہیں:

"جن جن باتوں کا اس میں پرہیز ہے اور وہ بی بی کا دانہ میں ہم لکھ چکے
ہیں۔ جہاں ان میں فرق آیا۔ پھر عورتیں نہ تو خود ہی اپنے کو اس نیاز
میں شریک ہونے کے قابل سمجھتی ہیں اور نہ صاحبِ نیاز ہی جب خبر ہو
جائے تو اسے شریک ہونے دیتی ہے۔ شوق لکھنوی [کا شعر ہے]:

ڈر ہے ہم صحبتوں کی چشمک سے
ارے اٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"

مندرجہ بالا اقتباس سے علم ہوتا ہے کہ "بی بی کا دانہ" کے ذیل میں وہ شرائط درج ہوں گی۔ آیئے دیکھیں مولوی سید احمد صاحب نے اس کے تحت کیا لکھا ہے:

"بی بی" کا یا بیوی کا دانہ

۱۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نیاز کا کھانا۔ طعامِ نیازِ حضرتِ فاطمہ۔

۲۔ بیوی کی کمائی یا بیوی کی ذاتی آمدنی یا جائیداد کا سہارا۔"

صرف یہ دو معنی نمبر ڈال کر بی بی کا دانہ کے تحت فرہنگِ آصفیہ میں ملتے ہیں۔ جن جن باتوں کا پرہیز ہے ان کا کہیں ذکر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سید احمد صاحب لکھنا چاہتے ہوں گے مگر پھر ذہن سے نکل گیا کہ لکھا یا نہیں۔

لغت کی ایک جدید کتاب نہایت ضخیم کئی مجلدات میں ''مہذب اللغات'' کے نام جناب علامہ مہذب لکھنوی نے تالیف فرمائی ہے۔ اس میں بھی عجب عجب شگوفے مہذب صاحب نے چھوڑے ہیں۔ ایک تو بیشتر لغات میں عادتاً ''قولِ فیصل'' کے عنوان سے اپنی رائے درج فرماتے ہیں اور یہ بات ذہن سے مطلق خارج ہو جاتی ہے کہ لغت میں قول فیصل کے کوئی معنی سرے سے ہی نہیں۔ بہر حال نہایت وقیع اور قابل قدر کام کیا ہے۔

صحنک کے طریقے کا حال میں ''مہذبِ اللغات'' سے ہی نقل کرتے ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ یہ طریقہ اہلِ لکھنؤ کا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی یہ نیاز ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تفصیلات ہر جگہ منطبق ہوتی ہوں:

''یہ کھانا عورتیں نہا دھو کر گیلے بالوں کے ساتھ پکاتی ہیں۔ اس کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھولتے ہوئے پانی میں لونگ الائچی ڈال کے اس میں چاول اُبال لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان چاولوں کو اوپر سے بگھار دیتے ہیں۔ پھر مٹی کے کونڈے میں اس طرح رکھتے ہیں کہ چاولوں کی ایک تہہ بنا کے اوپر شکر اور دہی ڈالتے ہیں۔ پھر دوسری تہہ اس تہہ کے اوپر رکھ کر اس پر بھی دہی ڈالتے ہیں۔ اس طرح کئی تہیں بناتے ہیں اور زردے کی بھی صحنک ہوتی ہے۔ اس میں دہی نہیں ہوتا۔

شادی کی صحنک میں پینڈیاں[۲] وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ یہ پینڈیاں صحنک سے الگ ہوتی ہیں۔ صحنک کھانے کے بعد صحنک کے چاولوں کی کھرچن وغیرہ جو پتیلی میں بچ جاتی ہے اس میں دہی ملا کر لڈو

بنائے جاتے ہیں اوران لڈوؤں کوصحنک کھانے والی بیبیاں پھر کھاتی ہیں۔اسے صحنک دوہرانا کہتے ہیں۔صحنک دوہرانا بھی گویا واجبات میں سے ہے۔اب مٹی کے کونڈوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ صحنک کھانے کے لیے باعفت و باعصمت ہونا ضروری ہے۔ بیوہ عورت کو بھی صحنک میں شریک نہیں کرتے۔عورتیں اس نذر پر مَردوں کا پرچھاواں تک نہیں پڑنے دیتیں اور نہ مرد اس نذر کو چکھتے ہیں بلکہ بعض گھرانوں میں نابالغ بچوں تک کو یہ نذر نہیں چکھائی جاتی۔''

مخزن المحاورات میں حضرت بی بی فاطمۃ الزہراء کی جگہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا اسم مبارک لکھ دیا ہے۔اس پر مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں لکھتے ہیں:

''ہم حیران ہیں کہ ہندوستانی مخزن المحاورات کے جدید محقق نے بی بی عائشہ کی نیاز کہاں سے لکھ دیا۔ جب ایک قوم کی رسمیں معلوم نہیں تو اس میں ہاتھ ڈال کر اوروں کو گمراہ کرنے اور غلطی میں ڈالنے سے کیا فائدہ۔اس سے تو نہ لکھنا ہی بہتر تھا۔''

☆......☆

حواشی

۱۔ دوہاجُو: جس کی دو شادیاں ہوئی ہوں۔پلیٹس نے دونوں واو (و) معروف لکھے ہیں اور دُوج بار سے نکلا ہوا بتایا ہے۔لیکن عورت کے لیے اس کی تانیث بھی آسکتی ہے جو''دوہاجن'' ہے (بحوالہ علمی)۔لیکن علمی نے اسے''دو'' کے تحت میں درج کیا ہے گویا یائے مجہول سے تلفظ کیا ہے۔

۲۔ پینڈی (یائے معروف،نون غنہ)۔ایک قسم کا میدے کا لڈو جو شادی میں دلھن والے دولھا کے گھر بھیجتے تھے۔یہ زچہ کو بھی کھلائے جاتے تھے۔

☆......☆

(۵۶)

کاجُو بھوجُو [واو معروف، واو مجہول، واو معروف]

نہایت نازک، نفیس، سبک چیز کو کہتے ہیں۔ جیسے کانچ یا شیشے کی، ناپائیدار، ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جائے۔ اسی لیے زوال پذیر کو بھی کہتے ہیں۔ اشارے سے ٹوٹ جانے والا۔ فرہنگِ آصفیہ میں ہے:

''وہ چیز جسے کاری گر نے بہ اعتبار ظاہر تو نہایت خوشنما اور دل فریب بنایا ہو مگر پائیدار نہیں۔ بی راحت کا شعر ہے:

کاجو بھوجو ہوا کرتا ہے جہیز و گہنا
دیکھ جھومر ترا امراؤ بہو ٹوٹ پڑا

یہ لفظ کاغذ اور بھوج پتر سے جو دونوں نازک اور کم طاقت چیزیں ہیں، بنایا گیا ہے۔ اول میں کاغذ سے کاغذو ہوا پھر غین حذف ہو کر کاذو۔ عوام نے چوں کہ ذال کا تلفظ ان کی زبان سے نہیں نکلتا ''کاجو'' بنا لیا۔ بھوج پتر سے بھوجو ہو جانا بہت آسان ہے۔ اس طرح پر کاجو بھوجو بنا لیا۔''

بعض جگہ ''کاجو بھوجو'' کے معنی نازک مزاج اور مرزا پھویا کے بھی آتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ لغات آصفیہ کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ مرد کے واسطے ان الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے نہایت طنز سے لکھتے ہیں:

''جو لوگ اس کے معنی میں نازک مزاج اور مرزا پھویا لکھتے ہیں شاید

خاص ان کی چہار دیواری میں آدمی کی نسبت یہ لفظ بولا جاتا ہوگا۔"

خان بہادر مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے "محاورات ہند" مطبوعہ ۱۸۹۰ء میں "کاجو بھوجو" کے معنی لکھے ہیں:

"کاجو بھوجو: بدرجۂ اوسط۔ نہ بہت خوب نہ بہت کم تر۔ کام چلاؤ۔"

غُلام گَردِش [غ مضموم، گ مفتوح، دمکسور]

کوٹھیوں، بنگلوں، محلوں میں رہائش کے کمروں کے اردگرد جو راستہ ملازموں نوکروں کے آنے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے غلام گردش کہتے تھے تاکہ ہرا یرا غیرا آیا گیا صاحبوں کے بیچ سے کمروں میں ہوکر نہ گزرے۔

حرم سرا اور دیوان خانے کی بیچ کی دیوار، وہ دیوار جو حرم خانے اور دیوان خانے کے درمیان حائل ہو، پردے کی دیوار، کوٹھی یا محل کے چاروں طرف کا برآمدہ جہاں نوکر چاکر اردلی چپراسی رہتے اور آتے جاتے ہوں۔

مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں:

"اس لفظ پر غالب کا ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے۔ ایک مرتبہ مرزا فتح الملک ولی عہد بہادر نے غالب کو یاد کیا۔ جب آپ غلام گردش تک پہنچ گئے تو وہ بھول گئے۔ یہ بڑی دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ اتفاقاً ولی عہد بہادر کو پھر یاد آیا کہ ہم نے غالب کو بلایا تھا۔ ملازموں سے پوچھا غالب حاضر ہے۔ آپ نے باہر سے خود جواب دیا کہ غلام گردش میں آ گیا ہے۔ ان کی واقعی گردش اور برجستہ لطیفے سے وہ بہت خوش ہوئے۔"

غُل [غ مضموم]

شور، ہنگامہ، آفت، کان پڑی آواز نہ سنائی دینا، چیخ دھاڑ، شور وشغب۔

خاص ان کی چہار دیواری میں آدمی کی نسبت یہ لفظ بولا جاتا ہوگا۔"

خان بہادر مولوی سبحان بخش صاحب دہلوی نے "محاورات ہند" مطبوعہ ۱۸۹۰ء میں "کاجو بھوجو" کے معنی لکھے ہیں:

"کاجو بھوجو: بدرجۂ اوسط۔ نہ بہت خوب نہ بہت کم تر۔ کام چلاؤ۔"

غُلام گَردِش [غ مضموم، گ مفتوح، دمکسور]

کوٹھیوں، بنگلوں، محلوں میں رہائش کے کمروں کے ارد گرد جو راستہ ملازموں نوکروں کے آنے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے غلام گردش کہتے تھے تاکہ ہر ایرا غیرا آیا گیا صاحبوں کے بیچ سے کمروں میں ہو کر نہ گزرے۔

حرم سرا اور دیوان خانے کی بیچ کی دیوار، وہ دیوار جو حرم خانے اور دیوان خانے کے درمیان حائل ہو، پردے کی دیوار، کوٹھی یا محل کے چاروں طرف کا برآمدہ جہاں نوکر چاکر اردلی چپراسی رہتے اور آتے جاتے ہوں۔

مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں:

"اس لفظ پر غالب کا ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے۔ ایک مرتبہ مرزا فتح الملک ولی عہد بہادر نے غالب کو یاد کیا۔ جب آپ غلام گردش تک پہنچ گئے تو وہ بھول گئے۔ یہ بڑی دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ اتفاقاً ولی عہد بہادر کو پھر یاد آیا کہ ہم نے غالب کو بلایا تھا۔ ملازموں سے پوچھا غالب حاضر ہے۔ آپ نے باہر سے خود جواب دیا کہ غلام گردش میں آ گیا ہے۔ ان کی واقعی گردش اور برجستہ لطیفے سے وہ بہت خوش ہوئے۔"

غُل [غ مضموم]

شور، ہنگامہ، آفت، کان پڑی آواز نہ سنائی دینا، چیخ دھاڑ، شور و شغب۔

پلیٹس لکھتا ہے کہ غلو اور غلغل کی تخفیف ہے۔ اردو کا عام لفظ ہے۔ مومن خاں مومن دہلوی لکھتے ہیں:

مری فریاد سن کہتا ہے اسرافیل حیرت سے
قیامت آ گئی کیوں کر یہ غل کیساز میں پر ہے

ذوق دہلوی کا شعر ہے:

پروانہ بھی تھا گرم تپش پر کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

فرہنگ آصفیہ میں ہے:

"بعض محقق اس لفظ کو فارسی بھی نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک اردو یا مُہنّد ہے۔ اگر چہ ملا نظامی نے ہفت پیکر میں یہ لفظ بمعنی شور باندھا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ اس میں انھوں نے اہلِ ہند کی پیروی کی ہے۔ اگر یہ لفظ فارسی کا ہوتا تو برابر وہاں کی تصانیف میں پایا جاتا۔ ہماری رائے میں بھی یہ فارسی تو نہیں مگر غلغل کا مخفف ہوسکتا ہے۔ اگر ہندی قرار دیں تو یوں تاویل ہوسکتی ہے کہ عجب نہیں جو یہ لفظ پنجابی گل بمعنی بات [سے] گُل ہو کر غُل ہو گیا ہو۔"

شاخسانہ [خ ساکن]

بے بات کا جھگڑا کھڑا کرنا، حجت، تکرار، الزام، تہمت، عیب گیری، ڈھکوسلا، دھوکا، من گھڑت وغیرہ۔ اس طرح اور بہت معنوں میں آتا ہے۔ اس لفظ سے محاورے بھی بہت ہیں۔ شاخسانہ پیدا ہونا، رخنہ نکل آنا۔ اخترؔ کا شعر ہے:

ٹکڑے دل ہے، کس قدر گستاخ شانہ ہو گیا
زلف میں پیدا کہاں کا شاخسانہ ہو گیا

نکلنا، کھڑا ہونا، پیدا ہونا کے ساتھ بھی محاورے ہیں اور معنی اسی طرح کے ہیں۔

یہ لفظ کیا ہے۔اس کی اصل کیا ہے؟مولوی سید احمد صاحب سے سنیے:

''یہ لفظ فارسی میں اگرچہ شاخ شانہ [یعنی ش سے شانہ] ہے مگر شاخسانہ [یعنی س سے سانہ] بھی بہت سی فارسی لغات میں پایا جاتا ہے لیکن اس کی اصل سب کے نزدیک بالاتفاق شاخشانہ ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہندوستان میں منڈ چرے اور اگھوری فقیروں کا گروہ ہے اسی طرح [ایران] میں بھی منڈ چرے فقیروں کا ایک گروہ ہے۔جس کا قاعدہ ہے کہ ہاتھوں میں ڈنڈوں کے بجائے سینگ اور مینڈھے کے شانہ کی ہڈی لے کر مکروہ آواز کے ساتھ بجاتے ہوئے دکانوں اور گھروں پر مانگنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔اگر صاحب خانہ یا مالکِ دُکان نے سیدھی طرح پیسہ دے دیا تو خیر ورنہ وہیں پاکھنڈ پھیلانے اور اپنا سر چیرنے اور چھری لے کر اپنے اعضاء کاٹنے اور خون بہانے لگتے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ لوگ تنگ آ کر انھیں کچھ نہ کچھ دے کر ٹال دیتے ہیں۔پس اس وجہ سے فارسی میں ڈراوے دھمکی اور خوف کے معنی ہو گئے۔اگر کوئی شخص کسی کا مطلب بر نہ لائے اور وہ اسے مرنے مارنے کی دھمکی دے تو کہتے ہیں کہ تم ہم سے شاخسانہ کرتے ہو یعنی مُنڈ چرا پن دکھا کر ڈراتے ہو۔پس اردو والوں نے اس سے حجت، رخنہ، فتنہ اور موجبِ خلل بات کا مفہوم کر کے ان معنوں میں مستعمل کر لیا......

حضرت شاہ نصیر نے اس کو شاخسانہ ہی باندھا ہے۔ہمیں صاحبِ بہار عجم پر تعجب ہے کہ انھوں نے شخصانہ بہ صاد مہملہ مخفف شاخسانہ کیوں کر شاخسانہ کے ساتھ ملا دیا۔''

☆......❁......☆

(۵۷)

کمری [ک مفتوح، م ساکن]

یہ لفظ کمر بمعنی پیٹھ سے ہے۔ ایک قسم کا شلوکا، کمر تک کی صدری۔
لیکن ایک قسم کے گھوڑے کو بھی کہتے ہیں۔ گھوڑے کے ایک عیب کا بھی نام ہے۔
وہ گھوڑا جو چڑھائی پر نہ چڑھ سکے، کمزور کمر کا گھوڑا، میر حسن مثنوی سحرالبیان میں لکھتے ہیں:

نہ حشری[1] نہ کمری نہ شب کور وہ
نہ وہ کہنہ لنگ اور نہ منھ زور وہ

اصطلاحاتِ پیشہ وراں میں ہے:

خدا نا کروہ گر کمری ہو گھوڑا
تو ہانک اونچے پہ اس کو کر کے کوڑا

چڑھے گر صاف تو کمری نہیں ہے
جو ہو برعکس اس کے تو یقیں ہے

کُریال [ک مضموم]

پرندے کا مزے میں آ کر فراغت سے بیٹھنا اور چونچ سے اپنے پروں کو کریدنا۔
بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

موسمِ گل کی خبر سن کے قفس میں صیاد
آ کے کُریال میں ہر مرغِ خوش آہنگ کھلا

کریال کے معنی اسی وجہ سے آنند، سرور، امن، راحت، آسودگی، بےفکری بھی آتے ہیں۔

کُریال میں غُلیلہ لگنا [غ مضموم، یائے مجہول]

عیش و آرام میں خلل پڑنا، انسان آرام وفراغت سے بیٹھا ہو اور اچانک کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ ''غلیلہ'' ہے غُلّہ، وہ گولی جو غلیل میں رکھ کر پرندے کے مارتے ہیں۔ گویا پرندہ بےفکری سے شاخ پر بیٹھا آرام سے اپنے پر چونچ سے کریدتا ہو اور اچانک اسے ایک غُلّہ آ کر لگ جائے۔

سجاد کا شعر ہے:

بیٹھے اگر خوشی سے آ کر چمن میں بلبل
کریال میں غلیلہ ایسا لگے کہ اڑ جائے

کُریز [ک مضموم، یائے معروف]

کریال کے سلسلے میں ایک ملتا جلتا لفظ کُریز بھی ہے۔ مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں کریز کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''پرندوں کا پرانے پروں کو جھاڑ کر نئے نکالنا، پرانے پر گرانا۔ پرندوں کے پر جھاڑنے کی کیفیت جس میں وہ نہایت بدنما اور بدہیئت معلوم ہوتے ہیں۔
>
> صاحب فرہنگ جہانگیری لکھتے ہیں کہ لفظ کُرِیچ دو معنی میں آتا ہے۔ اول معنی وہ جھونپڑا جو اکثر دہقانی لوگ اپنے اپنے کھیتوں میں پھونس یا پولیوں وغیرہ سے بیٹھنے کے واسطے بنا لیتے ہیں اور نیز جب شکاری پرندوں جیسے باز و شاہین وغیرہ کے پر جھاڑنے کا زمانہ آتا ہے تو ان کو بھی گھروں میں باندھ یا پنجروں میں چھوڑ دیتے اور کہتے ہیں کہ

کریز بستہ اند یعنی درخانہ بستہ اند۔ عوام نے غلطی سے پر گرانے کے
معنی سمجھ لیے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں حکیم سنائی اور حضرت امیر
خسرو کے شعر میں بھی یہی معنی لکھے ہیں۔ مگر چوں کہ یہ معنی داخلِ
اصطلاح ہو گئے اس وجہ سے دوسرے معنی یہی قرار دیے ہیں۔''

کلابتّو [ک مفتوح، ب مفتوح، ت مشدد نیز ت غیر مشدد، واو معروف]

زری کے کام میں آتا ہے۔ اسے نون کے ساتھ کلابتون بھی لکھتے ہیں۔ سونے چاندی کے تاروں کو ریشم کے ڈوروں پر بٹ کر چڑھاتے ہیں۔ زردوز بہت استعمال کرتے ہیں۔ ''فیلن'' نے اپنی لغت میں اس کی وجہ تسمیہ کُل کا بٹا ہوا [ہونا] لکھا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ کو اس سے بہت اختلاف ہے اور اس کے متعلق انھوں نے دلچسپ فقرے درج کیے ہیں:

''جن لوگوں نے اس کی وجہ تسمیہ کُل کا بٹا ہوا لکھا ہے یہ محض گھڑت
ہے۔ وہ ذرا اکبرنامہ کو آنکھ کھول کر دیکھیں۔ اول تو یہ کُل کے ذریعے
بٹا ہی نہیں جاتا۔ ہاتھ اور پنڈلی کے رگڑے سے بٹا جاتا ہے۔
دوسرے اگر بالفرض کُل سے بٹا جانا تسلیم کیا جائے تو بھی اس کی
حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی۔ جس مادہ سے اصلی حقیقت معلوم نہ ہو وہ
مادہ نہیں کہلاتا۔ فیلن صاحب کو بھی ان کے نوجوان مددگاروں نے
ایسا ہی دھوکا دیا ہے۔''

کماویں میاں خانخاناں اُڑاویں میاں فہیم

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''یعنی اعلیٰ دولت پیدا کرے اور ادنیٰ کے تصرف میں آئے۔ غیر مال
سے بہرہ مند ہوں اور حقدار محروم رہے۔

عبدالرحیم خان خاناں نے جو بیرم خاں خان خاناں کا بیٹا اور اکبری نورتن کا ایک اعلیٰ رکن تھا، اپنی ذاتی فیاضی اور سخاوت کے علاوہ اپنے غلام مرزا فہیم کو بھی اس کی بہادری خدمت گزاری اور جاں نثاری کے سبب ایسا ہی فیاض اور سخی بنا دیا تھا۔ چنانچہ جو کچھ خان خاناں کا مال تھا وہ سب فہیم کے اختیار اور ہاتھ میں تھا۔ جو کچھ خاں خاناں کماتا فہیم اسے چاہے جس طرح خرچ کرتا۔ پس اس وجہ سے یہ مثل مشہور ہو گئی۔ چنانچہ فہیم آخر کار اپنے آقا پر ہی تصدُّق ہوا جس کا ذکر تزک جہاں گیری میں اس طرح لکھا ہے کہ جہاں گیر کو خان خاناں کی فتنہ سازی اور نیرنگ پردازی سے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ کیوں کہ شاہجہاں کی بغاوت کے زمانے میں اس کا بیٹا داراب شاہجہاں کے پاس چلا گیا تھا۔ پس مشیرانِ دربار کے مشورے سے خانخاناں کو نظر بند کر رکھا تھا اور اس کے گھر پر شاہی پہرا آ گیا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے اس کا مال ضبط کرنے اور فہیم نام کے اس کے نمک حلال غلام کو پکڑ لانے کے واسطے کچھ آدمی بھیجے۔ اس نے نامردی کے ساتھ گرفتار ہونا اور اپنے آقا کا مال دوسروں کے ہاتھ لگنا مناسب نہ جان کر خوب دادِ مردانگی دی اور انجام کار اپنے نوکروں سمیت ہلاک ہوا۔"

☆......☆

حواشی

۱۔ حشری: سرکش (گھوڑا)۔ اس کے علاوہ کمری (کمزور کمر والا)، شب کور (جسے رات کو دِکھائی نہ دیتا ہو)، کہنہ سنگ یا کہن لنگ (جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکے) اور منہ زور بھی گھوڑوں کے عیب

ہیں (ماخوذ: فرہنگِ تلفظ، اسٹین گاس)۔

۲۔ کریز: حقی صاحب نے فرہنگِ تلفظ میں اسے کاف مفتوح اور یائے مجہول سے لکھا ہے لیکن پلیٹس نے کاف مفتوح اور یائے معروف دیا ہے۔ اسٹین گاس نے کاف مفتوح و یائے معروف نیز کاف مضموم و یائے معروف دونوں تلفظ دیے ہیں۔

☆......☆

(۵۸)

کمال کرنا [ک مفتوح]

عام محاورہ ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نے اس کی اچھی تشریح کی ہے۔ کمال کے جو مختلف معنی ہیں مثلاً اس مصرعے میں ہے:

اے کمالِ افسوس ہے تجھ پر کمالِ افسوس ہے

کمال دو الگ الگ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے استعمال اور فرق کی مثالیں دی ہیں۔ اسی کے ذیل میں نظام دکن میر محبوب علی خاں کا ایک فی البدیہہ شعر لکھا ہے۔ اس شعر کا انگریزی ترجمہ مشہور عالم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے کیا تھا وہ ترجمہ بھی انگریزی میں ہی درج کیا ہے اس کے بعد بہادر شاہ ظفر کے اسی طرح ایک فی البدیہہ شعر کی تفصیل لکھی ہیں۔ یہ باتیں عام طور پر معلوم نہیں۔ دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ مولوی سید علی صاحب بلگرامی کا ترجمہ بھی یادگار حیثیت رکھتا ہے اس لیے ہم اسے فرہنگ آصفیہ سے التقاط کر کے اسی طرح درج کرتے ہیں:

> ''کمال کرنا: (فعل متعدی)۔ کسی تعجب خیز و حیرت انگیز بات کا بروے کار لانا، قیامت کرنا، کوئی عجیب یا انوکھا کام کرنا، اعجاز کرنا، کسی ہنر یا جوہر یا صنعت میں قابلیت دکھانا، کاری گری دکھانا، استادی دکھانا، اعلیٰ درجے کی لیاقت ظاہر کرنا، اپنی جدتِ طبع اور ایجاد کا ثبوت دینا، قابل تعجب کام کرنا۔
>
> حضرت فصیح الملک داغ دہلوی سلمہٗ اللہ تعالیٰ:

ہزار کام مزے کے ہیں داغؔ الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

اگر اس جگہ طنزاً کمال کرنا کے معنی لیں تو بُرا کرنا، قابلِ افسوس کام کرنا، اچھا نہ کرنا وغیرہ چسپاں ہیں۔

اس معنی کی نظیر کے واسطے ہمارے ہاتھ دکن کے سفر میں ایک ایسی عمدہ اور تازہ مثال آئی ہے کہ اگر ہم اسے کلام الملوک ملوک الکلام کے خیال سے فرہنگ آصفیہ کا سرتاج قرار دیں تو باعثِ فخرِ کتاب ہے اور جو بہ لحاظِ برجستگی و شستگیٔ زبان درجِ لغات کریں تو انتخاب لاجواب۔ دراصل وہ ایک فی البدیہہ شعر ہے جو شکارگاہ، مان کوٹہ، کے مقام پر ۱۴ ذی الحج ۱۳۱۰ ہجری النبوی مطابق ۲۰ جون ۱۸۹۴ء یوم جمعہ کو جناب معلیٰ القاب میر محبوب علی خاں بہادر سلطانِ حیدر آباد دکن آصف جاہ سادس بالقابہٖ کی زبان مبارک سے جس وقت کہ آپ دو جگادری شیروں کا شکار مار کر بندوق لیے ہوئے ان کی کمروں پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہیں [ارشاد ہوا[1]] اور راجہ لالہ دین دیال صاحب مصور جنگ نے جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ ہیں شبیہہ مبارک اتاری ہے۔ اس سے خوش ہو کر زبانِ فیض ترجمان سے لالہ صاحب موصوف کی شان میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس شعر میں دو معنی کی نظیریں موجود ہیں ایک تو لفظ کمال کے نمبر ۴-۵ کی (۴-اچرج کرم، انوکھی بات، حیرت انگیز اور تعجب خیز امر، طرفہ معاملہ، تصرف، اعجاز-۵- صنعت، کاری گری، ہنر نمائی، استادی۔)

اور دوسری نمبر ۷ کی (۷-از حد، نہایت، بدرجۂ غایت) چوں کہ اس جگہ کمال کرنا کے ساتھ شعر میں آیا تھا لہٰذا اسی موقع پر یہ شعر تمیناً و تبرکاً

درجِ فرہنگ کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہِ دہلی کے ایک فی البدیہہ شعر کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو ایک ایسے ہی موقع پر سرزد ہوا تھا۔ سلطانِ دکن کا یہ شعر راجہ دین دیال صاحب مصور جنگ نے مع ترجمہ انگریزی ہمارے نوجوان دوست میر شاکر علی صاحب موجد فنِ خوشنویسی وغیرہ وغیرہ سے لکھوا کر خود فوٹو اتارا ہے۔

شعر

نتیجۂ طبعِ سلطانی وقریحۂ خاقانی اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی

عجب یہ کرتے ہیں تصویر میں کمال کمال
مصوروں کے ہیں استاد لالہ دین دیال

Translation by Shamsul Ulama Syed Ali Bilgrami, B.A., LL.B.

In art of picture making skilled surpassing all.
A master e'en of masters is Lala Deen Deyal.

جس طرح اعلیٰ حضرت والا شوکت نظام دکن نے راجہ دین دیال صاحب کے حق میں شکارگاہ کے مقام پر یہ برجستہ شعر فرمایا اسی طرح ایک مرتبہ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے ایک موقع پر سکھ دیو پہلوان کی نسبت ارشاد فرمایا تھا۔ جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ایامِ غدر سے چند روز پیشتر اکوَر کا مشہور پہلوان سکھ دیو نامی دہلی میں آیا اور بادشاہ کے حضور عرضی گزاری کہ حضور تمام شہر میں منادی کرا دیں کہ جس پہلوان کو دعویٰ کشتی ہو وہ کل جھروکوں کے نیچے آ جائے ورنہ آپ میں لنگوٹ کھول ڈالوں گا یعنی اپنا ثانی نہ دیکھ کر کشتی سے عہد کر لوں گا۔ چنانچہ دوسرے روز عین ریتی میں جھروکوں کے نیچے دہلی کی تمام خلقت اور بڑے بڑے نامی پہلوان جمع ہوئے اور

ایک بڑا بھاری میلہ لگ گیا۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ سکھ دیو سے کشتی لڑے۔ آخرکار سکھ دیو نے بھاری بھاری مگدر ہلا کر طرح طرح سے ڈنڈ پیل کر ڈھیکلیاں کھا کھا کر اپنا زور دکھایا اور بادشاہ کے روبرو لنگر لنگوٹا رکھ کر آئندہ کشتی کرنے، پکڑ لڑنے سے ہاتھ اٹھایا۔ بادشاہ سلامت نے اس کی خداداد طاقت اور دعوے کے ثبوت میں فی البدیہہ یہ شعر فرمایا اور ایک چاندی کی تختی میں کھدوا کر اس کے گلے میں ڈلوادیا۔

صورتِ رستم سیرتِ گیو
یکتا گُرد مہا سکھ دیو"

☆......☆

حاشیہ

۱۔ "ارشاد ہوا": بظاہر یہ الفاظ لکھنے سے رہ گئے ہیں۔

☆......☆

(۵۹)

گنج [گ مفتوح، نون ساکن]

خزانے کو کہتے ہیں اور اس بازار کو بھی جہاں اناج غلہ وغیرہ فروخت ہوتا ہے، غلہ منڈی۔ بعض چاقو اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں چاقو کے علاوہ کئی اوزار اور جمع کر دیتے ہیں، قینچی، پیچ کش، وغیرہ۔ [اسے بھی گنج کہتے ہیں][1]۔

فارسی شاعری میں ایران کے شہنشاہ کے گنجِ خسرو کا اکثر ذکر آتا ہے۔ ان میں بعض کا تذکرہ اُردو کے قصائد وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ خسرو کے آٹھ خزانے تھے اور ان کے الگ الگ نام تھے۔

خسرو نے جو خزانہ خود جمع کیا تھا اس کا نمبر ایک ہے اور اسے گنجِ عروس کہتے تھے۔ دوسرے خزانے کا نام گنجِ بادآورد تھا۔ یعنی ہوا کا[2] لایا ہوا خزانہ۔ اس نام کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ قیصرِ روم خسرو کے ڈر سے اپنے خزانوں کو کشتیوں میں لاد کے محفوظ مقام پر کسی جزیرے میں بھیجتا تھا۔ اتفاق سے زبردست ہوا چلی اور مخالف سمت میں چلی۔ کشتیاں اصل مقام کی طرف جانے کی بجائے بہتی ہوئی اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں خسرو نے اپنی چھاؤنی بنا رکھی تھی۔ اس نے تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور خزانہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ چوں کہ مفت اور بے دِقت ہاتھ لگا تھا اس لیے اس کا نام گنجِ بادآورد یا گنجِ بادر کھا اور اب ہر اس چیز کو کہنے لگے جو مفت ہاتھ آئے، مالِ مفت۔ تیسرا خزانہ گنجِ دیبا کہلاتا تھا۔ چوتھے کا نام گنجِ افراسیاب تھا۔ افراسیاب بھی ایران کا بادشاہ تھا۔ اس کا جمع کردہ خزانہ بھی خسرو کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ پانچویں کا نام گنجِ سوختہ تھا۔ چھٹا گنجِ خضراء۔ ساتواں گنجِ شاد

آورد۔ آٹھویں کا نام گنجِ بار تھا۔ اس کو گنجِ گاؤ بھی کہتے ہیں۔ یہ خزانہ خسرو کو ایک دہقان کے بتانے پر ملا تھا۔ اس خزانے میں سونے جواہرات سے بھرے ہوئے برتن تھے۔ اس دفینے کو ذوالقرنین کے خزانوں میں سے بتایا جاتا تھا۔

گنگارام اور مولا بخش [واوِلین]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی بیان کرتے ہیں کہ ایک بہت بڑا، ہاتھ بھر کا جوتا جو اکثر تحصیل داروں یا کوتوالوں کے پاس خراج ادا نہ کرنے والوں اور بدمعاشوں کو سزا دینے کے واسطے تحصیل یا کوتوالی میں رکھا رہتا تھا۔ جس جوتے سے ہندو خطاوار کو سزا دیتے اسے گنگارام اور جس سے مسلمان کو سزا دیتے اسے مولا بخش کہا کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے سے اس کا رواج ہوا اور اب تک چلا آتا ہے۔[۳]

لُونا چَماری [واو معروف نیز مجہول، چ مفتوح]

بنگالے کی ایک مشہور جادوگرنی کا نام جس کی نسبت، بقول مولوی سید احمد صاحب کے، عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ ہندوستان کے جادوگروں کی جگت استانی لونا چماری اور اس کے گرو گھنٹال میاں اسماعیل جوگی کے مندر جن کے شیطانی نام جادو ٹونے کے منتروں میں کام روپ دیس کے ساتھ ایسی باتوں کے معتقد اکثر جپا کرتے ہیں، قلعہ نا ندو واقع ملک آسام مقام کوچ بہار کے متصل پہاڑ کی چوٹی پر نیچے سے اوپر تک اب تک بنے ہوئے موجود ہیں۔ جن کی سیڑھیاں ایک ہزار کے قریب ہوں گی۔ انشاء اللہ خاں انشاء اپنی ایک مشہور غزل (؟) یا نظم میں لکھتے ہیں:

لونا چماری کی قسم اور کلوا پیر کی
کالی بلا کی غولِ بیابان کی قسم

مُٹھ بھیڑ/ مُٹ بھیڑ [م مضموم، ٹھ ساکن، یائے مجہول/ م مضموم، ٹ ساکن، یائے مجہول]

آمنا سامنا، مقابلہ وغیرہ۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی فرہنگ آصفیہ میں لکھتے

ہیں:

بعض پرانے شاعروں نے اس کو مٹھ بھیڑ اور بعض نے منھ بھیڑ اپنے اشعار میں باندھ دیا ہے اور انھیں کی پیروی کر کے فیلن جیسے لغت تراشوں نے بھی غلطی کھائی ہے بلکہ اس کے مترجموں نے بھی نظیر اکبر آبادی کے شعر کو دیکھ کر اسی طرف زور دیا ہے۔لیکن یہ محض غلط ہے۔ اگر علمِ زبان کے قاعدے سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ لفظ ابتدا میں مونڈ بھیٹ تھا۔مونڈ بمعنی سر اور بھینٹ بمعنی ملنا۔مونڈ سے واو گر کر منڈا ہوا اور منڈا سے نون گر کر مڈ ہو گیا۔چوں کہ ''ڈ'' اور ''ٹ'' کا ہندی میں بدل ہے جیسے کاٹھا اور کانٹا۔ڈونڈی اور ٹونڈی۔ اڈا اور اٹا۔ٹھاڈ اور ٹھاٹ وغیرہ۔پس ''مڈ'' کا ''مٹ'' بن گیا نہ کہ مٹھ، علیٰ ہذا القیاس، بھیٹ سے بھیڑ ہو گیا۔کیوں کہ ''ٹ'' اور ''ڑ'' کا بھی اسی طرح باہم بدل پایا جاتا ہے۔جیسے ہَٹ تال کا ہڑتال، ٹمٹنا کا ٹمڑنا۔چُھڑانا کا چُھٹانا۔پٹا کا کا پڑاکا۔لہٰذا اس لفظ کے مرکب معنی دو مختلف سَروں کا ملنا یا ٹکرانا ہے۔

ہم اس جگہ نظیر کا ایک بند لکھ کر دکھاتے ہیں کہ اس نے جو مٹ بھیڑ کو مٹھ بھیڑ باندھ دیا۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ زبان اور اس کی تحقیق یا فصیح وغیر فصیح الفاظ کا پابند نہیں۔اسی بند میں کئی ٹکسال باہر گھڑے ہوئے لفظ موجود ہیں جس سے وہ ساقط الاعتبار ہو سکتا ہے:

بے چین ہوا دل سینے میں گر دیکھنے میں کچھ دیر ہوئی
گھبرا کے نکلے بے بس ہو اور شوق کی گھیرا گھیر ہوئی
بازار گلی اور کوچوں میں ہر ساعت ہیرا پھیر ہوئی
تھی چاہ نظر بھر دیکھنے کی جس جاگہ پر مٹھ بھیڑ ہوئی
ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

مَدار [م مفتوح]

فرہنگ آصفیہ میں ہے کہ آکھ کا درخت۔ایک صحرائی درخت کا نام جس سے دودھ نکلتا ہے اوراس کے ڈوڈوں میں سے روئی کی مانند روئیں نکلتے ہیں۔اور شاہ مدار کا مخفف۔کہتے ہیں کہ یہ ایک مجذوب اور درویشِ کامل میاں روشن شاہ کے مریدوں میں سے تھے۔ہمیشہ گنگوانہ میں جو اجمیر شریف سے چار کوس کے فاصلے پر ہے،رہا کرتے تھے۔اکثر لوگ ان کے دیکھنے والے ان کی کرامات کے قائل ہیں۔ان کی قبر پر ایک بہت بڑا جال کا درخت کھڑا ہے۔اس کی نسبت مشہور ہے کہ پہلے سوکھا تھا جب آپ وہاں بیٹھنے لگے تو سر سبز ہوگیا۔یہاں تک کہ اس کی شاخیں زمین سے جالگیں اور بعد از انتقال اسی جگہ دفن ہوئے۔ جہلا ان کو بہت مانتے ہیں۔

☆..... ☆

حواشی

۱۔ توضیحاً ان الفاظ کا اضافہ کیا گیا۔

۲۔ قادری صاحب نے ''کو'' لکھا تھا بجائے کے۔سہوِ قلم ہے۔

۳۔ مولا بخش: تعلیمی اداروں میں بچوں کو سزا دینے یا محض ڈرانے کے لیے جو ڈنڈا رکھا جاتا تھا اسے بھی مولا بخش کہتے تھے اور شاید اس کی اصل بھی یہی بڑا جوتا ہوگا جو پٹائی کے لیے رکھا جاتا تھا لہٰذا پٹائی کی مناسبت سے ڈنڈے یا چھڑی یا قمچی کو بھی مولا بخش کہنے لگے ہوں گے۔واللہ اعلم۔

(۶۰)

لیلاوَتی [یاے معروف[1]، و مفتوح]

کھلنڈری عورت۔ عیش ونشاط منانے والی عورت۔ یہ اصل میں بھاسکرآ چارج[2] کی بیٹی کا نام ہے، جو مشہور مہندس اور ریاضی داں گزرا ہے۔ ہندوستان کا بہت بڑا ہیئت داں بھی تھا۔ مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ لیلاوتی اسی کی بیٹی ہے۔ بھاسکر کا زمانہ بعض کے قول کے مطابق محمد غوری کا وقت یعنی ۱۱۹۴ء پایا جاتا ہے۔ بعض اس سے پیشتر بیان کرتے ہیں، لیلاوَتی ایسی بدنصیب پیدا ہوئی تھی کہ جَنَم پتری سے اس کا سدا کنوارا رہنا سمجھا جاتا تھا۔ بھاسکرآ چارج کے دل میں یہ بات ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی تھی۔ بہت سی اُدھیڑبُن کے بعد یہ بات خیال میں آئی کہ پھیروں کے لیے ایسی شبھ گھڑی مقرر کرنی چاہیے جس سے گرہ کی سختی جاتی رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا وقت اتفاق ہی سے ملتا ہے۔ مدتوں بھاسکرآ چارج اس ساعت کا منتظر رہا۔ جب وہ دن آیا اور وہ شبھ گھڑی قریب آ پہنچی تو اس نے ایک ہوشیار مُنَجّم کو گھڑی کے کٹورے پر نگہبانی کے لیے کھڑا کر دیا اور نہایت تاکید کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ جس وقت کٹورا ڈوبے اسی وقت ہمیں آ کر اطلاع دو۔ مگر تقدیر کا لکھا کب مٹتا ہے۔ جو گھڑی بھاسکر نے اتنی مدت سے سادھ رکھی تھی وہ ایک آن کی آن میں ہاتھ سے نکل گئی اور

سب ہاتھ ملتے رہ گئے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ نئی چیز کو بڑے چاؤ سے دیکھتے ہیں۔ لیلاوتی گو سمجھدار تھی مگر بچہ ہی تھی۔ جس ناند میں کٹورا ڈال رکھا تھا اس کے پاس بار بار جاتی تھی اور جھک جھک کر کٹورے کو دیکھتی تھی۔ ایک بار جھکنے میں اس کی چوڑی کا ایک موتی جھڑ گیا اور وہ کٹورے کے عین سوراخ پر جا کر ٹھیرا۔ فوراً پانی آنے کا رستہ بند ہو گیا۔ جب اندازے سے زیادہ دیر لگی اور منجم نے آکر کچھ خبر نہ دی تو بھاسکر آچارج کا ماتھا ٹھنکا۔ دل میں سمجھا کہ لیلاوتی کے ستارے نے شاید کچھ کرشمہ دکھایا۔ اس نے کٹورے کو آکر جو دیکھا یہاں کٹورے کے بھرنے میں بہت دیر تھی۔ اس کا پانی نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے سے موتی نے اس کا روزن بند کر رکھا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ بھاسکر نے اپنے جی میں کہا کہ یہ ہمارے منصوبے باندھنے بالکل عبث ہیں۔ پرمیشر کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہلتا۔ پھر اپنی بدنصیب بیٹی سے کہا سنو پیاری بیاہ شادی اس واسطے کرتے ہیں کہ اولاد ہو اور اس سے دنیا میں نام چلے۔ سو تیرے نام کی ایک ایسی کتاب بناتا ہوں کہ جب تک دنیا قائم ہے اس سے جہاں میں تیرا نام روشن رہے گا۔ حقیقت میں اس نے جو اقرار کیا تھا اسے پورا کیا۔ حساب اور ہندسۂ عملی میں ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی اور لیلاوتی اس کا نام رکھا۔ جس سے آج تک لیلاوتی کا نام زبان زد خاص و عام ہے۔ غرض جب یہ بات ٹھیر گئی کہ لیلاوتی کو ساری عمر کنوارپن میں رہنا پڑے گا۔ تو باپ نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے اسے ہر طرح کے علم سکھائے اور سچ یہ ہے کہ اس نے بیٹی کی تنہائی کا ایسا عمدہ علاج کیا کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ کہتے ہیں کہ لیلاوتی نے حساب میں

وہ مشق بہم پہنچائی تھی کہ ایک نگاہ ڈال کر بڑے سے بڑے درخت
کے پھل اور پتوں کا شمار بتا دیتی تھی۔ جسے مساوات جاننے والے
خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس مہارت کے سبب سب کو یہی یقین ہو گیا تھا
کہ وہ کتاب خاص اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب لیلاوتی کی ترتیب
اس عنوان پر رکھی ہے کہ اول سے آخر تک باپ بیٹی سے سوال کرتا چلا
گیا ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ فیضی نے اور انگریزی میں ڈاکٹر ٹیلر
نے کیا ہے۔"

لینا ایک نہ دینا دو [یاے مجہول، یاے مجہول]

محاورہ۔ حاصل نہ وصول، فائدہ نہ مطلب، ناحق کی مصیبت، مفت کی علت وغیرہ۔
نظیر اکبر آبادی:

کوئی پھول کے بیٹھے مسند پر کوئی رو دے اپنی دولت کو
جو اپنا ہو سو مجھ سے لو اور میرا ہو سو مجھ کو دو
کوئی لڑتا ہے کوئی مرتا ہے کوئی جھگڑے حق پر ناحق کو
جو دیکھا خوب تو آخر کو کچھ لینا ایک نہ دینا دو

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ اس محاورے کی نسبت ایک کہانی بھی مشہور ہے کہ ایک مینڈک اور مور کی دوستی تھی۔ ایک روز مور مینڈک کو باغ کی سیر کرانے لے گیا۔ مینڈک نے کہا کہ یار میں تو تھک گیا۔ میرے گھر پہنچا دو۔ مور نے پیٹھ پر بٹھا جھٹ دریا کنارے پہنچا دیا۔ جب واپس آیا تو ایک چڑی مار نے جال بچھا رکھا تھا۔ یہ دانے کے لالچ سے جا پھنسا۔ مور نے کہا مجھے کیوں پکڑا۔ اس نے کہا داموں کے لالچ سے۔ اس نے کہا چلو میرا ایک دوست یہاں سے قریب ہے اس سے کچھ دلوا دوں۔ وہ مان گیا۔ یہ مینڈک کے پاس لایا اور کہا اسے کچھ دے کر میرا پیچھا چھڑا دو۔ اس نے ایک لعل لا کر چڑی مار کو دیا۔ چڑی مار نے کہا میں تو دو لوں گا۔ مینڈک نے کہا تم مور کو تو چھوڑ دو، میں دوسرا بھی

لاتا ہوں۔ اس نے کہا اچھا۔ مور کے رہا ہوتے ہی مینڈک نے اپنے یار سے کہا کہ لو یار اڑ جاؤ۔ اب تو لینا ایک نہ دینا دو۔ یعنی نہ تو میں اس سے اب ایک وہ لعل واپس لیتا ہوں اور نہ دو دیتا ہوں۔ کام بن ہی گیا۔ اسی کے نتیجے سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل مشہور ہو گیا۔

مَریَم کا پنجہ [م مفتوح، ر ساکن، ی مفتوح، پ مفتوح، ن ساکن]

ایک قسم کی خوشبودار گھاس ہوتی ہے۔ جو پنجے کی شکل کی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حضرت بی بی [مریم] نے پیدائشِ مسیح علیہ السلام کے وقت اس گھاس کو مٹھی میں پکڑ لیا تھا۔ اس وقت سے اس شکل پنجے کی سی ہو گئی اور اسے پنجۂ مریم کہنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں اس گھاس کو پانی میں ڈال کے حاملہ کے آگے رکھا، بچہ آسانی سے پیدا ہو گیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس گھاس کی خاصیت بھی یہی ہے۔ اس کو بخُورِ مریم بھی کہتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ہے کہ ہندوستان میں چرچٹے کی جڑ کی بھی یہی خاصیت ہے کہ جہاں اسے عورت کے پیٹ سے باندھا اور بچہ آسانی سے پیدا ہو گیا۔

اس زلفِ فتنہ زا کے لیے اے مسیح دم
کچھ دستِ شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں[۳] (ذوق)

☆......☆

حواشی

۱۔ لیلاوتی: بمعنی حسین یا چلبلی عورت۔ قادری صاحب نے لام پر زبر لکھا ہے گویا وہ اس کا تلفظ بیائے لین درست مانتے ہیں لیکن درست تلفظ بیائے معروف ہے (دیکھیے: پلیٹس)۔

۲۔ بھاسکرا چارج: پلیٹس نے ''لیلاوتی'' کی تشریح میں اس کا نام بھاسکرا چاریہ لکھا ہے۔

۳۔ دوسرے مصرعے میں قادری صاحب نے ''کم'' کے بجائے سہواً ''کچھ'' لکھ دیا تھا۔ تصحیح کی گئی (دیکھیے: کلیاتِ ذوق (مرتبہ تنویر احمد علوی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۹ء، اشاعتِ ثانی، ص ۱۸۴)۔

☆...☆

(۶۱)

مُقَّیش [م مضموم، ق مشدد، یائے مجہول]

(تلفظ: مُق ـ قے ش) سونے چاندی کے تاروں سے تیار کردہ تار یا سنہرا روپہلا ڈورا، زری، تاش، بادلہ اور زربفت۔ اس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جو سونے چاندی کے تاروں سے بُنا گیا ہو۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں اور متعدد مثالیں اس تلفظ کی مختلف شعراء کے کلام سے فراہم کرتے ہیں:

آنچلوں سے کہو مُقَیش کہاں جھڑتا تھا
کب دوپٹے پہ مری طرح گرا پڑتا تھا
(مومن خاں مومنؔ)

چاہیے مُقَّیش اس مہ رُو کی چوٹی کے لیے
چرخِ گرداں پر اب اے خورشید تارِ زرّیں کھینچ
(ناسخؔ لکھنوی)

گوٹا کناری بادلہ مُقَّیش کے سوا
تھے چار تولے موتی جو تولا ازار بند
(نظیر اکبر آبادی)

اور اِک اوڑھنی جالی مُقَیش کی
پڑی چاندنی سی مہِ عیش کی
(میر حسن دہلوی)

ان مثالوں کے بعد مولوی سید احمد صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے:
''اس لفظ کی اصل میں فرہنگ نویسوں نے بڑی بُری رائیں لگائی ہیں۔ کسی نے آنکھیں بند کر کے عربی لکھ دیا ہے اور جو اس کا مادّہ قرار دیا ہے وہ بالکل عربی معانی کے مخالف ہے۔ بعض ترکی ہی لکھ گئے ہیں۔ جونسن جیسے محقق نے بھی اسے عربی لکھ کر دھوکا کھایا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بعض فارسی کے شعراء نے اہلِ ہند کا تتبع کر کے اسے بتغیرِ حرکات مُقَیَش باندھ دیا ہے۔ [یعنی بتشدیدِ ''ی''] یہ لفظ حقیقت میں ہندی ہے۔ اُردو والوں نے فصاحتِ کلام کے خیال سے کاف کو قاف سے بدل لیا ہے اور ایسا فارسی زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً قلاقند اصل میں کلاکند تھا۔ قلابازی اصل میں کلا بازی تھا۔ قندھار اصل میں کندھار تھا۔ چنانچہ ہمارے ایک دوست نے جو مرضِ تحقیق کے بیمار اور ایک بہت بڑے لائق آدمی ہیں ہم کو لکھا کہ اس کی اصل مکش بمعنی کرن یعنی شعاع اور کیش بمعنی بال ہے۔ بے شک یہ مادہ قابلِ تسلیم ہے کیوں کہ کیش زبانِ سنسکرت میں بالوں کو کہتے ہیں مگر لفظ مکش کا پتا کسی سنسکرت ڈکشنری میں نہیں ملا۔ پنڈتوں کے مؤلفہ کوشوں [لغات] میں ہم نے دیکھا۔ اہلِ فرنگ کی سنسکرت ڈکشنریوں میں ہم نے ڈھونڈا لیکن کہیں اس کا سراغ نہیں ملا۔ اگرچہ ہمارے دوست نے بھی کسی پنڈت سے ہی معلوم کیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت

صاحب نے صرف اپنے تبحر کے اعتبار سے بلا تحقیق فرما دیا ہے۔
بہر حال اس کے ہندی اور لفظ کیش سے مرکب ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ گو اول لفظ ابھی تک زیرِ تحقیق ہے اور عجب نہیں کہ وہ حرفِ میم म ہو۔ کیوں کہ سنسکرت میں اس مفرد حرف کے معنی چاند کے بھی آئے ہیں۔ پس چاندی کے تار کے معنی ہو گئے۔ لیکن اس سے بھی بہتر مادہ خیال میں آتا ہے کہ اول کا لفظ ماکشِک माक्षिक ہو گا۔ کیوں کہ اس کے معنی زبانِ سنسکرت میں دھاتی چیز کے آئے ہیں اور اسی وجہ سے سُورن ماکشک सुवर्णमाक्षिक سونے کا یعنی سنہرا اور روپ ماکشِک रूपमाक्षिक چاندی کا یعنی روپہلا کہلاتا ہے۔ پس اوّل سورن یا روپ کا لفظ حذف ہو گیا پھر کثرتِ استعمال سے ماکشِک کا آخر حرف کاف گر کے ماکش مطلق سونے یا چاندی یعنی چمک دار دھات کے معنی میں رہا اور رفتہ رفتہ وہی ماکش مکش ہوا پھر مکیش ہو گیا۔ اس صورت میں لفظِ کیش بمعنی بال سے مرکب کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہ رہی اور یہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے مولانا آزاد اس لفظ کی نسبت اپنے رسالہ ''سخندانِ پارس'' [کذا][1] میں اس طرح تحقیق فرماتے ہیں کہ: ''یہ لفظ دراصل سنسکرت میں مَیکُش کیش تھا۔'' اس میں مَیکُش سورج کی کرن اور کیش بال۔ دونوں مل کر موئے شعاعی ہو گئے۔ تعجب ہے محققِ ہند صاحبِ بہارِ عجم سے کہ وہ اسے عربی کا لفظ مان کر کہتے ہیں کہ مُقَیش ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھتے کہ عربی میں اس کا ماخذ اور اصل کیا ہے۔
صاحبِ غیاث اللغات اس کا حوالہ لکھتے اور توضیح میں اس سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ جب اصل نہیں تو زور کیا چل سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔''

مکر چاندنی [م مفتوح، کاف ساکن، رساکن، نون غنہ]

پچھلی رات کی ملگجی یا دھندلی چاندنی جو صبح ہو جانے کا دھوکا دیتی ہے، جھوٹی چاندنی۔

ذوق دہلوی کا شعر ہے:

ریشِ سفیدِ شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

داغ کا شعر ہے:

بے خود شب وصالِ عدو میں وہ مست ہے
اب مکر چاندنی جو کھلی بھی تو کیا کھلی

مُکری [م مضموم، ک ساکن]

کہہ مکرنی بھی کہتے ہیں[۲]۔ اس کے موجد حضرت امیر خسرو ہیں۔ چار مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے تین کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کا ذکر ہے لیکن بالکل آخیر میں ایسا لفظ آتا ہے جس سے مفہوم بدل بھی جاتا ہے اور صاف بھی ہو جاتا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے یہ مثالیں دی ہیں:

وا بن مو کو[۳] چین نہ آئے
وہ میری تِس[۴] آن بجھائے
ہے وہ سب گن[۵] بارہ بانی[۶]
اے سکھی ساجن، نا سکھی پانی

آپ ہلے اور موہے ہلاوے
وا کا ہلنا مورے من بھاوے

ہل ہلا کے بھیو نسنکھا
اے سکھی ساجن ، نا سکھی پنکھا
(بھیونسنکھا یعنی فارغ)

وہ آوے تب شادی ہوے
اس بن نیکا[۷] اور نہ کوے
میٹھے لاگیں وا کے بول
اے سکھی ساجن ، نا سکھی ڈھول

☆......☆

حواشی

۱۔ محمد حسین آزاد کی کتاب کا نام سخن دانِ فارس ہے نہ کہ سخن دانِ پارس۔

۲۔ مکری/ کہہ مکری: پلیٹس کے مطابق مکری اور کہہ مکرنی کے علاوہ اس کا نام کہہ مکری بھی ہے (یعنی کہہ کے مکر جانا کے مفہوم میں)۔

۳۔ وا بن موکو: اس کے بغیر مجھے۔

۴۔ ترس: پیاس؛ خواہش۔

۵۔ گن: خوبی، صفت۔

۶۔ بارہ بانی: کامل، خالص، کھرا (یعنی وہ ہر خوبی میں کامل اور کھرا ہے)۔

۷۔ نیکا: اچھا، خوب، بھلا۔

☆......☆

(۶۴)

نمازی کا ٹکا [نون مفتوح، ٹ مفتوح]

مکافاتِ عمل، بدی کا بدلہ۔ وہ بات جس کا بدلہ کہیں نہ کہیں ضرور مل کر رہتا ہے۔ فعلِ بد اور اس کی سزا۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ ایک شریر لڑکا نماز پڑھتے میں لوگوں کی ٹانگیں گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب اس نے سجدہ کرتے وقت کسی نمازی کی ٹانگ گھسیٹی تو اس نے سرزنش کرنے کی بجائے سلام پھیر کر چپکے سے ایک ٹکا اس کے حوالے کیا تاکہ یہ مزہ پڑ جائے تو کبھی یہ سزا بھی پائے۔ اسے تو چاٹ لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے ایک جلاد پٹھان کے ساتھ بھی یہی حرکت کی۔ اس نے سلام پھیرتے ہی تلوار نکال کر اس کی گردن اڑا دی۔ پس جب سے یہ محاورہ زبان زدِ خاص و عام ہو گیا کہ میاں یہ تو نمازی کا ٹکا ہے۔ ہمیں ستا لو گے تو کیا ہو گا دوسری جگہ اس کی سزا پاؤ گے۔''

وہ پانی مُلتان گیا [م مضموم]

بمعنی موقع جاتا رہا۔ پہلے اس کی تشریح مولانا محمد حسین آزاد کے حوالے سے کی جا چکی ہے اور ذوق کا ایک شعر بھی درج ہو چکا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے ذوق ہی کا ایک دوسرا شعر دیا ہے اور محاورے کے سلسلے میں ایک حکایت درج کی ہے:

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن
اے ذوقؔ پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

اصل میں یہ ایک مشہور حکایت کی طرف تلمیح ہے۔ جس کا قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جب گورکھ ناتھ بھگتی رَیداس بھگتی کے پاس آیا تو اس وقت تشنگی کے غلبے سے پانی مانگا۔ پھر دل میں سوچا کہ رَیداس ذات کا چمار ہے۔ اس کا پانی کیا پیوں۔ اس خیال سے پانی تونبے میں تو بھر لیا مگر پیا نہیں اور ادھر اُدھر کی باتوں میں اس بات کو ٹال کر چلا گیا۔ وہاں سے کبیر صاحب کے پاس آ بیٹھا۔ یہاں بھی باتوں میں مشغول رہا۔ اتفاق سے کبیر کی بیٹی کمالی نامی نے وہ پانی اٹھا کر پی لیا۔ جس کے پیتے ہی تین لوک یعنی اکاس لوک، مرت لوک، پتال لوک کا حال اس پر کھل گیا۔ جس وقت گورکھ ناتھ پر یہ بات کھلی کہ اس پانی کے پینے سے کمالی کو اتنا بڑا درجہ مل گیا۔ تو اس وقت وہ اس پانی کے نہ پینے سے بہت ہی پچھتایا۔ آخر کار رَیداس کے پاس دوبارہ آیا اور پھر پانی مانگا۔ رَیداس اپنی بھگتی کے بل سے جان گیا تھا کہ گورکھ ناتھ نے اس وقت اپنے اِبھمان یعنی غرور کے سبب پانی نہیں پیا۔ اب اس کے واسطے پھر خواستگار ہے۔ اس عرصے میں کمالی کی سسرال والے بنارس آئے اور اسے ملتان جہاں اس کی سسرال تھی لے گئے۔ پس رَیداس نے گورکھ ناتھ کی بدقسمتی پر یہ دوہا پڑھا:

پیا دے تھے جب پیا نہیں تب تم نے اِبھمان کیا
بھولا جوگی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

کتبِ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رَیداس، کمال، کبیر، یہ تینوں رامانند کے چیلے تھے اور یہاں کمالی کبیر کی بیٹی لکھی ہے۔ جس کی صحت میں کلام ہے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کوئی نجومی کسی صاحب کمال درویش کے پاس اپنی مراد کے واسطے گیا تھا۔ چنانچہ درویش کو اس پر رحم آیا اور اس نے اپنا جھوٹا پانی پی جانے کو دیا۔ اس نے گِھن کھا کر نہ پیا۔ اتفاق سے وہیں ایک لڑکی بیٹھی کھیل رہی تھی۔ جس کی نسبت ملتان میں ٹھیری تھی۔ فقیر نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ غٹ غٹ پی گئی۔ جس کے سبب وہ صاحب تاثیر ہوگئی۔ نجومی یہ بات

سن کر پھر آیا اور وہی سوال کیا کہ میری مراد پوری کیجیے۔ اس وقت درویش کے منھ سے یہ فقرہ نکلا اور جب ہی سے یہ مثل ہوگئی۔

چت کمر[۱] مانگاہت کر[۲] دیا تیرے من کلیان گیا[۳]

بھولا نجومی پھرے دِوانہ وہ پانی ملتان گیا

یعنی اب وہ بات جاتی رہی۔ جب تو گھر بیٹھے مراد پوری ہوتی تھی اب ملتان جا کر تیرا کام بنے تو بنے۔ اصل میں ہندوستانیوں کے اعتقاد نے یہ گھڑت کر لی ہے۔

ہاتھ میں ٹھیکرا ہونا [یاے معروف]

بھیک مانگنے لگنا، کاسۂ گدائی ہاتھ میں لینا، فقیر ہونا۔ اس محاورے میں بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہونا یا لینا بھی بولتے ہیں۔ مراد وہی ہے۔ مانگتے پھرنا۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے یہ لطیفہ مرزا غالب کا لکھا ہے:

''مرزا اسداللہ خاں غالب کو جہاں اور شوق تھے وہاں حقہ بھی بکثرت پیتے تھے۔ ایک دفعہ حسب معمول نہایت تنگ دست ہوئے۔ کئی مہینے تک چلم بردار کو تنخواہ نہ دے سکے۔ وہ جس وقت چلم بھرنے آگ کے ٹھیکرے ۵ کے پاس گیا تو آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ جب چلم بھر کر لایا تو حضرت نے اس سے پوچھا کہ میاں آج تم ٹھیکرے سے کیا باتیں کر رہے تھے۔ اس نے عرض کیا کہ حضور کچھ نہیں یہ کہہ رہا تھا کہ آج چار مہینے ہو گئے تنخواہ نہیں ملی۔ دیکھیے کیوں کر کام چلتا ہے۔ میرزا نے پوچھا پھر بھئی ٹھیکرے نے اس کا کیا جواب دیا۔ چوں کہ ایک تو وہ ایسے لائق کا ملازم دوسرے خود بھی طبّاع اور ذکی تھا۔ عرض کیا کہ حضرت اس نے کہا کہ میں تیرے ہاتھ میں ہوں گا اور تو گلی گلی کی سیر کرتا طرح طرح کے لقمے کھاتا پھرے

گا۔ مرزا صاحب کو یہ لطیفہ پسند آیا۔ ایک دوست کے سامنے بیان فرما کر اس کی تنخواہ دلوادی۔"

☆......☆

حواشی

۱۔ اکھمان: غرور، تکبر، خود پسندی۔

۲۔ چت کر: سوچ کر (ماخوذ: پلیٹس)

۳۔ ہت کر: دوستانہ انداز میں، مہربانی سے۔ (ماخوذ: پلیٹس)

۴۔ گلیان گیا: پلیٹس کے مطابق ''گلیان'' کے ایک معنی ہیں: کھانے یا پینے کی کوئی چیز زبردستی حلق سے اتارنا۔ گویا (کسی چیز کا) کھانا یا پینا ناگوار ہونا۔

۵۔ ٹھیکرا: اس کے متعدد معنی ہیں مثلاً مٹی کے برتن کو بھی کہتے ہیں اور اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کو بھی۔ اس کے ایک معنی ہیں وہ برتن جس میں آگ رکھی جاتی ہے۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

☆......☆

(۶۳)

سُونٹھ [یائے مجہول نیز معروف، نون غنہ]

سوکھی ہوئی ادرک کو سونٹھ کہتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں لکھتے ہیں ہے:

''(گنوار) قیمتی چیز، نادر چیز، بیش بہا چیز، جیسے ایسی ہی تم نے سونٹھ بھیجی ہے۔

اس جگہ سوُنٹھ [یعنی س ں و ٹھ] کا نون قلب مکانی کی صورت پیدا کر کے سونٹھ خیال کیا گیا مگر ہندی کوشوں [لغتوں] میں فیلن ڈکشنری کے سوا کہیں اس سونٹھ [س ں و ٹھ] کا پتا نہیں لگتا۔ واللہ اعلم گھڑت ہے یا زبانی اعتبار پر لکھ دیا ہے۔ چوں کہ سونٹھ کے یہ معنی نہیں آتے۔ شاید اس وجہ سے یہ تکلیف فرمائی۔ لیکن ہماری رائے میں اس جگہ سونٹھ ہی اس معنی میں ہیں۔ کیوں کہ گاؤں گنویں میں یہ قیمتی چیز اس وجہ سے خیال کی جاتی ہے کہ ہر جگہ بوئی نہیں جاتی اور وہاں کبھی کبھی بلکہ خاص کر بچہ پیدا ہونے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ لوگ کسی نادر چیز کی طرح اسے وقت بے وقت کو لگا رکھتے ہیں۔ چنانچہ گنواری عورتیں جس کے گھر میں سونٹھ نہ ہو اسے نہایت غیر محتاط خیال کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب کوئی شخص کسی کھیت میں جانے کا ارادہ کرتا ہے اور کھیت کا مالک اسے روکتا ہے۔ تو یہ اس کے جواب

> میں کہتا ہے کہ تو نے ایسی ہی سونٹھ بور کھی ہے جو ہمیں منع کرتا ہے۔ یہ باتیں ہم نے بگوشِ خود سنی ہیں۔ پس ان دلائل سے سونٹھ کا ان لوگوں کے نزدیک عزیز اور نادرات سے ہونا کچھ عجب نہیں۔ اس کے علاوہ یہ محاورہ بھی انھی لوگوں سے بقالوں میں آ کر رائج ہوا۔"

دوسرے معنی مولوی سید احمد صاحب نے سونٹھ کے دیے ہیں چپ، خاموش، دم بخود اور اسے ہندوؤں کا محاورہ قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں:

> ''جیسے وہ تو سونٹھ ہوا ہے، کچھ جواب نہ دیا۔''

> اس معنی میں فیلن صاحب بہادر کی رائے ہے کہ ''لفظ شونیہ शून्य کو بگاڑ کر سونٹھ کر لیا ہے۔ لیکن سنسکرت کوشوں سے لفظ شونیہ کے معنی خالی اور صفر کے پائے جاتے ہیں۔ شاید اسے بھی یہ خیال کیا ہو۔ مگر ہم اس سے بھی متفق نہیں ہیں کیوں کہ ہمارے نزدیک ایک سونٹھ کی بستگی اور گرہ پن سے بجائے خود خاموشی کی حالت عیاں ہے۔ پس اسی قسم کے الفاظ پر ہمیں فیلن صاحب کی ڈکشنری پر اعتراض ہے اور اس اعتراض آنے کی وجہ وہی ہے کہ انھوں نے کم سن بچونگڑوں کے آگے سنسکرت ڈکشنریاں رکھ دیں اور کہہ دیا کہ اپنی لیاقت کے موافق ان لفظوں کے مادّے نکالتے چلے جاؤ۔ اس جگہ ہمیں صرف مادہ پر اعتراض ہے۔ ورنہ لفظ سونٹ بمعنی خاموشی تو فوربس، شیکسپیئر نے بھی حسب عادت پوری بھاکا کے موافق لکھ دیا ہے۔''

مولوی سید احمد صاحب کے اقتباس میں یہ بات واضح ہے کہ ان کے خیال میں

فیلن نے دو الگ الگ لفظ سونٹھ اور سونْٹھ لکھے ہیں۔ایک ب کے معنی قیمتی نادر بیش بہا چیز کے اور دوسرے کے معنی خاموشی کے ہیں اور خاموشی کے معنی والا لفظ بقول سید صاحب کے فیلن نے شونیہ سے ماخوذ بتایا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ فیلن کے ہاں کیا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر فیلن کا ۱۸۷۹ء[۲] کا ایڈیشن ہے۔اس میں صفحہ ۷۹۷ پر سونٹھ کا لفظ دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ س ون ٹھ سے لکھا ہے۔سید احمد صاحب نے جو نون کی قلب مکانی لکھی ہے وہ نہیں پائی جاتی[۳]۔یعنی دونوں جگہ نون واو کے بعد ہے واؤ سے پہلے ایک جگہ بھی نہیں۔البتہ دیوناگری میں ایک لفظ میں نون غنہ کا نقطہ لگنے سے رہ گیا ہے مگر رومن حروف کے تلفظ میں بھی غلطی ہے یعنی N [این] تو دونوں لفظوں میں ٹھ سے پہلے ہی ہے لیکن دوسرے لفظ میں th کی جگہ th چھپ گیا ہے۔ جس کا تلفظ ایک جگہ ٹھ اور دوسری جگہ تھ ہوگا۔بہرحال اگر سید احمد صاحب کے پیش نظر کوئی اور اشاعت نہیں تو ایک تو یہ طباعت کی غلطی گرفت سے رہ گئی اور دوسرے سونْٹھ اور سونٹھ والی بات درست نہ رہی۔

فیلن کی ڈکشنری میں پہلے اُردو ٹائپ میں لفظ ہے۔اس کے بعد دیوناگری میں وہی لفظ ہے پھر رومن حروف میں اس کا تلفظ ہے۔اس لیے لفظ کے تلفظ کا تعین تین زبانوں میں ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ فیلن کے ہاں سونْٹھ کا لفظ نہیں ہے اور سونٹھ کا لفظ ہی دو معنوں میں دو جگہ اس نے دیا ہے البتہ مولوی سید احمد صاحب کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ اس نے خاموشی اور چپ کے معنی میں سونٹھ کا مادہ سنسکرت شونیہ سے بتایا ہے۔[۴]

سونٹھیا صرّاف [ر مشدد]

مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں:

”بڑا بھاری مہاجن، قابلِ اعتبار اور ساکھ والا ساہوکار، طنزاً غیر معتبر

اور بد دیانت کو بھی کہتے ہیں۔ جس طرح فیلن صاحب نے وہاں قیمتی کے معنی میں لفظ سنوٹھ دیا تھا (ہم یہ بتا چکے ہیں کہ فیلن نے سنوٹھ ایک جگہ بھی نہیں دیا۔ قادری) اسی طرح یہاں سونے کے معنی لے کر سونا بیچنے والا اصراف قرار دیا ہے۔ چوں کہ سونٹھ کے معنی نہ سونے کے ہیں نہ بیش قیمت چیز کے۔ اس وجہ سے ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ محض گھڑت ہے اصل میں اس جگہ بھی سونٹھ ہی ہے کیوں کہ سونٹھ کرانہ کی چیزوں میں مہنگی اور گنواروں کے نزدیک ایک نادر اور بیش قیمت چیز ہے۔ اس وجہ سے وہ سونٹھ کے بیوپاری کو ابتدا میں بڑا بھاری بیوپاری مانا کرتے تھے۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں ہم لفظ سونٹھ میں بہت کچھ لکھ آتے ہیں چنانچہ مشہور ہے۔ ''ایسی کیا تم نے میرے ہاتھ سونٹھ بیچی ہے۔'' یعنی ایسی کون سی بیش قیمت چیز فروخت کی ہے کہ جس کے دام ادا کرنے ضروری اور لازمی ہیں۔ اس کی اصل سنوٹیا بمعنی سونا قرار دی ہے وہ بھی تکلف اور بناوٹ سے خالی نہیں۔''

فیلن نے سنوٹیا نہیں دیا۔ اس نے رومن حروف میں sanoth سنوٹھ لکھا ہے۔[۵] اصل لغت کے الفاظ وہی سونٹھ دو جگہ لکھے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ہم نے تشریح کر دی ہے۔

☆......☆

حواشی:

۱۔ یہاں بھی فرہنگِ آصفیہ کے متن اور اس عبارت میں چند الفاظ کا فرق ہے۔

۲۔ قادری صاحب نے ۱۸۷۹ء کو سہواً ۱۷۸۹ء لکھا تھا۔

۳۔ قادری صاحب کی رائے درست ہے۔ فیلن نے سنوٹھ نہیں لکھا۔

۴۔ سَونٹھ اور سونٹھ: حقیقت یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ الفاظ ہیں اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ فیلن نے سونٹھ کا لفظ دو معنوں میں دو جگہ دیا ہے۔ پہلا لفظ اس نے سونٹھ (بواوِ مجہول) درج کیا ہے اور اس کے معنی ''خاموش'' لکھے ہیں۔ اس کی مثالیں بھی دی ہیں، مثلاً ''تم تو سونٹھ ہو رہے''۔ اور ''تم ایسے سونٹھ کے لڈو کھا کے بیٹھے کہ جواب بھی نہیں بھیجا''۔ فیلن کے مطابق اس کی اصل سنسکرت ہے۔ البتہ فیلن نے اس کے دو اور تلفظ بھی دیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس کا دیہاتی تلفظ سَونٹھ (بواوِ لین) ہے اور اس کا ایک اور تلفظ سُونٹ (بواو معروف اور ''ٹ''، نہ کہ ''ٹھ'') بھی دیا ہے۔ جبکہ اس نے دوسرا لفظ بھی سونٹھ بواوِ مجہول ہی لکھا ہے لیکن اس کے معنی لکھے ہیں: dry ginger یعنی سوکھی ادرک۔ لغت نویسی کے اصولوں کے مطابق لفظ کی اصل/اشتقاق الگ ہو تو اسے ایک الگ لفظ مانا جاتا ہے اور اگر دونوں کا تلفظ اور املا یکساں ہو تب بھی اسے الگ الگ اندراج کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور فیلن نے یہی کیا ہے لیکن اُردو لغت بورڈ نے فیلن کی بجائے فرہنگِ آصفیہ کا اتباع کیا ہے اور سونٹھ (خاموشی) کو بھی اسی لفظ سونٹھ (بمعنی ادرک) کے ذیل میں درج کر دیا ہے جو غلط ہے۔

۵۔ سنوٹیا کے ضمن میں قادری صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ فیلن نے اس کا اندراج نہیں کیا البتہ فیلن نے sanoth یا سنوٹھ بھی الگ سے درج نہیں کیا جیسا کہ انھوں نے خود ''سونٹھ'' کی بحث میں لکھا ہے۔ لیکن لفظ سونٹھ (بواوِ مجہول) کے پہلے معنی (یعنی سوکھی ادرک) کے بعد اس کے دوسرے معنی فیلن نے ''قیمتی چیز'' لکھے ہیں اور تیسرے معنی بھی دیے ہیں (اور وہ ہیں کنجوس)۔ اس لفظ کے دوسرے معنی یعنی قیمتی چیز کے ساتھ اس نے لکھا ہے کہ یہ ''سَنوٹھ'' (sanoth) (س مفتوح، ن واوِ مجہول) یعنی ''سونے کا بنا ہوا'' کی تخریب ہے۔ لہٰذا قادری صاحب کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ اس نے سنوٹھ رومن حروف میں دیا ہے لیکن اس کا الگ سے اندراج فیلن کی لغت میں نہیں ہے۔

☆......☆

(۶۴)

سِیتا پھل [یائے معروف]

مسلمانوں میں اس پھل کو شریفہ کہتے ہیں۔ بعض علاقوں میں سیتا پھل بھی کہلاتا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک عمدہ خوش ذائقہ پھل کا نام جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ جب راجا رام چندر جی اور سیتا جی امرت سر کے علاقے سے گزرے تو وہاں ایک تالاب پر شریفے کے بہت سے درخت کھڑے تھے۔ سیتا جی کی فرمائش سے وہ پھل توڑ کر ان کو دیا گیا۔ جس کی وجہ سے یہ نام پڑ گیا۔ مگر ہماری ذاتی تحقیق جو سفرِ دکن اور سیرِ وارنگل سے حاصل ہوئی یہ ہے کہ جب راجہ رام چندر ملکِ تلنگانہ میں پہنچے اور یہاں کے سرسبز جنگل میں جہاں دس ہزار تالابوں میں سے چھے ہزار اِس وقت تک صحیح سالم موجود ہیں اور شریفے کے درخت بکثرت وخوش ذائقہ پائے جاتے ہیں، تو وہاں سیتا جی نے یہ پھل پسند فرمائے اور رام چندر جی نے ایک اور پھل جو اسی قسم کا مگر ذائقہ میں ذرا اترا ہوا اور ترشی مائل برنگِ سرخ ہے، اپنے لیے انتخاب کیا۔ جس کا نام رام پھل رکھا گیا۔ ہم (مولوی سید احمد صاحب) نے اس کو کھایا اور خوب غور سے دیکھا۔ شریفے سے بڑا سرخ اور لمبوترا ہوتا ہے۔ وضع ہو بہو ویسی ہی ہے۔ مقام جڑ کل جہاں رام چندر جی نے ہرن کے شکار

کے واسطے گھٹنا ٹیک کر تیر چلایا تھا، اسی جگہ آمیر کے اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک چٹان دس فٹ اونچی دوڈھائی سوفٹ چوڑی موجود ہے۔ اس پر رام چندر جی کے گھٹنے کا نشان بنا ہوا ہے۔ راون سیتا جی کو یہیں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ہنومان اسی جگہ کے راجا کا سپہ سالار تھا۔ ہنم کنڈہ میں اس کے نام کا ایک بہت پرانا خوشنما سیاہ پتھر کا مندر بنا ہوا ہے۔ ہنومان کا گھر اسی جگہ تھا۔ اس کی قوم کو لوگ اب تک موجود ہیں۔ ان کے رنگ سیاہ اور چہرے لمبوترے ہیں۔ یہ مقام نہایت ہی پُر فضا اور صحت افزا ہے۔''

شہد لگا کے الگ ہو جانا

جھگڑے کی کوئی بات کر کے خود چپکے سے الگ ہو جانا۔ جیسے کہتے ہیں بُھس میں چنگاری ڈالنا۔ یعنی ایک ذرا سی چنگاری بھس کے ڈھیر میں ڈال دی اور چل دیے۔ وہ اپنے آپ آہستہ آہستہ سلگتی رہے گی۔

مولوی سید احمد صاحب نے لکھا ہے:

''لڑائی کی بات نکال کے آپ جدا ہو جانا۔ اصل میں یہ اس قصے کی طرف تلمیح ہے جو اس طرح پر مشہور ہے کہ کسی شخص کو شیطان نہایت مُقطع صورت ثقہ لباس پہنے ہوئے ملا۔ اس نے کہا کہ یار تیری صورت تو ایسی پاکیزہ اور متبرک ہے پھر تجھے لوگ کیوں بُرا کہتے ہیں۔ شیطان نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ یہ ان کی ہٹ دھرمی اور بے انصافی ہے۔ تم ذرا میرے ساتھ چلو اور دیکھو کہ میں بالکل علیحدہ ہوں گا اور لوگ مجھ پر ناحق لعنت و ملامت کریں گے۔ میرا جو نام نکل گیا ہے تو وہی مثل ہوگئی کہ شہر میں اونٹ بدنام۔

دشمن سوئے نہ سونے دے۔

کسی کا جرم کسی کی خطا کسی کا قصور
مجھے ہمیشہ ملے کیوں سزا سنو تو سہی

(نامعلوم)

غرض دونوں مل کے بازار گئے۔ شیطان نے دیکھا کہ ایک شہد فروش کڑھاؤ میں شہد بھرے ہوئے چھان چھان کر مرتبانوں اور بڑی بڑی اچاریوں[1] میں بھر رہا ہے۔ اس نے ذرا سا اٹھا کر دکان کے کواڑ پر لگا دیا۔ جس سے ہزاروں مکھیاں جمع ہو گئیں اور وہ شہد چپک کر مکھیوں کا چھتہ نظر آنے لگا۔ مکھیوں کا گُچھا دیکھ کر چھپکلی لپکی اور چھپکلی کے خیال سے بلّی دوڑی۔ بلّی پر ایک سپاہی کا کتا جو بازار میں اپنے آقا کے ساتھ جا رہا تھا، جھپٹا۔ بلی اور کتا دونوں لڑتے ہوئے شہد کے کڑھاؤ میں جا پڑے۔ شہد فروش نے جھلا کر کتے کی پیٹھ پر ایسی لاٹھی ماری کہ اس کا دھڑ ٹوٹ گیا۔ سپاہی کو یہ بات دیکھ کر غصہ آیا۔ اس نے شہد فروش کا سر پھوڑ ڈالا۔ پولیس نے دونوں کو گرفتار کر لیا۔ لوگوں کا جمگھٹا ہو گیا اور سب کہنے لگے کہ دیکھو شیطان کو آتے دیر نہیں لگتی۔ کیا تو ذرا سی بات تھی اور کہاں تک نوبت پہنچی۔ اس پر شیطان نے کہا کہ بھلا میرا کیا قصور تھا۔ چھپکلی کو میں بلا کر نہیں لایا۔ کتے کو میں نے نہیں جھپٹایا بلی میری خالہ نہیں تھی۔ پھر مجھ پر کیوں گالیاں پڑیں۔ اس پر اُس آدمی نے جواب دیا کہ یار شہد لگا کر تو تم ہی الگ ہو گئے تھے۔ شیطان بولا کہ آپ کا بھی انصاف دیکھ لیا۔ بس اس بات سے یہ محاورہ ایجاد ہو گیا۔"

قاضی قُدوہ [ق مضموم، د ساکن، و مفتوح]

کثیر الاولاد کو کہتے ہیں۔ اس کے ضمن میں مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے لکھا ہے کہ:

''ایک کثیر الاولاد قاضی کا نام جس کی نسبت روایت کرتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش میں حضرت آدم کے بعد ان سے مخلوق بڑھی۔ چنانچہ روبک صاحب کہتے ہیں کہ ان کی بیوی ایک مرتبہ میں ستر ستر بچے جنتی تھی۔ ہمارے دوست مولوی نجم الدین صاحب فرماتے ہیں کہ قاضی قدوہ ایک بزرگ دسویں صدی ہجری میں صوبۂ اودھ میں تھے جن کے ستر بیٹے تھے۔ بادشاہ نے کثیر الاولاد سمجھ کر ہر ایک بچے کے لیے ایک ایک گاؤں مرحمت فرمایا۔ یعنی ستر گاؤں کی جاگیر عطا کی۔ چنانچہ آج تک ان کی اولاد اس جاگیر سے ملک اودھ میں فائدہ اٹھا رہی ہے اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے۔ مگر جہاں مولوی صاحب نے کہاوت کے موقع پر ان کی ضرب المثل کا موقعِ استعمال لکھا ہے۔ اس میں مغالطہ ہوا ہے کیوں کہ وہ لکھتے ہیں: ''آدھے قاضی قدوہ آدھے باوا آدم اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو اپنے آپ کو مثل حضرت آدم اور قاضی قدوہ سے اعلیٰ و افضل سمجھے۔'' لیکن یہ امر موقع اور نفسِ عبارت کے بالکل برخلاف ہے۔ البتہ کثیر الاولاد کی نسبت کہتے ہیں کہ آپ بھی اپنے وقت کے قاضی قدوہ ہیں یعنی اپنی اولاد سے گاؤں بسا سکتے ہیں۔ ہمارے نئے محاورہ نگار بلکہ معانی تراش نے ایک قوم کا دل دُکھانے کے واسطے یہاں بھی وار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''طنزاً سُوری [سؤریا] یا بارہ بچوں والی۔'' ہم حیران ہیں کہ جس

صورت میں مسلمان اس نام تک سے پرہیز کرتے ہیں وہ کیوں کر طنزاً ہی سہی کسی مسلمان کو سُؤری کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ محاورہ بولا تو جاتا ہے مرد کی نسبت انھوں نے سُؤری کس قاعدے سے لکھ دیا۔ یہ مانا کہ کثیر الاولاد عورت کو ان کی تحقیق کے موافق کسی قوم میں سُؤری کہہ دیتے ہوں مگر مرد سے کیوں کر مراد لے لی۔ اس کے علاوہ آپ نے اس کا تلفظ بھی غلط لکھا ہے۔ کیوں کہ یہ لفظ قُذ وہ یا قِذ وہ دو طرح پر آیا ہے۔"

☆......☆

حاشیہ

ا۔ اَچاری: اچار رکھنے کا برتن۔ مرتبان کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

☆......☆

(۶۵)

عرب سرائے [ع مفتوح، ر مفتوح]

دہلی کے ایک مشہور علاقے کا نام ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف مولوی سید احمد صاحب مشہور زبان داں عالم اور لغت نویس گزرے ہیں۔ وہ عرب سرائے کے رہنے والے تھے۔ مولوی صاحب نے خود اس کا مختصر حال اس طرح لکھا ہے:

''یہ ایک تین دروازے کی چھوٹی سی بستی شاہجہاں آباد عرف دہلی سے تین میل کے فاصلے پر جانب جنوب موضع غیاث پور میں مقبرہ ہمایوں کے متصل اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہ العزیز کے قریب واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاء اکثر اس سرزمین پر تشریف لا کر بیٹھا کرتے اور فرمایا کرتے کہ مجھے اس سرزمین سے کمال انسیت ہے کیوں کہ یہاں سے مجھے بوے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آتی ہے۔

یہ بستی جلوسِ اکبری ۱۴ مطابق ۹۶۹ ہجری قدسی میں نواب حاجی بیگم صاحبہ ہمایوں بادشاہ کی بیوی نے حج سے آنے کے بعد بسائی تھی۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب نواب حاجی بیگم صاحبہ مکہ معظمہ کے حج کو تشریف لے گئیں تو وہاں سے انھوں نے ایک ایسا تحفہ لانا چاہا جس سے تمام ہندوستان میں بزرگی اور قیام کے ساتھ ان کا نام یادگار رہے۔ چنانچہ انھوں نے وہاں کے علماء فضلاء کی رائے سے

نہایت نجیب الطرفین عرب جو حضرموت اور خاص بیت اللہ کے رہنے والے عابد زاہد اور فاضل تھے، مع شجرہ شرافت مختلف قبیلوں سے اسی (۸۰) مرد بہم پہنچائے۔ ان میں بافقیہ، باحسن، باجود، سقاف، باطہ، باکثیر وغیرہ اور ان کے خدمتی لوگ تھے۔ حاکمِ عرب کی اجازت سے ان کو یہاں لائیں اور موضع غیاث پور میں انھی کے نام پر ایک گاؤں بسا کر عرب سرائے کے نام سے نامزد کیا۔ ان لوگوں نے یہاں آ کر اس بستی کو نمونہ عرب بنا دیا۔ جابجا عربی کھجور کے درخت، عرب کا ملوکیا ساگ لگایا۔ قہوہ اور صلوٰۃ کو رواج دیا۔ صبح نماز میں صلوٰۃ کا پڑھنا، مردے کے ساتھ صلوٰۃ پڑھتے ہوئے بطریقِ عرب جانا، عجیب کیفیت اور لطف دکھاتا تھا۔ ان لوگوں کی شادیاں گو ہندوستان میں ہوئیں مگر رسمیں تمام عربی ہی قائم رہیں۔ شاہی خزانے سے ان کی تنخواہیں مقرر ہوئیں جو سلطنتِ مغلیہ کے آخر تک کچھ نہ کچھ قائم رہیں۔ اس کے بعد جب ۹۶۹ ہجری میں پندرہ لاکھ روپے کے صَرف سے سولہ برس کے عرصہ میں مقبرۂ ہمایوں جو خاص اس بستی کی وجہ سے وہاں بنایا گیا تھا، تیار ہوا۔ بادشاہ کی قبر پر جا کر ان کی ارواح کو ثواب پہنچانا اور نگرانی رکھنا بھی انھی لوگوں کے سپرد ہوا۔ ان لوگوں کے پاس خاص وہی شجرہ جو عرب سے مواہیر ثبت ہو کر آیا تھا اب تک موجود ہے۔ اگرچہ کرم خوردہ ہو گیا ہے۔ مگر پڑھا صاف جاتا ہے اور وہ اب حاجی الحرمین شریفین جناب مولوی سید عبداللہ صاحب بالفقیہہ سرشتہ دار کوہ شملہ کے پاس تبرکاً رکھا ہے جسے دیکھ کر اکثر لوگ ان لوگوں کی شرافت اور حسب نسب کی تعریف کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح بندۂ مؤلف (سید احمد) کے سگے ماموں

خُلقِ محمدیؐ میں ڈوبے ہوئے درویش صفت بلکہ اپنے وقت کے حاتم
ہیں۔ ہندوستان سے لے کر عرب اور ایران بلکہ قسطنطنیہ تک لوگ
ان کو جانتے ہیں۔افسوس ہے کہ عرب سرائے میں ان کے بعد کوئی
شخص صنادید عرب کا دکھانے والا ہندوستان اور علی الخصوص عرب
سرائے میں نہ رہے گا۔"

غارَت غول [ر مفتوح، واولین]

خانہ خراب، تباہ و برباد شدہ، ضائع، گم وغیرہ۔ مولوی سید احمد صاحب نے یہ مثال دے کر تفصیل لکھی ہے:

"بہائے آنسوؤں کے غول گرداب
یہ چشمِ تر ہے غارت غول گرداب

یہ لفظ اصل میں غارت غور ہے۔ جس طرح "ترکتاز" [نے]،
تاخت و تاراجِ ترکاں کے سبب فارس میں بمعنی غارت گری رواج
پایا۔اسی طرح یہ محاورہ غوری خاندان کی غارت گری کے سبب ہند
میں مروج ہوا۔ چوں کہ سلطان شہاب الدین عرف محمد غوری نے
اپنے قوی ہیکل افغانوں کو لے لے کر ہند اور غزنی کو بار بار تاخت و
تاراج کیا۔ اس سبب سے گیارھویں صدی عیسوی سے یہ محاورہ
زبان زدِ خلائق ہو گیا اور سب سے زیادہ عورتوں میں جو لوٹ مار کے
نام سے کانپتی ہیں، اس لفظ نے دخل پایا۔ رفتہ رفتہ حسبِ قاعدہ
رائے مہملہ [ر] کا لام [ل] سے بدل ہو کر غارت غور سے غارت
غول ہو گیا۔ چنانچہ شعرا نے دونوں طرح استعمال کیا ہے۔ ایک
مثال [اوپر] گزر چکی ہے دوسری حکیم مولا بخش قلق شاگردِ رشید حکیم

مومن خاں دہلوی کے دیوان سے یہاں لکھی جاتی ہے:

ہوئے ہیں نالہ و فریاد تک بھی غارت غور
لٹا ہے منزلِ الفت میں کارواں کیسا

شیشے میں اُتارنا [یائے معروف، الف مضموم]

یہ عام محاورہ ہے۔ [معنی ہیں:] کسی کو رام کر لینا، راضی کرنا، بالکل اپنی مرضی کے مطابق تابع بنا لینا۔ یہ لفظ شیشہ بمعنی آئینہ نہیں بلکہ بمعنی بوتل ہے۔ انگریزی اور انگریزوں کے عمل دخل سے پہلے عام استعمال میں تھا۔ اب صرف شاعری میں باقی رہ گیا۔ البتہ اس کا اسم تصغیر چھوٹی بوتل کے لیے شیشی اب تک رائج عام ہے۔ تو شیشے میں اتارنے کے معنی ہیں بوتل میں بند کرنا، جیسے بھوت، جن، ارواح کو بند کرتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں:

> سیانوں کا دستور ہے کہ جب وہ کسی آدمی کے اوپر سے بھوت پریت یا جن وغیرہ کو اتارتے ہیں تو ایک شیشہ منھ کھول کر رکھ لیتے ہیں اور اس میں کو[ئی] عمل یا منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں جس کے سبب سے ان کے خیالات کے موافق وہ بھوت بشکلِ دُخان آ جاتا ہے اور پھر اس کا منھ بند کر کے دفن کر دیتے ہیں۔ چوں کہ بوتل میں آ جانے سے بھوت قابو میں آ جاتا ہے۔ اس سبب سے یہ لفظ [کذا: محاورہ] قابو میں لانا، بس میں کرنا، قبضے میں کر لینا، تسخیر کرنا، فریفتہ بنانا، اپنی طرف رجوع کرنا وغیرہ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے۔

کون سی رات وہ آئی کہ تصوّر سے ترے
شیشۂ دل میں پری کو میں اتارا نہ کیا
(مصحفی)

باتیں اس آئینہ رُو کی بھی ہیں گویا کہ طلسم
آج تو خوب ہی شیشے میں اُتارا ہم کو
(داغ)

(٦٦)

دعوتِ شیراز [کسرۂ اضافت ت، یائے معروف]

بعض لوگوں کو سنا ہے کہ عمدہ، پرتکلف ضیافت کو دعوتِ شیراز کہتے ہیں۔ جہاں بہت زیادہ اہتمام ہو اور انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات ہوں تو کہتے ہیں کہ واہ کیا دعوتِ شیراز ہے۔ مگر اس موقع پر یہ غلط ہے۔ دعوتِ شیراز اس کے بالکل برعکس بے تکلف اور سادہ طعام کو کہتے ہیں۔

اس کے متعلق ایک حکایت مشہور ہے۔ شیخ سعدی بطور سیاحت نکلے اور کسی جگہ اپنے ایک شناسا کے ہاں پہنچے۔ دوست نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور اعلیٰ درجے کا مرغن طعام مہیا کیا۔ شیخ سعدی نے کھانے کے بعد اس کی تعریف کی مگر کہا کہ ہائے دعوتِ شیراز۔ دوست کو ذرا خفت ہوئی۔ خیال کیا کہ شاید کچھ کسر رہ گئی۔ جو شیخ نے ایسا کہا۔ دوسرے دن اس سے زیادہ اہتمام کیا اور بہتر درجے کے کھانے تیار کرائے۔ شیخ نے کھانے بعد پھر زیادہ تعریف کی اور تعریف کر کے کہا مگر واہ دعوتِ شیراز۔ دوست حیران ہوا۔ مگر تیسرے دن اس سے جو بھی بہترین لوازماتِ طعام ہو سکتے تھے مہیا کیے اور مطمئن ہوا کہ اب تو شیخ کو دعوتِ شیراز یاد نہ آئے گی۔ شیخ نے کھانے بعد خوب خوب تعریف کی۔ شکریہ ادا کیا۔ مگر پھر کہا کہ واہ دعوتِ شیراز۔ اس کے بعد میزبان سے رخصت چاہی اور چلتے وقت بڑا اصرار کیا کہ کبھی ہمارے ہاں شیراز بھی آؤ اور ضرور ہمیں شرفِ میزبانی سے ممتاز کرو۔ دوست نے وعدہ کر لیا کہ اگر ادھر جانے کا اتفاق ہوا تو ضرور شیخ کی زیارت کو حاضر ہوگا۔

ایک تو اس نے شیخ سے وعدہ کیا تھا دوسرے اس کا بھی اشتیاق تھا کہ دیکھیں آخر

یہ شیراز والے کس طرح کی ضیافت کرتے ہیں۔تھوڑے دن بعد ہی اس کو شیراز جانے کا اتفاق ہوا۔شیخ کے ہاں پہنچا، شیخ اپنے دوست کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ ٹھہرایا۔کھانے کا وقت آیا تو کھانا پیش کیا۔

دوست نے دیکھا تو حیران ہوا۔معمولی سادہ گھر کا سا کھانا تھا۔اس نے اپنے جی میں خیال کیا شاید چوں کہ بے اطلاع آ پہنچا ہوں اس لیے گھر والوں کو خاص اہتمام کا موقع نہیں ملا۔دوسری بار بڑے اشتیاق سے منتظر رہا مگر کھانا بالکل وہی سادہ جیسے عام طور پر گھر والے کھاتے ہیں۔مہمان دیکھ کر چپ رہا اور سمجھا کہ شاید کچھ خاص وجہ ہو اور عمدہ پر تکلف ضیافت میں وقت درکار ہو۔خیر تیسرے دن پھر وہی خلوص اور محبت تو بے انتہا مگر کھانا وہی روزمرہ کا گھر جیسا معمولی۔تیسرے دن دوست نے شیخ سے اجازت چاہی اور چلتے وقت دریافت کیا کہ ایک بات اور بتا دیجیے کہ میں نے اتنا اتنا تکلف اور ایسا ایسا اہتمام کھانے میں کیا مگر آپ ہر بار دعوتِ شیراز کو ہی یاد کرتے تھے۔میں سمجھتا تھا کہ خدا جانے دعوتِ شیراز میں کیسا کچھ اہتمام ہوتا ہوگا۔مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا بالکل گھر کا سامان تھا۔

شیخ نے کہا بھائی میں تمھارے ہاں تین دن رہا اور ہر روز تم ایک سے ایک زیادہ عمدہ مرغن اور بڑھیا کھانے پکاتے رہے۔اگر ایک دو دن زیادہ میں رک جاتا تو تم عاجز آ جاتے اور دل میں دعائیں مانگتے کہ کسی طرح سے دفعان ہو۔مہمان ہے کہ بلائے جان۔

تم میرے ہاں تین دن رہے میں نے اپنے گھر والوں کی طرح تمھیں سمجھا اور ہم سب گھر والے جیسے رہتے ہیں اور جو کھاتے ہیں بس اسی طرح تم سے سلوک کیا۔تم تین دن کیا اگر تین مہینے بھی ہمارے ہاں رہو تو ہمیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔بس یہ ہے دعوتِ شیراز۔

صَلاے سَمَرقَندی [ص مفتوح، س مفتوح، م مفتوح، ق مفتوح]

بعض جگہ اس لفظ کو حاے حطی سے صلاحِ سمرقندی بھی لکھا گیا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''رسالہ مزیل الاغلاط میں لکھا ہے کہ صلاح سمرقندی غلط العوام ہے۔ صحیح صلاے سمرقندی ہے۔ کیوں کہ اہلِ سمرقند[۰ ۰][1] کھانے پر عام تواضع کرتے اور سب کو کھانا کھانے کے لیے کہتے ہیں۔ کجا کہ ان کے پاس بہت سا کھانا ہو اور پھر باز رہیں۔ لیکن خانِ آرزو کی رائے ہے کہ صلاے دروغ یا طلبِ سرسری سے مراد ہے۔ جو تہِ دل سے نہ ہو۔ یعنی صرف منہ جھٹلانے کے واسطے ہو۔ چنانچہ آج کل اردو اور فارسی اشعار میں صلاے سمرقندی ایسے ہی معنی میں پایا جاتا ہے۔ خان آرزو کی رائے میں اہل سمرقند میں ظاہری خلق اور منہ دیکھے کی محبت بہت ہے۔ مگر دل سے ایسی ہے جیسے آج کل اہلِ دہلی کا وتیرہ ہو گیا ہے۔ بعض شعرائے فارس جیسے اسیری لاہجی کے اشعار سے صلاح حاے حطی سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اسیری کا شعر صلاح [کے معنی] نمبر ۵ میں لکھا ہے۔

مرزا حسین شریف صاحب طہرانی جو اس وقت میرے پاس تشریف لائے فرماتے ہیں کہ ایران میں اخیر ہی معنی میں صلائے سمرقندی و خوش باش سمرقندی بولتے ہیں باقی بناوٹ ہے۔''

مولوی سید احمد صاحب نے صلاح کے نمبر ۵ میں اسیری کا یہ شعر دیا ہے۔

۵۔ تواضع طعام، کھانا کھلانے کی التجا۔ اگرچہ اس معنی میں صلا ٹھیک ہے مگر اسیری کے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ صلاح بھی اس معنی میں درست ہے کیوں کہ اس نے صلا

زدن کی جگہ صلاح گفتن فلاح اور نجاح کے قافیے کے ساتھ باندھا ہے۔

ساقیِ ما از کرم میخانہ را در باز کرد
جامِ مے بر کف گرفت و گفت رنداں را صلاح

☆......☆

حاشیہ

ا۔ یہاں سے قادری صاحب نے کچھ عبارت حذف کر دی ہے جو فرہنگِ آصفیہ میں موجود ہے۔ وضاحتاً حذف کی علامت (تین نقطے) لگائی گئی۔

☆......☆

(۶۷)

سَیف زَباں [یائے لین، ز مفتوح]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

تیز زباں، وہ شخص جس کے کلام میں اثر اور بات میں تاثیر ہو، اعلیٰ درجے کا شاعر، سخن داں، سخن گو، منہ پھٹ، دریدہ دہن:

دنبالے سے سرمے کے دھواں ہیں تری آنکھیں
کہہ بیٹھیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں
(ذوق)

مولوی سید احمد صاحب کی اس تشریح سے سیف زباں کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوا۔ اللہ کے درویشوں، قلندروں اور مقربانِ بارگاہِ الٰہی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زبان سے جو نکل جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتے ہیں۔ ایسے حضرت صاحبانِ حال ہوتے ہیں اور ان پر احوال کا غلبہ ہوتا ہے۔ بیشتر وقت مستغرق رہتے ہیں۔ اس حالت استغراق اور احوالِ قلبی میں محویت کے عالم میں جو بھی ان کے منہ سے نکل جاتا ہے وہ پورا ہو کے رہتا ہے۔ گویا تلوار کی سی کاٹ رکھنے والا۔ عام طور پر ایسے فقرا، اور درویشوں سے لوگ احتراز کرتے ہیں اور دور رہتے ہیں کہ خدا معلوم ہے منہ سے کیا اچھا برا نکل جائے اور وہ پورا ہو کر رہے۔ کسی کا شعر ہے:

اس مردِ قلندر سے بچو سیف زباں ہے
لڑتے ہوئے بے تیغ و سپر دیکھ رہا ہوں

سیف توپٹ پڑی تھی مگر نیچہ کاٹ کر گیا

سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

"کہاوت۔یعنی جس پر بھروسا تھا وہ تو کام نہ آیا مگر ایک ادنی شخص سے کام نکل گیا۔اس کی ابتدا یوں ہے کہ ایک مرتبہ نواب سیف اللہ خاں ہاتھی پر سوار تھے۔بیٹا پاس بیٹھا تھا۔کسی آزاد فقیر نے سوال کیا کہ او بابو سیفو کوئی چِنّا دلوا۔نواب صاحب نے منھ پھیر لیا۔مگر لڑکے نے ایک اشرفی جیب سے نکال کر ہاتھ پر رکھ دی۔اس پر فقیر نے خوش ہو کر کہا: "سیف تو پٹ پڑی مگر نیچہ کاٹ کر گیا۔"

سیکھ [یائے معروف]

سیکھ کے معنی ہیں نصیحت کرنا، پند کرنا، تدبیر بتانا، صلاح مشورہ دینا۔اسی سے ہے سیکھ دینا یعنی نصیحت کرنا وغیرہ۔

سیکھ وا کو[1] دیجیے جا کو[2] سیکھ سُہائے
سیکھ نہ دیجیے باندرا جو گھر بیئے کا جائے

یعنی نصیحت اس کو کرو جسے نصیحت نفع پہنچائے۔بندر کو نصیحت مت کرو جو بیے کا گھونسلا اجاڑے۔

مولوی سید احمد صاحب لکھتے ہیں اس کا قصہ مختصر اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ بارش کے سبب بندر عاجز آ کر اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا۔آخر کو ایک کھجور پر چڑھ گیا جہاں بیا اپنے گھونسلے میں بیٹھا ہوا مینھ کی بہار لوٹ رہا تھا۔اس نے اُس سے بطور نصیحت کہا کہ یار تجھے خدا نے انسان کی سی صورت ہاتھ پاؤں سب کچھ دیے مگر تو نے اتنا سلیقہ بھی نہ کیا کہ آج بھیگنے سے بچ جاتا۔بندر ایک تو جلا ہوا تھا ہی اس سے اور بھی جھلّایا اور اس کا گھونسلا نوچ کر پھینک دیا اور کہا دیکھیں اب تو کیسے بھیگنے سے بچتا ہے۔پس بیے نے اس کے جواب میں یہ

دوہا پڑھا۔

سالِ فصلی [کسرۂ توصیفی ل، ف مفتوح، ص ساکن]

مسلمانوں کے خراج وصول کرنے کا سال۔ جس میں کوئی مہینا مقرر نہیں۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''یہ سال جلال الدین اکبر کے وقت سے جسے ۳۲۲ برس کا عرصہ ہوا قرار پایا ہے۔ سال فصلی دراصل سال شمسی کا وہ برس ہے جو فصل سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا نکاس ہجری قمری تاریخ سے ہوا ہے۔ جس کی مجملاً تفصیل یہ ہے کہ جس وقت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے دفتروں میں خراجِ ہند کے واسطے مرزایانِ فارس کے حساب کے بموجب طرزِ جدید قرار پائی تو حمیّتِ اسلام کے سبب سالِ سمبت کو جو ہندوستانی دفاتر میں قدیم الایام سے چلا آتا تھا، متعصبوں نے دور کر کے اس وقت کا سال ہجری مندرج کر دیا لیکن چوں کہ خراج وصول کرنے کا مدار فصول شمسیہ پر موقوف ہے۔ اس وجہ سے بہت سا فرق پڑنے لگا۔ پس بعض لوگوں کے قول کے بموجب دیوان ٹوڈرمل اور بعض کے کہنے کے موافق مرزایانِ فارس نے اس وقت جبکہ ۹۷۱ ہجری یعنی ۱۵۷۴ء تھے اور حسب اتفاق انھی دنوں میں آغازِ ہجری جو غُرّۂ محرم ہوا کرتا ہے ابتداے فصلِ خریف وقربِ زمانِ اعتدالِ لیل و نہار کے جو ہندی جوتش سے سُنبلہ کا گیارھواں درجہ ہے مطابق پڑا۔ لہٰذا اس وقت سے سنینِ ہجری کو جس قدر گذر گئے تھے فصلی قرار دے کر آغاز سال تحویلِ آفتاب بہ سُنبلہ سے جو تقریباً ابتدائے ماہِ کوار اور فصلِ خریف یعنی ساوَنی کے کٹنے کے زمانے کا آغاز ہوتا ہے، ٹھہرالیا۔

جب سال ہجری کا قمری سال خراج وصول کرنے کے دفتروں میں تعلقِ فصل کے سبب سالِ شمسی سے بدل گیا اور دیگر سالانہ مقدمات تاریخ ہجری کے بارہ قمری مہینوں کے موافق بدستورِ سابق ہوتے رہے تو دونوں تاریخوں کے دنوں کی تعداد کے مقابلے کے وقت دو برس آٹھ مہینے سولہ دن چار گھڑی کی مدت میں قمری مہینوں کا ایک مہینے سے زیادہ فرق جا پڑا۔ کیوں کہ سال شمسی تین سو پینسٹھ اور سوا دن کا ہوتا ہے۔ (۱/۴۔۳۶۵) اور سالِ قمری تین سو چوّن دن بائیس گھڑی کا (یہاں دن شب و روز کے مجموعہ یعنی ساٹھ گھڑی سے مراد ہے) پس اس سے معلوم ہوا کہ سال قمری سال شمسی سے دس دن ترپن گھڑی نو پَل چھوٹا ہوتا ہے اور سالِ شمسی سالِ قمری سے تقریباً سات گھڑی کم گیارہ روز ہوتا ہے۔ چنانچہ اہلِ ہند اسی ایک مہینے کی زیادتی کو لَوند کا مہینہ یعنی سالِ کبسیہ کہتے ہیں۔ غرض شمسی سو سال کے عرصے میں قمری حساب کے مطابق قریب قریب تین برس کچھ دن کا فرقِ جا پڑتا ہے۔ اس وقت ہماری تالیف لغات کے زمانے میں اور علی الخصوص اس لفظ سال فصلی کے لکھتے وقت فصلی سنہ ۱۲۹۳۔ ہجری ۱۳۰۳۔ عیسوی ۱۸۸۶۔ فقط سید احمد ۲۵ جون ۱۸۸۶ء مطابق ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۳ھ موافق ۹ اساڑھ فصلی ۱۲۹۳ مقابل اساڑھ بدی متی ۷ سمبت ۱۹۴۳ بکرماجیتی۔ مقام کوہ شملہ دارالخلافہ ہند یا تفرّج گاہِ حکامِ ہند۔"

☆ ☆

حواشی

۱۔ وا کو: اُس کو۔

۲۔ جا کو: جس کو۔

۳۔ سالِ کبیسہ یا لوند کا سال: انگریزی میں leap year کہتے ہیں۔

☆......☆

(۶۸)

سَڑَک [س مفتوح، ڑ مفتوح]

اردو کا لفظ ہے۔ عام طور پر اس کی اصل سنسکرت سے سمجھی جاتی ہے اور غالباً اسی بنا پر اس کو ان دیسی الفاظ میں شریک سمجھا جاتا ہے جس کے ساتھ فارسی اضافت کا استعمال ثقہ حضرات درست نہیں سمجھتے اور لبِ سڑک اگرچہ اس قدر عام، مقبول اور زبانوں پر رواں ہے کہ اس کا ترجمہ ''سڑک کے کنارے'' [اتنا] نہیں۔ لیکن زباں داں اب تک اس پر اعتراض کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ اعتراض ہمارے نزدیک وقیع نہیں۔ پرانے زباں داں بے شک ایسا کہتے تھے اور اپنے اصول میں سخت اور گرفت پر مستعد تھے لیکن ان کا رویہ ان کے ساتھ گیا۔ لبِ سڑک ہمارے نزدیک مستند اور فصیح ہے۔ اس کا ترجمہ سڑک کے کنارے نہ ہر وقت اور ہر جملے میں سلاست کے ساتھ استعمال ہو سکتا۔ [illegible] ترجیح حاصل ہے۔ ہم اس وقت ایک اور دلچسپ امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ [illegible] سڑک'' نہ تو سنسکرت ہے اور نہ کسی پراکرت سے ماخوذ ہے۔ پھر کیا ہے؟ اس کی تفصیل مولوی سید احمد صاحب سے سنیے:

> ''پہلے تو لوگ اس کی نسبت خیال کرتے رہے کہ یہ لفظ انگریزی ہو گا۔ مگر جب انگریزوں نے ہندوستانی ڈکشنریاں بنائیں تو انھوں نے ہندی قرار دیا۔ چنانچہ فیلن صاحب نے جن کی ڈکشنری سب سے اخیر بنی اس کا مادّہ یا ماخذ سنسکرت سرک (   ) قرار دیا۔ لیکن یہ ساری گھڑت ہے کیوں کہ ہم نے سنسکرت کی بڑی بڑی

مستند ڈکشنریاں جو انگریزوں نے بنائی تھیں یا کوش جو پنڈتوں نے
لکھے تھے دیکھ ڈالے۔ کہیں لفظ سرک اس معنی میں نہیں نکلا۔ ہاں
اس کا پتا چلا تو عربی سے صاف صاف چلا۔ اور اس میں کچھ ہیر پھیر
بھی نہیں کرنا پڑا۔ کیوں کہ عربی میں شَرَک بفتحتین، راہِ آشکارا اور
بزرگ کو کہتے ہیں۔ چوں کہ فنِ عمارات اور نقاشی یعنی انجینئری
میں عربی زبان کے بہت سے الفاظ ہند میں اسلامی سلطنت ہونے
کے باعث مستعمل ہو گئے ہیں۔ پس یہ بھی شاقول، فانہ وغیرہ کی
طرح زباں زدِ خلائق ہو گیا۔ شینِ معجمہ کے بجائے سینِ مہملہ اور
رائے مہملہ کی جگہ رائے ثقیلہ جس کا ہندی زبان کے موافق بولنا سہل
تھا استعمال کرنے لگے۔''

جانسن کی مشہور لغت میں جو لندن سے ۱۸۵۲ء میں شائع ہوئی ہے شَرَک کا لفظ ملتا ہے اور معنی دیے ہیں:

''ایک بڑی کھلی سڑک۔ سڑک کا بیچوں بیچ۔''

مدار الافاضل مشہور عالم اللہ داد سرہندی کی تالیف ہے جو علامہ ڈاکٹر محمد باقر نے عمدہ حواشی کے ساتھ لاہور سے شائع کر دی ہے۔ اس میں صفحہ ۵۵۸ پر ہے:

''شرک بفتحتین: دام – در شرحِ نصاب است و راہِ خورد – و در صحاح
است معظم الطریق و وسطہ – ''

جانسن نے غالباً مدار الافاضل سے استفادہ کیا ہے۔ یا صحاح سے۔ کیوں کہ انگریزی تشریح میں اس نے بڑی کشادہ سڑک لکھا ہے جو معظم الطریق کا لفظی ترجمہ ہے۔ اسی طرح دوسری تشریح اس نے ''سڑک کا عین وسط'' کی ہے۔ یہ بھی صحاح کے وسطہ کا ترجمہ ہے۔ اس لیے مولوی سید احمد صاحب دہلوی کا قیاس سڑک کے ماخذ کے بارے میں بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مشہور لغت نویس جان۔ ٹی۔ پلیٹس نے تو عجب عجب گل کھلائے ہیں۔ سڑک کے ماخذات انھوں نے دو تجویز کیے۔ ایک تو سنسکرت سرک سے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ راہ اور شارع عام کے معنی میں سنسکرت میں کوئی لفظ سرک نہیں۔ راجارا جیسو، راؤ ورما کی لغت کے مطابق سنسکرت میں سرک کے معنی ہیں پھولوں کی مالا۔ دوسرا مادہ پلیٹس نے نہایت دلچسپ تجویز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سڑک شاید سڑکنا سے ہو!!۔

سڑکنا یا سڑکانا یا سرکانا سے سڑک تجویز کرنا پلیٹس ہی کا کام ہے!۔

ایک اور دلچسپ اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ بھارت کی جدید مصطلحات میں روڈ کے واسطے سڑک کا لفظ بالکل اختیار نہیں کیا گیا بلکہ سڑک کے مقابلے میں سنسکرت الاصل لفظ مارگ کو ترجیح دی گئی ہے۔

پاکستان میں تو روڈ کا لفظ اس قدر عام ہے اور اس کا زور اس قدر بندھا ہے کہ بے سبب اور بے ضرورت روڈ کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن جدید بھارت میں ہر جگہ اور ہر موقع پر صرف مارگ استعمال کرتے ہیں نہ روڈ نہ سڑک۔

فارسی بگھارنا [ب مفتوح]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

"ایسی زبان بولنا جسے دوسرا نہ سمجھے۔ اس موقع پر ہمارے نئے محاورہ داں مخزن المحاورات کے جامع نے گلشنِ فیض کے سبب تو مثال میں اور اپنی علمیت کے سبب ایک معنی میں بڑا دھوکا کھایا۔[1] مثال کا دھوکا تو ہے جرأت کے شعر کی مثال جو دی گئی وہ صحیح نہیں۔ اس جگہ فارسی سے مراد ساکنانِ فارس صاف ظاہر ہے اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ زبان بولنا جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور مثال میں یہ شعر دیتے ہیں:

کیا جانیے کہ بولیں گے کیا واں کے فارسی
جرأت گئے جو شعر ترے اصفہان کو (جرأت)

ہم پوچھتے ہیں یہاں بولنے کا فاعل کون ہے؟ اہلِ فارس یا شعر؟ اگر اہلِ فارس ہیں تو پھر یہ مثال کاہے کی ہوئی اور جو شعر ہے تو شعروں کا بولنا آپ ہی سے سنا ہے۔ دوسرے کی نقل بے سمجھے کردینے سے ایسی ایسی قباحتیں پیش آتی ہیں۔ علمی غلطی یہ ہے کہ آپ اس محاورے کے معنی میں دو فقرے لکھتے ہیں اول فقرہ تو یہ ہے ''ایسی زبان بولنا جو دوسروں کی سمجھ میں نہ آئے۔'' اسے ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا دوسرا مترادف فقرہ یہ ہے کہ ''نافہمیدہ باتیں کرنا''۔ حضرت اس جگہ اس کے کیا معنی؟ اور کیا موقع ہے اور اگر اس کے معنی آپ نے یہ لیے ہیں کہ بے سمجھی باتیں کرنا تو فقرہ تو درست ہے مگر معنی غلط بلکہ محض غلط ہیں لیکن اس صورت میں بھی اس کو دوسرا نمبر دے کر یا معنی کا فرق دے کر لکھنا واجب تھا۔''

فارِغ خَطی [رکمسور، خ مفتوح]

حساب کتاب برابر ہونے کی تحریر، لا دعویٰ، محاسبے کے انفصال کی تحریر، آزادی کا پروانہ، اس سبب سے طلاق کو بھی کہتے ہیں۔

فارِغ خَطی لِکھوانا

دھمکی سے رسید لینا، زبردستی اقرار کرانا، مولوی سید احمد صاحب دہلوی فرہنگ آصفیہ میں لکھتے ہیں:

''اس معنی کی نسبت یہ قصہ مشہور ہے کہ کسی ساہوکار نے کسی بھلے مانس پر اس قدر سود چڑھا دیا تھا کہ اصل سے آٹھ گنا لے چکا مگر تقاضا برابر چلے جاتا تھا۔ ایک روز اس شخص نے کہا کہ آج آپ اپنی بہی لے کے آئیں اور حساب بے باق کر جائیں اور اُدھر تاشے

والوں کو بلا کر بٹھا دیا کہ جس وقت ہم کہیں بجانا شروع کر دینا۔ جب
لالہ صاحب آئے تو وہ ان کو مکان کے اندر لے گیا اور ہاتھ پاؤں
باندھ کر پیٹنا اور یہ کہنا شروع کیا کہ فارغ خطی لکھ۔ ادھر سے تاشے
والوں کو حکم دیا کہ تاشوں پر چوٹ پڑے۔ جب لالہ کی آواز بھی کوئی
نہ سن سکا تو مجبوراً بہی میں بھر پایا لکھ کر ایک رسید ان کو دے دی اور
اپنے گھر چلے آئے۔ اتفاق سے ایک روز کسی کی برات کا باجا بج رہا
تھا۔ لڑکے نے کہا لالہ ہمیں برات دکھالا۔ انھوں نے سادگی سے
اسے جواب دیا۔ ابے چپکا ہو رہ۔ کسی کی فارغ خطی لکھوائی جاتی
ہوگی۔ پس جب سے عوام میں یہ فقرہ بطور مذاق مشہور ہو گیا ورنہ کوئی
محاورہ ہے نہیں......''

☆...☆

حاشیہ

۱۔ مخزن المحاورات منشی چرنجی لال نے مرتب کی تھی۔ سید احمد دہلوی صاحب دیگر لغت نویسوں کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتے ہیں اور ان کا ذکر عموماً استہزائیہ انداز میں کرتے ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود، فرہنگ آصفیہ کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ لغت نویسی کا میدان صرف اُن کے لیے مخصوص ہو گیا۔ سید احمد دہلوی نے مولفِ امیر اللغات امیر مینائی پر بھی سرقے کا الزام لگایا تھا۔ لیکن یہاں ان کا اعتراض بجا ہے۔

☆......☆

(۶۹)

صَنَم کا کھیل [ص مفتوح، ن مفتوح، یاے مجہول]

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں: ایک قدیمی کھیل ہے جو اُستادانِ عاشق مزاج کے اختراعات سے دل بہلانے اور شاہدانِ پری تمثال کے پرچانے کا ایک اچھا لٹکا ہے۔ چنانچہ حضرت قلندر بخش جرأت وغیرہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

کچھ داغ جوانی میں نہیں عشق کا چپکا
طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

احسن اللہ خان:

سونے نہ دیں گے اور نہ سوئیں گے رات بھر
کھیلیں گے آج کھیل صنم کا صنم سے ہم

اس کھیل کے قواعد میں ایک مختصر رسالہ بھی سید حسین شاہ صاحب حقیقت کی تصنیف سے یادگار ہے۔ جس کا نام مصنف موصوف نے صنم کدۂ چیں تجویز فرما کر ۱۲۰۹ ہجری میں تیار کیا۔ وہ ۱۲۶۹ ہجری میں ۴۳ صفحے پر مطبع مصطفائی سے چھپا۔

اس کھیل کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ چند ہم عمر باہم مل کر ایک جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور دائیں جانب سے حرف الف کا دورہ شروع کرتے ہیں یعنی ان میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ صنم آمد۔ دوسرا اس سے پوچھتا ہے از کجا؟ وہ کہتا ہے از احمد نگر۔ غرض آخر تک اسی طرح اس سے سوال کرتے جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جواب دیتا جاتا ہے۔ جب الف کا دورہ ختم ہو جاتا ہے تو بے کا دورہ شروع کرتے ہیں اور اسی طرح ''ے'' تک لے جا

کر ختم کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک چیز کے جواب دینے میں بھی عاجز وقاصر رہتا ہے تو اسے اس طرح شرمندہ کرتے ہیں کہ جس حیوان کی چاہتے ہیں۔ اس سے بولی بلواتے ہیں۔ بعض لوگ الف، عین، حا، ہا، سین، صاد، ذال، زا، ضاد، ظا کا فرق نہیں کرتے اور زیور وشیرینی وغیرہ چاہتے ہیں سو پوچھ بھی لیتے ہیں۔ تمثیلاً یہاں ایک سوال کر کے اس کا جواب بھی لکھا جاتا ہے۔

صنم آمد؟۔ از کجا؟۔ از احمد نگر۔ کجا می رود؟۔ بہ آگرہ۔ بر چہ سوار است؟ اُشتر۔ چہ پوشیدہ است؟ اچکن۔ دردست چہ دارد؟ انگشتری۔ چہ می خورد؟ انگور۔ چہ می نوشید؟ آب۔ چہ می سراید؟ ایمن کلیان۔ شعرے ہم یاد دارد؟ آرے۔ (یہاں پر چاہے جس زبان کا شعر پڑھے اختیار ہے)

اے باد گر بہ گلشنِ احباب بگذری
زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیامِ ما

آج بیڈھب ہے ہمارے دل میں کچھ آئی ہوئی
جامِ مے بھی سبز ہے اور ہے گھٹا چھائی ہوئی

آ پیارے نین میں پلک ڈھانک تو ہے لون
نہ میں دیکھوں اور کو نہ تو ہے دیکھن دون

کدام مَثَل ہم یاد دارد؟۔ آرے۔ آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت...

☆.....☆

حاشیہ

۱۔ افسوس کہ یہاں سے مسودے کے خاصے صفحات غائب ہیں اور قسط ۶۹ کے بعد قسط ۷۶ کا دوسرا صفحہ دست یاب ہوا ہے۔

☆..... ..... ☆

(۷۰ تا ۷۵)

یہ اقساط دستیاب نہ ہوسکیں۔

☆......☆

(۷۶)

ناگور

[ابتدائی حصہ غائب ہے][1]

''..........اجمیر کو روانہ ہوا۔ یہاں پہنچ کر راجہ سے تمام کیفیت بیان کی۔ چنانچہ پرتھی راج نے اس سرزمین کو پسند فرما کر شہر کی بنیاد ڈالی۔ اور ایک نہایت مضبوط قلعہ بنا کر نوانگر نام رکھا۔ جو کثرتِ استعمال سے رفتہ رفتہ ناگور مشہور ہوگیا۔ یہاں کا بیل صورت شکل، ڈیل ڈول، قد و قامت میں تمام ہندوستان کو بیلوں سے بدرجہا بہتر اور مضبوط ہوتا ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں جب سے حسین قلی خاں کو جلال الدین اکبر نے یہ شہر جاگیر میں عنایت فرمایا تب سے روز بروز آبادی و عمارات وغیرہ میں یہ شہر ترقی کرتا چلا گیا۔ ابوالفضل اور فیضی علامۂ عصر اسی خاکِ پاک کے رہنے والے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے فاضل و درویشانِ کامل یہاں پیدا ہوئے۔''

میو [م مکسور، واوِ معروف]

ضلع گوڑگانوا اور اَلوَر تک کے علاقے میں میو قوم بستی تھی۔ اب بھی بستے ہیں۔ اس علاقے میں بہت سے قصبے شامل ہیں۔ اندھوپ، ریواڑی سے لے کر فیروز پور جھرکہ، سنگار، کھائی گا، پنہار، اوندن، جھاروپری، بجھور، ڈیگ وغیرہ شامل ہیں۔ میواتی یا میو قوم کا آدمی بڑا بہادر، جفاکش، شجاع اور دلیر مانا جاتا ہے۔ ساتھ ہی نہایت چالاک، عیار اور گرگِ باراں دیدہ بھی مشہور ہے۔ اور اسی صفت کے سبب بعض دلچسپ کہاوتیں مشہور ہوگئی ہیں۔

میومُوا جب جانیے جب واکا تیجا ہوئے

یعنی میوایسے دغاباز اور فریبی ہیں کہ اگر یہ مر بھی جائیں تو ان کا مرجانا قابلِ اعتبار بس از فاتحہ سوم نہیں۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے یہ سب تفصیلات جو اس بیان میں مذکور ہیں، درج فرمائی ہیں۔ دغا باز کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا قصہ اس طرح مشہور ہے کہ ایک میو کسی بنیے کا قرض دار تھا۔ سود کے پھیر میں آ کر اس کے ہاتھوں سے نجات مشکل ہوگئی۔ رات دن کے تقاضوں سے ناک میں دم آ گیا۔ تب میو نے یہ پیچ کھیلا کہ اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے کہا کہ میرے مرنے کی خبر مشہور کردو۔ اور تم سب میرا جنازہ بنا کر لے چلو۔ بنیا بھی مردے کو دیکھنے اپنے روپوں کو رونے پیٹنے ضرور میت کے ساتھ آئے گا۔ اس کے سامنے دفنا کر چلے آنا۔ اور دو ایک آدمی اِدھر اُدھر چھپے ہوئے چھوڑ آنا۔ تاکہ وہ مجھے فوراً قبر کھود کر باہر نکال لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ بنیا بھی یہ خبرِ بد سُن کر پیٹ پکڑے ہوئے دوڑا ہوا آیا۔ اور کہا کہ میو جی تم کیا مرے ہمیں مار چلے۔ دل میں کہا ارے رام، مول دیا نہ بٹہ مر گیا ہٹا کٹا۔ غرض قبر تک ساتھ روتا پیٹتا گیا۔ اور اوّل منزل پہنچا کر سب کے ساتھ واپس آیا۔ ادھر جنازہ رکھ کر لوگ اُلٹے پھرے اُدھر اس کے رشتہ داروں نے گھات سے نکل کر قبر کھود، مٹی ہٹا، پٹاؤ دور کر، میاں میو کو باہر نکال لیا۔ یہاں لالہ جی نے آتے ہی اپنی بہی میں لیکھا جوکھا برابر کر میو کا نانواں بٹّے کھاتے میں لکھ دیا کہ آج میاں میو کے ساتھ روپے بھی مر گئے۔ دوسرے ہی روز جو میو کو زندہ سلامت دیکھا تو زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ ''میو مرا تب جانیے جب واکا تیجا ہوئے۔''

میوہ فروش [یائے مجہول، واوِ مجہول]

تازہ پھل بیچنے والے کو میوہ فروش کہتے ہیں۔ بیچنے والے طرح طرح کی آوازیں بھی لگاتے ہیں۔ ہر پھل والا اپنی جدا صدا رکھتا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی

نے دہلی کے میوہ فروشوں کی یہ صدائیں درج کی ہیں:[۲]

فالسہ فروش	:	سانولے سلونے فالسے شربت کو، نون کے بتاسے ہیں شربت کو۔
جامن فروش	:	کالی بھونرالی نمکین۔ بیدانہ بھونرالی نمکین۔
تُوت فروش	:	کاٹھ کی لکڑی کا بنا ہے جلیبا۔ قند میں ہلایا ہے جلیبا۔
امرود فروش	:	پیڑ کے پکے امرود میں سیب کا مزا۔
کیلا فروش	:	ڈال کے پکے کیلے میں مصری کا مزا۔
شفتالو فروش	:	ڈالی ڈالی کا کھلا پیوندی۔
آم فروش	:	پال کا لڈو۔ پال کا لڈو۔
گولر فروش	:	جھرنے کا بتاسہ ہے گولر۔

کِھرنی [کھ مکسور]

زرد رنگ کا نبولی کی طرح کا گٹھلی دار پھل ہوتا ہے جو فالسے کے ساتھ ساتھ ہی فروخت ہوتا تھا۔ اکبر آباد (آگرہ) کے پھل والے گلی گلی یہ آواز لگا کر بیچتے تھے۔ کھرنی میوہ فالسے، آئے نینی تال سے، کہہ دو پیارے لال سے۔

☆......☆

حواشی

۱۔ دراصل یہ ناگور کا ذکر ہے اور فرہنگِ آصفیہ سے مقتبس ہے۔

۲۔ دلّی کے مقابلے میں لکھنؤ کے سودا بیچنے والوں کی صدائیں بھی ملاحظہ فرمائیے:

خربوزہ	:	میٹھے خربُوزے ہیں، قند کے کوزے ہیں۔
امرود	:	کیا تحفہ امرُود ہیں، حلوائے بے دُود ہیں۔
مونگ پھلی	:	مونگ پھلی کی ٹونگار ہے، جاڑے کی بہار ہے۔

فالسہ : شربت کے فالسے، ٹپکے ہیں ڈال سے۔

ککڑی : مجنوں کی پسلیاں ہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، ریشم کی پگڑیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں

(بحوالہ: فتنہ، یکم اگست ۱۹۰۶ء، منقول از انتخابِ فتنہ، مرتبہ نادم سیتاپوری، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء (؟)۔

(۷۷)

بٹیر بازی [بَ مفتوح، یائے مجہول]

پہلے زمانے میں، رئیس زادے اور امیر زادے جن مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے تھے ان میں ایک مشغلہ بٹیر بازی کا بھی تھا۔

سید احمد صاحب دہلوی بٹیر بازی کے متعلق لکھتے ہیں:

''جہاں اساڑھ کا مہینہ شروع ہوا باغوں میں بٹیریں پکڑنے کے لیے جال لگائے گئے۔ باغوں کے مکان اور بارہ دری فرش فروش سے سجائی۔ شوقین شہزادے مع سامان نوکر چاکر وہاں جا رہے۔ پلی ہوئی بٹیروں کو جال دار تھیلیوں برابر بانس میں باندھ کے اونچی بَلّیوں میں لٹکا دیا۔ رات بھر بٹیروں کی آواز پر بٹیر گرتے رہے۔ فجر ہی منھ اندھیرے شہزادے نوکروں اور مصاحبوں کو لے کے بٹیروں کی گھرائی کو اُٹھے۔ باغ میں چاروں طرف آدمیوں کو پھیلا کے بٹھا دیا۔ رسان رسان ہاتھوں سے تھپکی لگا کے سب طرف سے بٹیروں کو گھیر کے جال کی طرف لے گئے۔ جب بٹیر جال میں پہنچ گئے۔ جلدی سے جال کے بندھن جو بَلّیوں میں بندھے ہوئے تھے کھول کے جال گرا دیا۔ جتنے بٹیر جال میں پھنس گئے، پکڑ لیے۔ نروں کو کابکوں میں رکھا۔ مادینوں کو حلال کر کے کھالیا۔ نئے پکڑے ہوئے بٹیرَوں کو دونوں مٹھیوں میں پکڑ کے مُونٹھیں کیں۔ ان کی چمک

نکالی۔ رات کو مونٹھیں کر کے بٹیروں کے کانوں میں کُوکا اور جگایا۔
ماشوں سے ناپ تول کر دانہ پانی انھیں دیا۔ جس سے ہلکے پھلکے
چست چالاک رہیں۔ بھدے اور مست نہ ہو جائیں۔ جب بٹیر
لڑائی کے لیے تیار کر لیے اور خوب آزما لیے تو آپس میں صیدیوں
سے لڑائے۔ بھوسے کے بٹیروں کو مشک زعفران میں رنگ رنگا کر
بادشاہ کے سامنے جا لڑایا۔ لڑتے لڑتے جس کا بٹیر بھاگا۔ وہ فق رہ
گیا۔ جس کا بٹیر بازی جیتا اس نے شور مچایا۔ وہ مارا۔ بھگا دیا۔ ہار
جیت کے اپنے گھر آئے۔ بازی جیتے ہوئے بٹیروں کے پاؤں میں
چاندی کی کڑیاں ڈال دیں۔ جب تک موسم رہا۔ آپس میں لڑاتے
رہے۔ جب موسم نکل گیا۔ بٹیر بازوں کے حوالے کیا کہ ان کے ہر
موسم کا رکھ رکھاؤ اور دانہ پانی کی خبر گیری کرتے رہیں۔ گرمیوں میں
دودھ نان پاؤ، جاڑوں میں گنگنی وغیرہ ملتی رہی۔ اب جب موسم
آئے گا پھر اسی طرح پکڑیں گے اور لڑائیں گے۔"

مولوی سید احمد صاحب دہلوی کے اس بیان میں دو ایک لفظ آئے ہیں جن کی تشریح انھوں نے خود اس لیے نہ کی ہوگی کہ ان کے عہد میں عام فہم الفاظ تھے لیکن اب ان کا استعمال عام نہیں۔ اس لیے ہم تشریح کی کوشش کرتے ہیں۔

مُونٹھیں کرنا [واوِ معروف، نون غنہ]

کبوتر یا بٹیروں کو مٹھی میں پکڑ کر انھیں سدھانا اور تیار کرنا۔

صَیدیوں سے لڑاتے تھے [یائے لین]

صیدی اصطلاحاً کبوتر بازوں میں حریفِ ہم پیشہ کو کہتے ہیں یعنی جن دو میں یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ وہ آپس میں کبوتر یا بٹیریں لڑائیں گے اور اگر ایک دوسرے کے پرندے

پکڑ لیں گے تو واپس نہ کریں گے۔

ان کی چمک نکالی [چمک نکالنا]

یعنی وحشت دور کی۔ بھڑ کنا رفع کیا۔ مانوس بنایا۔

بَسَنْت [ب مفتوح، س مفتوح، نون ساکن]

بہار کا مشہور موسم ہے۔ ہندی کی چھ رُتوں میں سے ایک رُت جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی فرہنگ آصفیہ میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ [اصل] رُت بیساکھ کے مہینے میں آتی ہے مگر اس کا میلہ آمدِ بہار میں سرسوں کے پھولتے ہی ماگھ کے مہینے سے شروع ہو جاتا ہے۔ چوں کہ موسم سرما میں سردی کے باعث طبیعت کو انقباض ہوتا ہے اور آمدِ بہار میں سیلانِ خون کے باعث طبیعت میں شگفتگی، امنگ، ولولہ اور ایک خاص قسم کی خوشی اور صفرا کی پیدائش پائی جاتی ہے۔ اس سبب سے اہلِ ہند اس موسم کو مبارک اور اچھا سمجھ کر نیک شگون کے واسطے اپنے اپنے دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کے استھانوں میں مندروں پر ان کے رجھانے کے لیے بمقتضائے موسم سرسوں کے پھولوں کے گڑوے بنا کر گاتے بجاتے لے جاتے اور اس میلے کو بسنت کہتے ہیں . . . جس وقت اس میلے میں سیلانی زرد پوشاکیں پہن کر جاتے ہیں تو عجب بہار اور کیفیت نظر آتی ہے۔ بادشاہی زمانے میں تو ملازموں اور سواری کی رتھوں گھوڑوں اور پالکیوں تک کا یہی عالم ہوتا تھا۔ پہلے اس میلے کا مسلمانوں میں دستور نہ تھا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی نے اس میلے کا رواج دیا۔ جس کی وجہ

یہ ہوئی تھی کہ آپ کے پیرومرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہ العزیز کو اپنے پیارے اور خوبصورت بھانجے مولانا تقی الدین نوح سے جو درحقیقت حسنِ صورت میں یکتائے زمانہ اور خلق وسیرت میں بے ہمتاویگانہ تھے، کمال الفت اور نہایت ہی محبت تھی۔ ساتھ ہی آپ کے بھانجے کو بھی آپ سے اس قدر اُنس تھا کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھ کر یہ دُعا مانگتے تھے کہ الٰہی میری عمر بھی محبوبِ الٰہی کو دے دے تاکہ ان کا فیضِ روحانی عرصۂ دراز تک جاری رہے۔ اُدھر حضرت کی یہ کیفیت تھی کہ دَم بھر ان کے بغیر چین نہیں پڑتا تھا . . . قضائے کار بھانجے صاحب کی دُعا قبول ہوئی اور وہ اُٹھتی جوانی ہی میں اس جہان سے اٹھ گئے۔ اور اس دفعتہً کی دائمی مفارقت نے حضرت کو عجب عالم اور غضب ماتم سے پالا ڈالا۔ . . . غرض آپ کو یہاں تک صدمہ اور رنج والم ہوا کہ آپ نے یک لخت جس راگ کے بغیر دم بھر نہیں رہتے تھے اسے بھی ترک کر دیا۔ جب اس بات کو چار پانچ مہینے کا عرصہ گزر گیا تو آپ تالاب کی سیر کو جہاں اب باؤلی بنی ہوئی ہے مع یارانِ جلسہ تشریف لائے۔ ان دنوں میں یہی بسنت کا موقع اور بسنت پنچمی کا میلہ تھا۔ امیر خسرو کسی سبب سے ان سب سے پیچھے رہ گئے۔ دیکھا کہ کھیتوں میں سرسوں پھول رہی ہے۔ ہندو کالی دیوی یا کالکا جی کے مندر پر گڑوے بنا بنا کر خوشی خوشی گاتے بجاتے لیے چلے جاتے ہیں۔ انھیں بھی یہ خیال آیا کہ میں بھی اپنے پیر کو خوش کروں۔ چنانچہ اس وقت ان کے دل میں ایک خوشی اور انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسی وقت دستار

مبارک کو کھول کر کچھ پیچ اِدھر کچھ پیچ ادھر لٹکا لیے۔ ان میں سرسوں کے پھول اُلجھا کر یہ مصرعہ الاپتے ہوئے اسی تالاب کی طرف چلے جدھر آپ کے پیر و مرشد تشریف لے گئے تھے۔

اشک ریز آمدہ است ابرِ بہار

جہاں تک اس الاپ کی آواز پہنچتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ گونج رہا ہے۔ ایک تو حضرت فنِ موسیقی کے نایک اور عدیم المثل سرود خواں تھے، دوسرے اس ذوق وشوق نے اور آگ بھڑکا دی۔ کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محبوبِ الٰہی کو خیال آیا کہ آج ہمارا ترک یعنی خسرو کہاں رہ گیا۔ عجب نہیں جو کچھ سریلی بھنک بھی کان میں پہنچی ہو۔ آپ نے پے در پے دو چار جلیسوں کو انھیں لینے بھیجا۔ وہ جو تلاش کرتے ہوئے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ عجب رنگ سے آپ گاتے ہوئے مستانہ چال و معشوقانہ انداز سے خراماں خراماں جھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ اسی رنگ میں مل گئے۔ غرض ایک شخص واپس آیا . . . اور آتے ہی کہا کہ حضرت! امیر خسرو کے پاس جا کر آنا کٹھن ہے۔ رنگ میں رنگ مل جاتا ہے . . . آپ ان کی کیفیت سنتے ہی کھڑے ہوگئے۔ اور اپنے مونس و غم گسار ترک کو لینے چلے۔ خسرو نے دور سے دیکھتے ہی اشکوں کے موتی نثار کرنے شروع کر دیے۔ جس وقت حضرت قریب آئے بیتابانہ یہ شعر پڑھا:

اشک ریز آمدہ است ابرِ بہار
ساقیا گل بریز بادہ بیار

دوسرے مصرعے کا سننا تھا کہ حضرت کا بیتاب ہو کر اپنے دامان و

گریباں کا چاک کر ڈالنا اور گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے لیے چلے آنا۔ کہتے ہیں ایک عرصہ تک رقت کا بازار گرم رہا اور اہلِ ذوق مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے اور پھڑکتے رہے:

مصحف بود آں سر کہ بسودائے تو باشد
کعبہ بود آں دل کہ درو جائے تو باشد

غرض کہ اس وقت سے مسلمانوں میں یہ میلا بھی شروع ہو گیا اور حضرت سلطان المشائخ نے بھی راگ سننا پھر شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ہر ایک بزرگ کے مزار پر بسنت چڑھنے لگی۔ اوّل پہاڑوں پر اللہ میاں کی بسنت چاند رات کو چڑھتی ہے۔ پھر پہلی تاریخ کو قدمِ رسول یعنی نبی کریم [صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم] میں۔ غرض اسی طرح خواجہ صاحب چراغِ دہلی، حضرت نظام الدین وغیرہ وغیرہ بزرگوں کے مزاروں پر باری باری سے چڑھتی ہے . . . بسنت کی اسی رعایت سے اب بسنت کے روز قوال اوّل حضرت کی قدیم خانقاہ میں بسنت لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا تقی الدین نوح کے مزار پر اور آخر میں حضور کے روضۂ اقدس پر چڑھاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

☆......☆

(۷۸)

بکیر بچّہ [ب مکسور، یاے معروف، ب مفتوح، چ مشدد بفتحہ]

مسلمانوں میں بچے کی پیدائش سے متعلق جو رسوم جاری تھیں ان میں سے ایک رسم بکیر بچّہ کہلاتی تھی۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ:

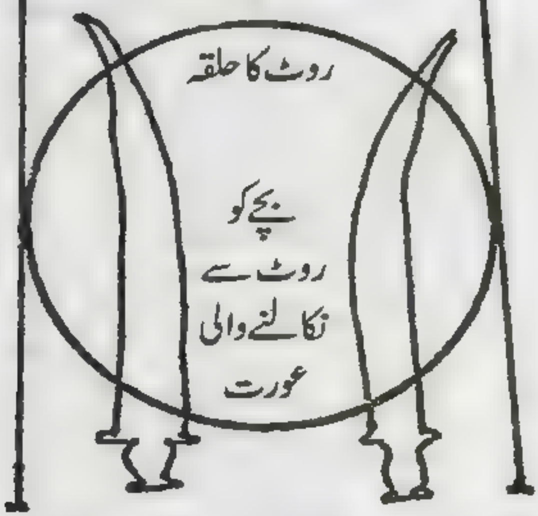
تارے دکھانے کے بعد کی رسم جو اور مغلوں میں بھی ایک ذرا سے فرق کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ شاہی لال قلعہ دہلی میں اس کا یہ قاعدہ تھا کہ سوا پانچ سیر کا ایک میٹھا روٹ زمین لال کر کے اس میں پکاتے اور بیچ میں سے خالی کر کے روٹ کا صرف گردہ [حلقہ] رہنے دیتے تھے۔ اس کے اوپر ننگی تلواریں اور دائیں بائیں تیر باندھ کر اٹکا دیتے تھے۔ سات سہاگنیں جن میں سے تین حلقے کے سامنے اور چار بائیں جانب پرا باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ایک عورت روٹ کے گردے میں سے بچے کو دیتی اور کہتی کہ بکیر بچّہ دوسری اللہ نگہبان بچّہ کر کر لے لیتی اور اپنی ٹانگوں میں سے بچے کو نکال کر تیسری سے کہتی کہ بکیر بچّہ۔ غرض اسی طرح ساتوں سہاگنیں سات دفعہ بچے کو روٹ کے حلقے اور اپنی ٹانگوں میں سے نکالتی تھیں۔ صرف یہ رسم ہندوستان کی رسموں سے باہر اور ترکی الاصل ہے اور باقی سب ملتی ہوئی ہیں۔

(فائدہ: روہیل کھنڈ اور دوسری پٹھان بستیوں مثلاً فرخ آباد، ملیح آباد، شاہ جہاں پور، قائم گنج وغیرہ میں مسلمانوں میں آج تک شادی و غمی کی بہت سی رسمیں رائج ہیں جو ہندوؤں سے بالکل مختلف ہیں اور ان کے آبائی مسکن و قبائل کا پتا بتاتی ہیں۔ اس لیے مولوی سید احمد صاحب کا یہ فرمانا کہ بکیر بچّہ کے علاوہ باقی رسوم ملتی جلتی ہیں، قدرے مبالغہ ہے۔ رامپوری

روہیل کھنڈی مسلمانوں کی رسوم کے متعلق لکھا جا چکا ہے۔ قادری)

ہمارے [مولوی سید احمد صاحب کے] ایک نہایت مؤقر و معتبر دوست جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس رسم کو مرزا محمود سلطان مرحوم شاہ عالم بادشاہ غازی کے پڑپوتے کے پیدا ہونے کے موقع پر دیکھا۔ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ بچشم طور اِس روٹ کا زمین لال کر کے اس پر پکنا اور اس کا حلقہ کتر کے تیروں کے سہارے دو تلواروں کے ساتھ کھڑا کرنا اس ہیئت سے دیکھا جس کا نقشہ سامنے درج ہے:

روٹ کا نقشہ



پہلی سہاگن	۱
دوسری سہاگن	۲
تیسری سہاگن	۳
چوتھی سہاگن	۴
پانچویں سہاگن	۵
چھٹی سہاگن	۶
ساتویں سہاگن	۷

ساتویں سہاگن ۷

اس ساتویں نے ہاتھوں ہاتھ واپس کیا۔ سات سہاگنیں آگے پیچھے قطار باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور ایک معزز عورت حلقے کے دوسری طرف بچے کو لے کر استادہ ہوگئی۔ اس نے روٹ کے حلقے میں سے بچے کو نکال کر پہلی سہاگن کو دیا۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں سے نکال کر دوسری کو دوسری نے تیسری کو۔ اسی طرح ساتویں نمبر تک پہنچایا۔ ساتویں نے ہاتھوں ہاتھ اسی ترتیب پر واپس کیا اور روٹ میں سے نکال کر اسی عورت کو دے دیا جس نے سب سے اوّل بچے کو دیا تھا۔ غرض اسی ڈھنگ پر سات مرتبہ ہیرے پھیرے کرائے۔ یہ رسم خاص مرزا محمد سلطان مرحوم کے پیدا ہونے میں نواب عزیز النساء بیگم مرحومہ نے جو حضرت فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ کی بیٹی مرزائے موصوف کی پردادی تھیں، اپنے قدیمی دستور کے موافق مرزا محمود سلطانِ مبرور کی والدۂ مرحومہ کے ہاں ادا کی۔

ان کا بیان ہے کہ یہ رسم اس طریقے پر حضرت عرش آرام گاہ ابونصر معین الدین محمد اکبر بادشاہ ثانی والدِ بہادر شاہ معزول کے زمانے یعنی ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۷۴۹ء [کذا][۲] تک خاص خاص شہزادوں میں جاری رہی۔ ان کے بیٹے کے زمانے میں جہاں اور رسمیں اور شاہی قاعدے روبہ کمی ہوئے اس میں بھی فرق پڑ گیا۔

اس رسم کو آج کل شہزادگان دہلی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ سات سہاگنیں بدستور مگر زچہ چوں کہ عذرِ نفاس کے سبب سورۂ اخلاص نہیں پڑھ سکتی، اپنی بجائے ایک اور عورت بطور مدد اپنے ساتھ لے

لیتی ہے۔ یہ سب عورتیں سات مرتبہ قل ھواللہ پڑھ کر اور لفظ بگیر بچہ کہہ کر دوسری عورت کو اس مولودِ مسعود کو دیتی ہے۔ وہ اللہ نگہبان بچہ کہہ کر لے لیتی ہے اور سات ہی مرتبہ وہ ہی سورت پڑھ کر تیسری عورت کو بگیر بچہ کہہ کر حوالے کر دیتی ہے۔ وہ لفظ اللہ نگہبان بچہ ادا کر کے اسے لے کر چوتھی عورت کو دے دیتی ہے۔ غرضی اسی طرح یہ روٹ پورا کر دیا جاتا ہے۔

جب ساتوں سہاگنیں اپنی اپنی باری سے بگیر بچہ کہہ کر فارغ ہو جاتی ہیں تو انھیں فی سہاگن دو دو نانیں یا باقر خانیاں، دو دو لڈو، دو دو بادام اور دو ہی دو چھوہارے دیے جاتے ہیں۔ یہ رسم ترکستان سے مغلیہ خاندان کے ساتھ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چوں کہ چالیس روز تک بچے کو پلنگ سے اُتارنا عورتوں کے وہمی مسئلہ میں ممنوع خیال کیا جاتا ہے اس وجہ سے یہ ترکیب نکالی گئی کہ خدا کی حفاظت میں اسے چھوڑا اور اس بہانے سے اسے پلنگ سے اُتارا جائے۔

یہ رسم دہلی کے اور مغلوں میں اس طرح پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ روٹ نہیں پکاتے۔ ان کے ہاں رات کے بارہ بجے ایک چادر بچھائی جاتی اور اس پر کھیلوں بتاسوں کی سات ڈھیریاں لگاتی ہیں۔ ان کے اوپر دو دو پان بھی رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پہلے ایک عورت کی گود میں یہ کہہ کر بچے کو دیتے ہیں کہ بگیر بچہ۔ وہ تین دفعہ الحمدُ اور قل ھواللہ پڑھ کر دم کرتی اور پھر قینچی بچے کے منہ پر پھراتی جاتی اور دوسری عورت کو دے کر کہتی جاتی ہے بچہ بگیر۔ وہ جواب دیتی ہے کہ بیار بچہ۔ اللہ نگہدار بچہ۔ بس اسی طرح ساتوں عورتیں اس بچے کو باری باری سے

گود میں لیتیں اور اپنے اپنے وار سے وہ ایک دوسرے کو دیتی جاتی ہیں۔ ان رسموں سے فارغ ہو کر سب کھانا کھاتے اور ساری رات گاتے بجاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی ڈولیاں لگ جاتی ہیں۔ سب مہمان اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔"

☆......☆

حواشی

۱۔ یہ نقشہ فرہنگِ آصفیہ میں موجود ہے۔ قادری صاحب نے وہیں سے لے کر مسودے میں نقل کیا ہے۔

۲۔ ۱۲۶۳ ہجری کی مطابقت ۱۷۴۹ء سے نہیں ہوتی۔ سہوِ قلم ہے۔

☆......☆

(۷۹)

پَتَنگ بازی [پ مفتوح، ت مفتوح]

پتنگ اُڑانا بہت قدیم مشغلہ ہے اور حتمی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ سب سے پہلی پتنگ کہاں اور کس نے اُڑائی۔ صرف لڑکوں اور نوجوانوں کا ہی شغل نہیں بلکہ بعض جگہ اس کی حیثیت قومی کھیل کی سی ہے۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ چین سے اس مشغلے کا آغاز ہوا اور آج تک چین میں پتنگ بازی کو مستقل تیوہار کی حیثیت حاصل ہے۔ بہت بڑے بڑے اور عجیب وغریب پتنگ بنائے جاتے ہیں۔

یورپ اور انگلستان میں بھی لڑکے پتنگیں اُڑاتے ہیں۔ یہاں کی پتنگیں کاغذ کی نہیں ہوتیں بلکہ پلاسٹک کی مختلف شکلوں کی ہوتی ہیں کیوں کہ ہوا کی اتنی تیزی اور شدت کاغذ نہیں برداشت کرسکتا۔ اُردو میں پتنگ کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔ اس لیے اس کی جمع بھی تذکیر وتانیث کے اصول پر بولی جاتی ہے۔ پتنگ اُڑاتے ہیں۔ پتنگ اڑتا ہے۔ پتنگیں اُڑتی ہیں۔ سب طرح درست ہے۔

برصغیر میں بھی پتنگ بازی اور پتنگ سازی نہ صرف بطور مشغلے کے بلکہ بطور فن اور حرفہ کے رائج ہے۔ مختلف قسم کی پتنگوں کے نام بھی مختلف ہیں۔

بادشاہی زمانے میں مغلیہ شہزادے بڑے اہتمام سے پتنگ اُڑاتے تھے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے پتنگ بازی اور قلعہ کے متعلق فرہنگ آصفیہ میں ذکر کیا ہے۔ جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں:

''عصر کے وقت پتنگ باز بڑے بڑے پتنگ، ڈور کی چرخیاں لے کے سلیم گڑھ میں پہنچتے۔ بادشاہ کی سواری آتی۔ ایک طرف بادشاہی پتنگ باز دریا کی طرف پتنگ بڑھاتے۔ دوسری طرف معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا پتنگ اُٹھتا۔ دریا کی ریتی میں سوار کھڑے ہو جاتے۔ پیچ لڑتے۔ ڈھیلیں چلتیں۔ پتنگ ڈوبتے ڈوبتے آسمان سے جا لگتے۔ پٹا چھوڑ دیتے[1]۔ ڈور زمین سے لگ جاتی۔ سوار آنکڑے دار لکڑی ہاتھوں میں لے لیتے۔ آخر ایک پتنگ کٹ جاتا۔ ہوا کے جھونکے اور تھپیڑیں کھاتا ہوا دریا کے پار جا گرتا۔ بادشاہ سیر دیکھتے رہتے۔ جی میں آتا تو تختِ رواں سے اُترتے۔ پتنگ باز مچھلی کے چھلکوں کے دستانے بادشاہ کے ہاتھوں میں پہنا دیتے۔ بادشاہ پتنگ ہاتھ میں لیتے۔ ایک آدھ پیچ لڑاتے۔ پتنگ بازی کی سیر دیکھ محلِ معلیٰ میں داخل ہو جاتے۔ بادشاہی پتنگ بازی میں پتنگ اور تکّل قدِ آدم ہوتی تھی۔ بعض اوقات لوہے کے تار پر بھی اُڑاتے تھے۔ بادشاہی حریفوں یا صیدیوں میں مرزا یاور بخت شہزادے بہت مشہور تھے۔ ان کی برابر کوئی نہیں لڑا سکتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کا پتنگ بہت کم کٹتا تھا اور کاٹنے میں سب سے زیادہ زبردست رہتا تھا۔ یہ اپنے ہاتھ سے آپ ہی پتنگ بناتے۔ آپ ہی ڈور تیار کرتے اور آپ ہی لڑاتے تھے۔ مرزا یاور کا سا سُدھ پتنگ کم دیکھنے میں آیا ہے۔ غدر کے بعد بھی مرزا یاور نے پتنگ بازی میں اپنی شہرت قائم رکھی۔ بڑے بڑے پتنگ، تکّلیں، کنکوّے، رنگین اور سادے پہلے بازاروں میں بکتے تھے۔ بعض شوقین اپنے

ہاتھ سے بڑی بڑی کاری گری سے بناتے تھے۔ کنکوا، دوباز، دوپٹا، کانڑا، دوپلکہ، چرڑا، کلدما، لکداما، بگلہ وغیرہ۔ تکلیں لنگوٹ دار، کلیجہ جلی، وغیرہ وغیرہ بنا کے ان میں اپنی کاری گری دکھاتے۔ ڈور ایک بلی، دوبلی، تبلی، چوبلی۔ کنکوؤں، تکلوں کے زور کے موافق، مانجھا سونت کے بڑے بڑے پنڈلے، گولے، خوبصورت بناتے یا چرخیوں، ٹھاڑیوں یا ہچکوں پر چڑھاتے۔ اس پر پتنگ، تکلیں، کنکوے اُڑاتے اور لڑاتے۔ نخ پر مانجھا سونت کے ڈور کا کام لیتے۔ بچے بالے پیسیل، ھیلچیل، دمڑچیل، کنکوے چھوٹی تنخیں ایک بلی ڈور پر اُڑاتے پھرتے۔ وہ پہلی سی ڈوریں، نخ، پتنگ، کنکوے سب اُڑ گئے۔ اب لنڈورے کنکوے، بن پنچھالے[۲] کے جنھیں گڈی کہتے ہیں۔ انگریزی موٹے ریل کی ڈور پر مانجھا سونت کر پتنگ بازی ہوئی ہے۔"

مولوی سید احمد صاحب دہلوی کی اس تحریر میں پتنگ بازی کی بہت سی اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ مختلف قسم کی پتنگوں کے نام بھی آتے ہیں اور پتنگ اُڑانے کی مختلف کیفیتوں کے لیے جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ بھی ہیں۔ ان میں اکثر الفاظ تو پہچان میں آ جاتے ہیں۔ اور کنکوا، تکل، لنگوٹ دار کی شکلیں ذہن میں آ جاتی ہیں۔ لیکن اور الفاظ آسانی سے لغت میں بھی نہیں ملتے۔ مثلاً نخ۔ کچے ریشم کی ڈور کو کہتے ہیں اور اس قسم کی ڈور کو مانجھا سوت کر پتنگ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کیوں کہ اس طرح کی ڈور کو حریف کے واسطے کاٹنا آسان نہ ہوتا تھا۔

بچوں کی پتنگوں کے سلسلے میں مولوی سید احمد صاحب نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں آج کہیں سننے میں نہیں آتے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ سکوں سے متعلق ہیں۔ اب وہ سارا

(۸۰)

پانچویں سواروں میں ہونا[1] [یائے مجہول]

یہ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جب اصل کام کرنے والے تو دوسرے ہوں اور ایک خود بغیر کچھ کیے اور بلا کسی استحقاق کے خواہ مخواہ اپنے سر سہرا باندھنا چاہتا ہو۔ جیسے لہو لگا کر شہیدوں میں ملنا بھی کہتے ہیں۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی کے بقول اس مقولے کی اصل یوں ہے کہ چار سوار دکن کو جاتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے کوئی کمہار بھی گدھے پر چڑھا ہوا اسی طرف چلا جاتا تھا۔ کسی مسافر نے پوچھا کہ یہ چاروں سوار کہاں جاتے ہیں۔ کمہار نے اپنے تئیں بھی شامل کر کے کہا کہ ہم پانچوں سوار دکن کو جاتے ہیں۔ شوقؔ:

تاکہ مشہور ہوں ہزاروں میں
ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

بُوالہَوَس[2] [ب مضموم، واو غیر ملفوظی، الف غیر ملفوظی، ل ساکن، ،، ومفتوح، ومفتوح]

لفظی معنی ہیں ہوس کا باپ۔ لیکن عربی میں یہ ترکیب محض نسبت کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ جیسے مٹی والا [بوتراب]۔ بلّی والا [ابو ہریرہ]۔ اسی طرح ہوس والا۔ یعنی ہوس ناک، لالچی، طامع اور حریص کے لیے بھی آتا ہے اور خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب کے لیے بھی۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی نے اس لفظ کی تشریح میں لکھا ہے:

''اس لفظ کی صحت میں لوگوں نے بڑے بڑے جھگڑے ڈالے

ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ لفظِ ہوس فارسی ہے۔ اس میں تعریفی الف ملانا جائز نہیں۔ اصل میں بُل بمعنی بسیار اور ہوس بمعنی آرزو سے مرکب ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں لفظ فارسی ٹھہرتے ہیں۔ صاحبِ برہان اور عبدالواسع ہانسوی نے اسی پر زور دیا ہے مگر جہاں پر لفظِ ہوس کے اِعراب لکھے ہیں وہاں صاحب برہان کیا اور صاحب جہاں گیری کیا۔ دونوں یہی لکھتے ہیں کہ ہائے ہوز مضموم اور بواوِ مجہول کے ساتھ طوس کے وزن پر ہوا وہوس کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے۔ چناں چہ صاحب جہاں گیری نے ابن یمین کا یہ قطعہ درج بھی کیا ہے:

در قدح کن ز حلقِ بط خونے
ہم چو روے تذرو و چشمِ خروس
رزم بر بزم اختیار مکن
ہست مارا بخود ہزاراں ہوس

لیکن جب لغاتِ عرب میں اس کا پتا لگایا جاتا ہے تو وہاں بفتحتین عشقِ مفرط کے معنی میں پایا جاتا ہے۔ جس سے شوق اور آرزو کے معنی خود ظاہر ہیں۔ اس کے علاوہ شعرائے فارس نے بھی اسی طرح باندھا ہے۔ سعدیؔ:

ہمہ با ہوا و ہوس ساختی

پھر کیا ضرور ہے کہ ہم اسے فارسی قرار دیں اور عربی کے موافق تلفظ ادا کریں اور عجب نہیں جو فارسی لفظ بھی عربی ہی سے مُفرّس ہو گیا ہو۔ بہر حال بوالہوس عربی قاعدے کے موافق لکھنا درست ہے۔ ورنہ حالت تلفظ میں بھی بدلنا پڑے گا اور شعراء نے جو اس کو بالتحریک

باندھا ہے وہ بھی غلطی پر محمول ہوں گے:

ذوق دہلوی:

سینے میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہوگیا

براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

جب کوئی چیز ملنے والی نہ ہو یا کام نہ نکلتا ہو، یا مقصد پورا کرنا مقصد نہ ہو تو یہ فقرہ بولتے ہیں۔ یعنی مراد پوری ہونے والی نہیں، کام بننے والا نہیں، ہوا کھاؤ۔ ٹال مٹول کرنا اور جھوٹا وعدہ کرنا بھی ہے۔

برات کے معنی ہیں حصہ۔ شاخ سے مراد ہے سینگ۔ برات، ہُنڈی، مطالبۂ زر یا وہ کاغذ جس پر رقم لکھی ہو۔ اور اسی لیے برات تنخواہ، مشاہرہ، واجب الادا رقم کو بھی کہتے ہیں۔

مولوی سید احمد صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''چوں کہ ہرن ایک چنچل، اچپل، بے چین، مضطرب المزاج اور نچلا نہ رہنے والا جانور ہے جس سے اس کے سینگ پر بھی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ اس وجہ سے عدمِ حصولِ مراد اور وعدۂ دروغ کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ عدم استقلال اور عدم استحکام سے بھی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ اُستاد ذوق نے بھی اسی مثل کو اُردو شعر میں باندھا ہے اور اثنائے گفتگو میں یہ کہاوت زبان پر آجاتی ہے۔ حضرت ذوق کا شعر ہے:

سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے
براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

یعنی ہم نے محبوب سے بوسہ کا سوال کیا تو اس نے تیوری چڑھا کر اور

چیں بجبیں ہو کر ظاہر کر دیا کہ تمھاری یہ مراد برآنے والی نہیں ہے۔ ہم
سے ایسی توقع نہ رکھیے۔ بس شاعر یہ کہتا ہے کہ ہمارے حق میں یہ
جواب ایسا ملا کہ جسے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو پر محمول کر سکتے
ہیں۔ گویا ہماری یہ درخواست لاحاصل، بے سود اور فضول ٹھہری۔"

براتِ عاشقاں سے مراد ہے کہ عاشقوں کا مقصد ان کا مطالبہ یا ان کا حق اور ان کا حصہ بس ہرن کی سینگ پر باندھ دیا گیا یا لکھ کر لٹکا دیا یا ہرن کے سینگ پر لکھ دیا گیا۔ اب نہ ہرن کو عاشق پکڑ سکتا ہے نہ اپنا حصہ یا مطالبہ یا اس کا کاغذ و اجازت نامہ حاصل کر سکتا ہے اور جب نہیں حاصل کر سکتا تو مقصد بھی نہیں پا سکتا۔[۳]

☆......☆

حواشی

۱۔ پانچویں سواروں • • • : "پانچویں" سواروں کی بجائے "پانچوں" سواروں بھی کہتے ہیں (لغت بورڈ)۔

۲۔ بوالہوس: رشید حسن خان کا کہنا تھا کہ اس لفظ کا املا بُل ہوس ہونا چاہیے کیونکہ فارسی میں بُل بمعنی "بہت" ہے۔ انھوں نے فرہنگِ جہانگیری دور برہانِ قاطع وغیرہ کے حوالے سے دیے ہیں کہ بُلہوس بمعنیٔ بسیار ہوس ہے (اردو املا)۔ لیکن فرہنگِ آنندراج نے ہوا و ہوس کے معنی میں "ہوس" درج کر کے "بواوِ مجہول" لکھا ہے۔ پھر "ہَوس (بالفتح)" لکھ کر اس کے دیگر معنی کے علاوہ لکھا ہے "بالتحریک آرزوے نفس مرادفِ ہوا، و فارسیان بواوِ مجہول نیز استعمال نمودہ اند۔" (جلد سوم، ص ۸۰۶)۔ دہخدا نے ہوس (فتحہ ہ، فتحہ و) کے ایک معنی "خواہش و آروز و دور یڑ و ہوا و آرزوے نفس" لکھے ہیں (شمارۂ مسلسل ۱۱۶، ۱۳۴۵ ہجری شمسی، ص ۳۳۶)۔ اسٹین گاس کے مطابق عربی میں ہوس (بواوِ لین) ہے لیکن اس نے اس کے کچھ اور معنی دیے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ فارسی میں ہَوَس (ہ مفتوح، و مفتوح) ہے نیز ہوس (واوِ مجہول) ہے اور معنی ہیں "خواہش، بھوک، شہوت" وغیرہ لکھا ہے۔

۳۔ براتِ عاشقاں برشاخِ آہو: اس کی تشریح میں بعض اہلِ علم نے وضاحت نہیں کی کہ گو شاخ سینگ کو بھی کہتے ہیں اور شاخِ آہو سے مراد ہرن کا سینگ تو ہے لیکن اصل میں کہنا یہ ہے کہ یہ وہ ''شاخ'' ہے جو کبھی ہری نہیں ہوتی اس لیے امید پوری نہ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اقبال کا مصرع ہے:

شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
(خضرِ راہ: بانگِ درا)

ناسخ کا شعر ہے:

سوالِ وصل پر ہلنا پری رُو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کا
(کلیاتِ ناسخ، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۸۷ء، ج۱، ص۵۹)

☆......☆

مآخذ

(الف) کتبِ لغات

۱۔ احمد دہلوی، مولوی سید، فرہنگِ آصفیہ، مبنی بر چہار جلد، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء۔

۲۔ اردو لغت بورڈ، اردو لغت (تاریخی اصول پر)، ۲۲ جلدیں، کراچی. اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۷ء تا ۲۰۱۰ء۔

۳۔ اسٹین گاس، ایف، (Steingass, F.)، A Comprehensive Persian-English Dictionary، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۰ء (اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)

۴۔ امیر، امیر احمد مینائی، امیر الغات (دو حصے یک جا)، لاہور: سنگِ میل، ۱۹۸۹ء۔

۵۔ برکاتی، فرید احمد، فرہنگِ کلیاتِ میر، ناشر مصنف، ۱۹۸۸ء۔

۶۔ پلیٹس، جان ٹی، (Platts, John T.) A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English، لندن: کراسبی لاک وڈ اینڈ سنز، ۱۹۱۱ء (اشاعتِ اول ۱۸۸۴ء)۔

۷۔ حقی، شان الحق، فرہنگِ تلفظ، اسلام آباد: ادارۂ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷ء۔

۸۔ خاں، رشید حسن، کلاسیکی ادب کی فرہنگ، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳ء۔

۹۔ دہخدا، علی اکبر، لغت نامۂ دہخدا، تہران: چاپ سیروس، ۱۳۳۹ ہجری شمسی۔

۱۰۔ سرہندی، وارث، علمی اردو لغت، لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۵ء۔

۱۱۔ شاد، محمد بادشاہ فرہنگِ آنندراج، لکھنؤ: نول کشور، ۱۸۹۲ء۔

۱۲۔ طپش، مرزا جان، شمس البیان فی مصطلحاتَ ہندوستان، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۷۷ء۔

۱۳۔ غیاث الدین، مولوی، غیاث اللغات، کراچی: ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، سن ندارد۔
۱۴۔ فیلن، ڈبلیو ایس، (Fallon, W.S.)، A New Hindustani-English Dictionary، لاہور: سنگ میل، (عکسی طباعت) (اشاعتِ اول ۱۸۷۹ء)۔
۱۵۔ نیر، نور الحسن، نور اللغات، اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۹ء۔
۱۶۔ یوسفی، سعد حسن خاں و دیگر، المنجد (عربی اردو)، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۷۵ء۔

(ب) عمومی کتب

۱۔ احمد، حفیظ الدین (مترجم)، خرد افروز، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء۔
۲۔ اختر، جمیل، اردو میں جرائدِ نسواں کی تاریخ، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۶ء۔
۳۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکیڈمی/نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۹۰ء۔
۴۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۹ء (طبع نہم)
۵۔ اکبر الہٰ آبادی، کلیاتِ اکبر، حصہ اول (الہٰ آباد: عشرت منزل، ۱۹۴۹ء)۔
۶۔ امن، میر، باغ و بہار (مرتبہ رشید حسن خاں)، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۹۰ء۔
۷۔ امن، میر، گنجِ خوبی، بمبئی: مطبع محبوب، ۱۲۹۲ ہجری (بارِ دوم)۔
۸۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات (مرتبہ ابرار عبدالسلام)، ملتان: بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء۔
۹۔ پاریکھ، رؤف، لغوی مباحث، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء۔
۱۰۔ حسن، میر، سحر البیان (مرتبہ رشید حسن خاں)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء۔
۱۱۔ خاں، رشید حسن، اردو املا، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء [اشاعتِ اول ۱۹۷۴ء]
۱۲۔ ذوق، ابراہیم، کلیات، (مرتبہ تنویر علوی)، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۰۹ء (طبعِ اول ۱۹۶۷ء)۔
۱۳۔ سودا، مرزا رفیع، انتخابِ سودا (مرتبہ رشید حسن خان)، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۷۲ء۔
۱۴۔ صدیقی، عبدالستار، (تبصرہ) وضعِ اصطلاحات (مصنفہ وحید الدین سلیم)، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، ۲۰۱۷ء (اشاعتِ ہفتم)

۱۵۔ غالب، اسداللہ خاں، دیوانِ غالب نسخہ عرشی، (مرتب امتیاز علی خاں عرشی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء (اشاعتِ ثانی)۔
۱۶۔ غالب، اسداللہ خاں، کلیاتِ غالب فارسی (مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔
۱۷۔ میر، میر تقی، کلیاتِ میر، ج ۳ (مرتبہ کلبِ علی خاں فائق)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۲ء (طبع دوم)
۱۸۔ نادم سیتاپوری، انتخابِ فتنہ، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، سن ندارد۔
۱۹۔ ناسخ، امام بخش، کلیاتِ ناسخ، ج ا، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء۔

(ج) انگریزی لغات:

۱۔ Concise Oxford Englsih Dictionary، اوکسفرڈ، بارھواں ایڈیشن، ۲۰۱۱ء۔

(د) اخبارات

۱۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۹؍دسمبر ۱۹۸۸ء
۲۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۶؍دسمبر ۱۹۸۸ء
۳۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۳۰؍دسمبر ۱۹۸۸ء
۴۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۳؍جنوری ۱۹۸۸ء
۵۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷؍مئی ۱۹۸۹ء
۶۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۴؍مئی ۱۹۸۹ء
۷۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۲؍اگست ۱۹۸۹ء

اشاریۂ الفاظ و مرکبات

ب

ش

ص

ض

ط

ی

☆......☆

ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی دیگر کتب

(تخلیق، تحقیق، تنقید، تدوین، ترجمہ)

70 years pf Pakistani Urdu Literature

لغات اور فرہنگیں

لغات: تحقیق و تنقید (مرتب)

انتخابِ کلام: میرا محمود سرحدی (ترتیب و تعارف)

انتخابِ کلام: عنایت علی خان (ترتیب و تعارف)

مطالعۂ غالب کی جہتیں (شریک مرتب)

مطالعۂ اقبال کی جہتیں (شریک مرتب)

تلمیحات (تدوین، حواشی، تعارف)

کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (تدوین و تحشیہ)

انتخابِ کلام: سید محمد جعفری (ترتیب و تعارف)

ہیرے والا شترمرغ

انتخابِ کلام: راجا مہدی علی خان (ترتیب و تعارف)

انتخابِ کلام: صوفی تبسم (ترتیب و تعارف)

علمِ لغت، اصولِ لغت اور لغات

لسانیاتی مباحث

لغوی مباحث

اردو کی پانچویں کتاب (شریک مصنف)

لغت نویسی اور لغات: روایات اور تجزیہ (مرتب)

انتخابِ کلام: ظفر علی خان (ترتیب و تعارف)

انتخابِ کلام: مجید لاہوری (ترتیب و تعارف)

اردو لغات: اصول اور تنقید (مرتب)

اردو میں لسانی تحقیق و تدوین: گزشتہ چند عشروں میں

Oxford Urdu-English Dictionary (مدیر اعلیٰ)

اردو میں تحقیق و تدوین (مرتب)

انتخابِ کلام: اسماعیل میرٹھی (ترتیب و تعارف)

سعادت حسن منٹو (شریک مولف)

Iqbal by Atiya (مقدمہ، ترتیب و حواشی)

انتخابِ کلام: حالی (ترتیب و تعارف)

امیر اللغات جلد سوم (تدوین و تحشیہ)

اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتب)

معیاری اردو قاعدہ (شریک مولف)

چمن اردو (شریک مولف) (۸ نصابی کتب)

Oxford Mini English-Urdu Dictionary

انتخابِ کلام: اکبر الہ آبادی (ترتیب و تعارف)

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۱ (مدیر اعلیٰ)

اولین اردو سلینگ لغت

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۰ (مدیر اعلیٰ)

عصری ادب اور سماجی رجحانات

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۹ (مدیر اعلیٰ)

سرخاب کے پر (تراجم)

اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر

نازک صاحب کا بکرا

ہوائیاں

پٹاخوں کا ہنگامہ

خفیہ پیغام

لسانیات کے بنیادی مباحث

COVER DESIGNER

فیض